مجالسِ الصّادقین

(کونوا مع الصّادقین ، سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ قرآن)

ادیم نقوی

حدیث عشق دو باب است کربلا و دمشق
یکے حسینؑ رقم کرد و دیگرے زینبؑ

مجالسِ الصّادقین

مصنف :- آدیم نقوی

مطبوعہ :- ایس۔ڈی پرنٹرز علی بستی گلبہار کراچی

کتابت :- سید تصویب حسین نقوی

ناشر :- ایس' اے' رضوی

تعداد :- ایک ہزار بار چہارم ۱۹۹۵

ملنے کا پتہ :-

۱۵۔ ایف، بلاک۔۲، پی۔ای۔سی۔ایچ۔ایس۔کراچی

فون ۴۵۵۱۶۹۷

سید مظہر حسین موسوی، کلب حیدر اینڈ کو ٹریڈ اینڈ انڈسٹری ہاؤس ۱۴ ویسٹ

وارف روڈ، کراچی ۲ فون ۲۳۱۱۴۸۲، ۲۳۱۱۹۷۹، ۲۳۱۰۴۸۲

سید محمد عباس رضوی ۹۹۲ علی بستی، گلبہار، کراچی فون ۶۶۸۸۴۳۹ ، ۶۶۲۷۶۰۰

قیمت :-

فہرست

حضرات ذاکرین سے گزارش

۱ — ان چودہ مجالس کا مقصد منشائے مشیت ایزدی کے مطابق سچّوں کی نشاندہی اور تعیّن کر کے اُن کے ساتھ ہو جانے کا امرِ ربّی بجالانا ہے۔ چنانچہ ابتدا سے انتہا تک ہر مجلس میں آیہ شریفہ "یاایّھا الّذین اٰمنوا اتّقوا اللّٰہ وکونوا مع الصّادقین" (اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سچّوں کے ساتھ ہو جاؤ) ہی زیرِ بحث ہے۔

۲ — بعض مجالس طولانی ہو گئی ہیں۔ مجالس کی ترتیب اس طرح کی گئی ہے کہ یہ چند اجزا پر مشتمل ہیں۔ ذاکرین حضرات ان میں سے ایک یا دو جزو ترک کر سکتے ہیں۔ نیز ہر مجلس میں گزشتہ مجالس میں بیان کردہ اہم نکات کو سامعین کی آسانی کے لئے آغاز ہی میں درج کر دیا گیا ہے۔ اگر چاہیں تو ان کو بھی ترک کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ دیکھنا ہو گا کہ پچھلی مجالس سے تسلسل قائم رہے۔

اس کے علاوہ کتاب کے آخر میں جناب عباسؑ علمدار، جناب علیؑ اکبر، جناب علیؑ اصغر اور حضرت زینبؑ کے فرزندوں کی شہادت پر ایک ایک مرثیہ پیشِ خدمت ہے تاکہ حسبِ ضرورت و خواہش کسی بھی مجلس کے مصائب میں پڑھا جا سکے۔

ادیم نقوی

پیش لفظ

بعد حمد و نعت مصنفِ حقیر خدمتِ ناظرین میں عرض پرداز ہے کہ ہماری مجالسِ عزا گو صدیوں سے جاری ہیں اُن میں آج تک سامعین کو یہ پتہ نہیں چل سکا کہ آخر ان کا مقصدِ حقیقی کیا ہے۔ زبانی تو یہ کہتے رہتے ہیں کہ حسینؑ نے اسلام کو بچا لیا۔ مگر یہ کسی کو خبر نہیں کہ اسلام ہے کیا جس کو حسینؑ نے بچا لیا۔ مجملاً اتنا اشارہ کیا جا سکتا ہے کہ جناب باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (انسان کو سکھا دیا وہ تمام جو کچھ وہ نہ جانتا تھا)۔ خدا کے پڑھائے ہوئے اس علم پر عمل کرنا اسلام ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے۔ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (ترجمہ:- اپنے نفس کو قائم کر لے دین کے لئے یکسو ہو کر۔ اللہ کی وہ فطرت جس پر انسان کو پیدا کیا۔ اللہ کی خلقت میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہی تو مضبوط دین ہے لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے (سورۂ روم)۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ خدا کے پڑھائے ہوئے علم پر عمل تو اُسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ علم شعور میں آئے۔ علم کے وہ خزانے غفلت و

لاشعوری کے تاریک گڑھوں میں نفس کے اندر دفن ہیں۔ اور نفس انسان بالکل غافل سویا ہوا ہے۔ اُن علم کے سمندروں میں سے ایک قطرہ بھر ہی اسکے شعور میں آتا ہے اور اُسی پہ پوری زندگی گزار دیتا ہے۔ تمام فرقۂ اسلامیہ کے مروجہ اسلام کو خدا کے پڑھائے ہوئے علم اور اُس کے سکھائے ہوئے اسلام سے دُور کا واسطہ بھی نہیں۔ اور نہ ہو سکتا ہے جب تک نفس کی غفلت کم نہ ہو اور گہری نیند سے نہ جاگے۔

یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ گہری نیند سے جگانے کے لئے نفس کو اذیتِ روحانی کی ضرورت ہے۔ اور اُس کی غفلت کا علاج سوائے درد و حسرت و غم و الم اور کچھ نہیں ہے۔ حسینؑ مظلوم نے درد و الم کا مظاہرۂ عظیم برپا کر کے دلوں کو تڑپانے کے لئے حسرت و درد، غم و ہم کے پہاڑ کھڑے کر دیئے۔ تاکہ خدا کا پڑھایا ہوا علم شعور میں آئے اور اُس پر عمل کرنے سے اسلام جو مُردہ پڑا ہوا ہے زندہ ہو جائے۔ مگر ہم نے حسینؑ مظلوم کی مجالسِ عزا کو محافلِ مزا اور لُطف اندوزی کا ذریعہ بنا لیا۔ اگر مجالس اصلی رنگ پر قائم رہتیں تو علوم کے دریا بہہ جاتے اور ہمارے بچے بھی غیروں کے علماء سے زیادہ عالم ہوتے۔

بتا گئے تھے ہمیں جیسے صاحبِ معراج | کہ اہلِ علم کے ہیں اہلِ بیتؑ سر کے تاج
جو اُن سے لیتے علومِ کتابِ حق تو آج | ہر ایک علم میں غیروں کے ہوتے کیوں محتاج

ہمیں سے اہلِ زمیں بھیک مانگتے ہوتے
ضیا یہ رہِ تاریک مانگتے ہوتے

اب اکثر عزادار یہ سوال کریں گے کہ ہماری مجالس میں کیا عیب ہے اور کونسا نقص ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مجالس سُنتے ہوئے آپ کو سینکڑوں برس گزر گئے۔ کیا اِن مجالس میں آپ نے سُنا کہ اسلام کی حقیقت کیا ہے۔ تمام تفصیلیں

چھوڑ کر صرف ایک اصل ہی لے لیں اور وہ ہے وجودِ باری کا یقینِ قلبی حاصل کرنا۔ کیا عمر بھر مجالس سنتے رہنے سے وجودِ باری کا یقینِ قلبی حاصل ہو گیا۔ اگر جواب نفی میں ہے تو یہ تمام عمر کی مجالس رائیگاں گئیں۔ ہمارے عزادار بھائی تو اس کو تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوں گے۔ مگر وہ اپنے تخیلِ نفس کے مقابلے میں خدا و کلامِ خدا کی تکذیب نہیں کر سکتے۔ اگر وجودِ باری کا یقینِ قلبی حاصل ہو جائے تو ایمان بالقلب بارگاہِ ربّ العزّت سے عطا ہو جائے گا جس کی علامت قرآن نے یہ بتلائی ہے۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ۔ (اور وہ لوگ جو ایمان لائے اللہ کی محبت میں بڑے شدید ہوتے ہیں) اور حبِ شدید کی علامت ہر بچے سے پوچھ لیجئے کہ جس سے وہ ملا ہوا ہو اور جدا ہو جائے تو اس کا نام سننے سے بچے کا قلب لرزتا ہے اسی کیفیت کو قرآن طلب کرتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ ہ (سوائے اُن کے کوئی مومن ہے ہی نہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو اُن کے دل لرز جائیں)۔

اس پر بھی غور کریں کہ جب آپ کسی بڑے آفیسر کے سامنے تنہائی میں جاتے ہیں جس سے بے تکلف نہ ہوتے ہوں تو قلب پر رعب کا اثر ہوتا ہے مگر آپ کے قلب میں خدا کی اتنی بھی وقعت نہیں جتنی کہ اُس بڑے آفیسر کی یا بچے کے سامنے اُس کے محبوب کی۔ اس پر تو ناظرین کو بڑی حیرت ہو گی اور دریافت کرینگے کہ غفلت و لاشعوری سے کیا مُراد ہے اور جو حضرات اس کو سمجھنا چاہیں وہ اپنے نفس کی کیفیات پر غور کریں۔ ہر بچے کے حواسِ خمسہ پیدا ہوتے ہی کام کرنے لگتے ہیں۔ جو کچھ وہ دیکھتا ہے اُس کی تصاویر۔ جو سنتا ہے اُن آوازوں کے نقوش۔ جو چکھتا ہے اُس کے ذائقے کی کیفیات۔ سونگھنے سے خوشبو و بدبو۔ چھونے سے لمس کی کیفیات کے لئے نفس میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ جب کوئی شخص ہمارے سامنے کسی دیکھی ہوئی

شے کا نام لیتا ہے تو اُس کی تصویر نفس میں اُبھرتی ہے۔ کسی ذائقے کے نام سے اُسی ذائقے کی خفیف کیفیت زبان اور تالو پر وارد ہوتی ہے۔ اگر ایک شخص کہے کھٹا تو سننے والوں کے موہنہ میں پانی آجاتا ہے۔ اِس سے ثابت ہوجاتا ہے کہ جب کوئی مقرر بات کرتا ہے سننے والے کا نفس اُسی شے کی کیفیت یا تصویر اپنے خزانوں سے نکال کر لاتا ہے اور اُسی سے ملاکر سمجھتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ کرتے ہوئے اس کو مطلق خبر نہیں کہ میں کچھ کر بھی رہا ہوں یا نہیں۔ اس کی تمام زندگی کے کام مَشی فِی النَّوم کے مریض کی طرح ہوتے ہیں کہ وہ سوتے میں کھڑا ہوجاتا ہے۔ چلتا ہے پھرتا ہے۔ باتیں کرتا ہے۔ سارے کام کرتا ہے مگر دورے سے جب افاقہ ہوتا تو اُس کو مطلق کچھ یاد نہیں ہوتا کسی کام کی کسی بات کی کچھ خبر نہیں ہوتی۔ یہ ہے اس کی غفلت اور لاشعوری۔ جس کی خبر قرآن و حدیث میں بھی ہے۔ سورۂ تکاثر میں ہے۔ الْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (تم کو تو ہوس نے ہی غفلت میں رکھا یہاں تک کہ تم قبروں سے ملے) اور رسول اکرمؐ کا فرمان ہے اَلنَّاسُ نِيَامٌ اِذَا مَاتُوا انْتَبَهُوا (لوگ سوتے ہیں جب مریں گے تب ہوشیار ہوں گے) اب اُن لوگوں کو جو خدا و رسولؐ۔ جنّت دوزخ۔ حشر و نشر غرض کہ تمام غیب پر ایمان بالقلب رکھنے کے مدعی ہیں غور کرنا چاہیئے کہ یہ خواب میں مانے ہوئے عقائد کس کام کے ہیں جب مریں گے اور ہوشیار ہوں گے تو کچھ بھی مانا ہوا نہ ہوگا کس قدر افسوس کی بات ہے کہ یورپ و امریکہ میں تمام اہلِ علم نے تسلیم کرلیا ہے کہ نفسِ انسان اپنے باطن کے لئے مطلقاً لاشعور میں ہے اور مسلمان خدا و رسولؐ کے کلام کی تکذیب کر رہے ہیں کہ ہم تو سوتے ہوئے نہیں ہم تو جاگے ہوئے ہیں۔ ہمارے غیر سو رہے ہیں۔ خدا و رسولؐ کے کلام کی اس تکذیب کی ذمّہ داری سب سے زیادہ شیعہ حضرات پر ہے اسلئے کہ آلِ رسولؐ کے واضح ارشادات ہوتے

ہوتے یہ تکذیب میں مبتلا ہیں۔ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی تعلیم کردہ دعائے سحر مختصر رمضان میں پڑھتے رہتے ہیں۔ اس دعا کے درمیان میں یہ سوال موجود ہے۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ اِیْمَانًا تُبَاشِرُ بِہٖ قَلْبِی (یا اللہ میں تجھ سے ایسے ایمان کا سوال کرتا ہوں جس میں میرا قلب شریک ہو) اب تو واضح ہو گیا کہ مدعیان ایمان بڑے خسارے میں ہیں۔ قلب پر تو ایمان کا اثر پہنچ ہی نہیں سکتا جب تک کہ نفس کی غفلت کم نہ ہو۔ جس کا علاج دردو حسرت و الم سے دل کا تڑپنا ہے۔ جس کے لئے فرزند رسولؐ ذوالجلال۔ سیدۃ النساء العالمین کے لال حسینؑ مظلوم نے دردو الم کے عمیق دریا بہا دیئے۔ جس کو صدق دل سے طلب ہو اُن میں غواصی کر کے غفلت و لاشعوری کی نجاست سے پاک ہو جائے۔

ناظرین میں سے اکثر حضرات کہیں گے کہ ہم مجالس برپا کرتے ہیں نظم و نثر میں مراثی پڑھتے ہیں۔ روتے ہیں۔ رُلاتے ہیں۔ اور حضور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔ مَنْ بَکٰی عَلَی الْحُسَیْنِ وَجَبَتْ لَہُ الْجَنَّۃُ (جو حسینؑ پر روتا ہے اس کے لئے جنت واجب ہو جاتی ہے) ہم تو اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ ذکر حسینؑ سن کر رو لیں۔ اس سے زیادہ ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضورؐ نے تو فرمایا "جو حسینؑ پر روئے اُس پر جنت واجب ہے" یہ تو نہیں فرمایا کہ "مَنْ بَکٰی عَلَی النَّوَاحِی" جو بَین پر روئے اُس پر جنت واجب ہے۔ اب بعض حضرات اس کی مزید شرح کے خواہشمند ہونگے تو یہ بات بغیر تمثیل سمجھ میں نہیں آسکتی۔

آپ تعزیت کے لئے شہر میں کہیں جاتے ہیں۔ تو جلسے میں بیٹھ کر باتوں میں مصروف ہو جاتے ہیں اور کوئی کیفیت درد و الم کی طاری نہیں ہوتی۔ اگر متوفی کا بچہ بَین کرتا آجائے "ہائے بابا ہمیں اب بیٹا کون کہے گا" "ہمیں پیسے کون دے گا"

تو آپ رونے لگتے ہیں۔ یہ آپ میّت پر روتے یا بین پر۔

اَب غور کریں کہ آدمی یا تو ہمدردی میں روتا ہے یا غم و الم میں۔ جب لوگوں کے سامنے غم انگیز اور حسرت خیز واقعات پُر درد لہجے میں سُنائے جائیں تو دل پر جذبۂ ہمدردی جوش میں آکر مہیجِ گریہ ہوتا ہے مگر اس رونے کا رَدِّ عمل سرور ہوتا ہے شرکاءِ مجلس کو آپ نے کہتے سُنا ہوگا کہ آج تو بہت لُطف آیا۔ حقیقت لاشعوری میں زبان پر آجاتی ہے۔ ٹھیک ہے یہ محافلِ مزاحیہ ہیں مجالسِ عزا نہیں ہیں۔

اِن مجالس کو محافلِ مزا بنانے کے لئے ایسے ذاکرین و علماء ہزاروں روپیہ خرچ کرکے بُلائے جاتے ہیں جو نکاتِ لطیفہ بیان کریں اور اغیار پر لطیف طنز کریں تاکہ مجلس لُطف اندوزی کا ذریعہ بن جائے تو پھر اِن مجالس سے غفلت کیسے کم ہوسکتی ہے غفلت صرف دَرد و اَلم سے دُور ہوتی ہے۔ مگر اس پر آج تک کسی نے غور نہیں کیا کہ درد و اَلم کی علامت کیا ہے۔ دیکھئے۔

آپ کا کوئی محبوب۔ کوئی عزیز۔ کوئی دوست اگر فوت ہوجائے یا کسی مصیبت میں مبتلا ہوجائے تو اُس کی خبر سُنتے ہی کیفِ غم طاری ہوجاتا ہے۔ وہاں اسکی ضرورت نہیں ہوتی کہ دَردناک لہجہ بنایا جاوے۔ غم و اَلم کے آثار طاری کرکے بیان کیا جائے۔ نہیں۔ بلکہ وہ تو صرف وقوف کافی ہوتا ہے۔ نہ صحت لفظی کی ضرورت، نہ دردناک عبارت کی۔ اَب آپ کی یہ مجالس غم کیسی ہیں۔ اگر ذاکر سے سبقتِ لسانی کی وجہ سے غلط لفظ نکل جائے تو سب ہنسنے لگیں گے۔ اور نکاتِ لطیفہ پر واہ واہ اور سُبحان اللہ کے نعرے بلند ہوجاتے ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

جن کے قلوب میں خونِ حسینؑ کی وقعت اور عظمت ہوگی وہ تو ضرور اس کوشش میں مصروف ہوجائیں گے کہ اِن مجالس کو حصولِ دَرد و اَلم کا ذریعہ کیسے

بنایا جائے۔ اور ان مجالس کو مفید و کارآمد بنانے کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنی ضروری ہیں۔

جو طالبین ہیں وہ سنیں، غور کریں اور سمجھنے کی کوشش کریں:۔

(۱) نفس انسان کو اپنے سوائے کسی کا غم نہیں ہوتا۔ اس کو درد پہنچ ہی نہیں سکتا جب تک کہ اس کی "میں" شامل نہ ہو۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اہل حرم کی اور امام علیہ السلام کے اعزا اور رفقاء کی طرف سے دردناک بیانات کا ذکر کم کیا جائے بلکہ اپنی طرف سے پُر سا دیں۔ اور یہ بیان کیا جائے کہ تم نے ہمارے لئے یہ قربانیاں دیں۔ ہمارے لئے تیر و تبر کے زخم کھائے۔ ہماری اصلاح کے لئے یہ مصائب کے پہاڑ اُٹھائے۔

(۲) تیرہ سو سال کی مجالس میں متشابہات اور احادیث مبنی بر تقیہ پر تقریروں اور تحریروں کے دریا بہہ گئے۔ جن میں حقیقت کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ اب ضروری ہے کہ مجالس میں حقیقتیں بھی بیان کی جائیں اور احادیث مبنی بر تقیہ اور مبنی بر حقیقت کے فرق کا اظہار کیا جائے۔

(۳) ان مجالس سے نکات لطیفہ کے سوائے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ دس پندرہ مجالس سن کر بھی تاریخی واقعات میں سے کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا۔ اور نہ فطری علوم میں سے کوئی راز سننے میں آتا ہے۔

ان جملہ اُمور کا لحاظ رکھتے ہوئے مجالس الصادقین میں چودہ مجالس بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں۔ جن میں حتی الامکان اس ترتیب کی کوشش کی گئی ہے۔

(۱) ابتدا قرآن و حدیث سے کی جائے۔

(۲) محکم و متشابہہ کا امتیاز کرنے کے اُصول اور اس کی مثالیں۔

(۳) اُحادیث مبنی بر تقیہ کو مبنی بر حقیقت سے امتیاز کرنے کا طریقہ۔

(۴) حتی الامکان بینیتہ بیانات سے احتراز۔

(۵) مصائب میں اپنی طرف سے پُرسا دینا اور اپنی طرف سے بین کرنا۔

(۶) کیفیاتِ نفس کا تفصیلی بیان کرنا۔

اَب یہ تمام افرادِ قوم۔ مدعیانِ محبّتِ اہل بیت علیہم السلام کا فریضہ ہے کہ اس کام کو آگے بڑھائیں اور ہر زبان میں اسی رنگ کی مجالس لکھی جائیں تاکہ خونِ حسینؑ کا اثر قلوب تک پہنچ سکے۔ اَب اگر اس میں سعی نہ کی گئی تو خونِ حسینؑ کے ضائع کرنے کے ملزم قرار پائیں گے۔

جنابِ ربّ العزّت ہمارے افرادِ قوم کو توفیقِ خیر عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

خادمِ غلامانِ اہلِ بیت
اَدیم نقوی

پہلی مجلس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین محمد ن المصطفیٰ وآلہ الطیبین الطاہرین المعصومین ہ اما بعد فقد قال اللہ تبارک و تعالیٰ فی کتابہ المجید وفرقانہ الحمید وقولہ الحق ہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین ہ

اس آیہ وفی ہدایہ کا ظاہری ترجمہ تو یہ ہے کہ جناب باری تعالیٰ ایمان لانے والوں سے ارشاد فرماتا ہے کہ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ ہر چند کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ آیت کے ایک ایک کلمہ کی تفسیر وتشریح شروع سے آخر تک کی جائے مثلاً آمنوا سے کیا مراد ہے۔ اتقوا اللہ کا مطلب کیا ہے۔ مگر چونکہ آیۂ شریفہ میں مقصدِ منتہیٰ سچوں کے ساتھ ہو جانا ہے۔ لہٰذا پہلے اسی طرف توجہ کرنا ضروری ہے تاکہ مقصدِ اصلی فوت نہ ہو۔ غرضیکہ تمام اُن لوگوں کو جو خدا کی وحدانیت اور حضرت ختمی مرتبت کی رسالت کا اقرار کر چکے ہیں اور امنت باللہ پڑھ چکے ہیں، اور خدا سے ڈرتے بھی ہیں۔ اُن سب کو جناب ربّ العزت حکم دیتا ہے کہ سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ خدا کے حُکم کی تعمیل لازمی ہے۔ اگر تعمیل میں کوتاہی ہوئی تو اُسکے عذاب میں گرفتار ہو جائیں گے۔ لہٰذا ضروری ہُوا کہ سچوں کی تلاش کریں۔ مگر پہلا سوال تو یہ ہے کہ سچا کہتے کسے ہیں۔ ہر ایک کہدے گا کہ جو سچ بولتا ہو وہ سچا ہے۔ مگر سچ کسے کہتے ہیں۔ اس سوال پر تو ہر ایک ہنسے گا کہ لیجئے آپ کو سچ کے معنی بھی

نہیں معلوم جو صبح سے شام تک سینکڑوں دفعہ بولا جاتا ہے۔ ہنسنے والے ہنس لیں مگر جب غور کریں گے تو پتہ چل جائے گا کہ یہ ہنسنے کی بات نہیں ہے۔ روزمرہ ہم ہزاروں الفاظ بولتے ہیں لیکن ان کا اصل مفہوم ہمارے شعور میں نہیں ہوتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ الفاظ کا مطلب اور مفہوم ہمارا ذہن ماحول سے حاصل کرتا ہے اور جب کسی لفظ کا کوئی مطلب ذہن نشین ہو جاتا ہے تو پھر کبھی اُس کی طرف توجہ نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ خیال آتا ہے کہ آؤ معلوم کریں کہ اس لفظ کا اصلی مطلب کیا ہے۔ مثلاً انتقال کے معنی کسی سے بھی پوچھیں وہ کہے گا موت۔ حالانکہ انتقال کے معنی جگہ بدلنا ہے، موت نہیں ہے جیسے کہ روزمرہ کی بول چال میں کہتے ہیں کہ جب کوئی کرایہ دار ایک مکان چھوڑ کر دوسرے مکان میں چلا جاتا ہے اور اُس کے پڑوسی سے دریافت کرتے ہیں کہ جناب وہ لوگ جو یہاں رہتے تھے کہاں چلے گئے تو اگر اُس کو معلوم ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ وہ لوگ فلاں مکان میں منتقل ہو گئے ہیں یعنی مکان بدل لیا ہے۔

اس طرح اگر سچ کی مثال تلاش کریں تو یہ فرض کریں کہ ایک لڑکی چائے کے برتن دھو رہی ہے۔ اُس کے ہاتھ سے پیالی گر کر ٹوٹ جاتی ہے۔ جب اُس کی ماں ٹوٹی ہوئی پیالی دیکھ کر دریافت کرتی ہے کہ بیٹی! یہ پیالی کیسے ٹوٹی؟ لڑکی کہتی ہے کہ ماں میرے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گئی۔ اس کو ہر شخص کہے گا کہ لڑکی نے سچ بولا تو گویا سچ کی تعریف ہمارے خیال کے مطابق یہ ہوئی کہ جو بیان اصل حقیقت کے مطابق ہو وہ سچ ہے اور جو شخص بھی اصل حقیقت کے مطابق بات کرے وہ سچا ہے۔ مگر یہ تو ہمارا خیال ہوا۔ کونوا مع الصّادقین یعنی سچوں کے ساتھ ہو جاؤ، یہ خدا کا کلام ہے تو خدا کے کلام سے ہی سچ کا مطلب بھی معلوم کرنا ضروری ہے۔ آئیے دیکھیں خدا کے نزدیک سچ کیا ہے اور سچا کس کو کہتے ہیں۔ دیکھئے سورۂ منافقون کہ جب منافقین خدمتِ رسالت مآب میں حاضر ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے

ہیں کہ تم خدا کے رسول ہو تو رسالت کے متعلق ان منافقین کی یہ شہادت کیا حقیقت کے مطابق نہیں ہے؟ ہے اور ضرور ہے اور اس کی گواہی خود خدائے تعالیٰ بھی دیتا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی فرماتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے" اذا جاءک المنافقون قالوا نشہد انک لرسول اللہ ۔ واللہ یعلم انک لرسولہ ۔ واللہ یشہد ان المنافقین لکٰذبون ؕ " ترجمہ:۔ (اے رسول) جب منافق تمہارے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ تم خدا کے رسول ہو اور اللہ بھی یہ جانتا ہے کہ تم اس کے رسول ہو مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔ (سورۂ منافقون آیت ۱)

لیجئے سچ کے متعلق وہ جو ہمارا خیال تھا کہ اصل حقیقت کے مطابق بیان کو سچ کہتے ہیں وہ تو غلط ہو گیا یعنی یہاں منافق حقیقت کے عین مطابق رسالت کی گواہی دے رہے ہیں مگر خدا اُن کو جھوٹا بتا رہا ہے۔ اب تو ضروری ہو گیا کہ خدا کے کلام میں ہی سچ کو اور سچوں کو تلاش کریں۔ آئیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات کا ملاحظہ کریں۔ ستارے کو دیکھ کر کہتے ہیں" ھٰذا ربی" یہ میرا رب ہے۔ اور جب چاند کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں یہ میرا رب ہے مگر وہ جب غروب ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں یہ تو ڈوب گیا۔ یہ رب نہیں ہو سکتا۔ پھر جب آفتاب کو دیکھتے ہیں تو فرماتے ہیں ھٰذا ربی۔ ھٰذا اکبر" یہ ہی میرا رب ہے۔ یہ بہت بڑا ہے۔" فلما افلت" مگر جب وہ بھی غروب ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں اے قوم! میں اس سے بیزار ہوں جو تم شرک کرتے ہو۔ میں غروب ہونے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ میرا رب تو وہ ہے جو ان سب کا خالق ہے۔ اِن کو چلاتا ہے۔ یہ سب اُس کے مطیع و فرمانبردار ہیں۔ یہاں پر غور کرنے کی بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ معصوم پیدا ہوئے۔ پیدائش سے ہی موحد ہیں یعنی ایک خدا کو مانتے ہیں اور اُسی ایک پر ایمان رکھتے ہیں۔ پھر خلاف حقیقت اور خلاف ضمیر ستارے، چاند اور سورج کو کہتے ہیں کہ یہ میرا خدا ہے یا میرا رب ہے اور لطف

یہ ہے کہ اس خلافِ حقیقت کہنے والے کو جناب ربّ العزت "صدیقاً نبیاً" کا خطاب دیتا ہے۔ اور وہ جو حقیقت کے مطابق رسالت کی شہادت دے رہے تھے اُن کو جھوٹا کہتا ہے۔ یہ کیا ماجرا ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ کسی حقیقت، کسی سچائی کے ظاہر اور ثابت کرنے کی غرض سے اگر حقیقت کے خلاف بھی اظہار کیا جائے بشرطیکہ نیت حق کی حمایت میں ہو تو اس کو جھوٹ نہیں کہہ سکتے۔ اب تو بڑی حیرانی یہ ہے کہ سچ کہہ سکتے ہیں نہ جھوٹ تو پھر کیا کریں۔؟ تو اس کا حل قرآن و حدیث ہی سے لیتے ہیں۔ منافقین کی بات سے یہ تو ظاہر ہو چکا کہ اگر نیت بد ہو تو حقیقت کے مطابق اظہار کرنے والا بھی جھوٹا ہے لیکن اگر نیت نیک ہو تو خلافِ حقیقت اظہار کرنیوالا سچا ہے اس لئے کہ نیت احقاقِ حق ہے۔ حق کی حمایت کے لئے، فساد مٹانے کے لئے جو کچھ بھی اظہار کیا جائے چاہے حقیقت کے خلاف ہی ہو تو وہ جھوٹ نہیں ہے۔ مگر بدنیتی یا فساد پھیلانے کی غرض سے، چاہے حقیقت کے مطابق ہی اظہار کیوں نہ کیا جائے، وہ جھوٹ ہے۔ اب سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ کسی ایسے قول و فعل کو جو دفع شر یا احقاقِ حق کی غرض سے خلافِ حقیقت ظاہر کیا جائے، کیا کہیں گے؟ اس کے لئے قرآن و حدیث میں دو لفظ ہیں۔ پہلا "مکر" دوسرا "تقیہ"۔ چنانچہ جناب باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے "مکروا ومکر اللہ واللہ خیر الماکرین" یعنی انھوں نے مکر کیا اور اللہ نے بھی مکر کیا اور اللہ تو بہترین مکر کرنے والا ہے۔ ہماری زبان میں مکر بُرے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی ایسی کیفیت کا اظہار کرتا ہے جو حقیقتاً اُس پر وارد نہ ہو اور وہ بدنیتی سے ایسا کرے تو ہم اس کو مکر کہتے ہیں۔ عربی میں مکر کے معنی ہیں پوشیدہ تدبیر کرنا۔ جس کو ہم مکر کہتے ہیں اُس کو عربی میں خداع کہا جاتا ہے۔ مثلاً ایک طالب علم جس نے چھٹی کے دن اسکول کا کام نہیں کیا اور کھیل میں وقت گزار دیا اب دوسرے دن اسکول جانے سے

ڈرتا ہے کہ اُستاد سزا دیں گے لہٰذا وہ سر پکڑ کر لیٹ جاتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ سر میں سخت درد ہے، روتا، چلاّتا ہے یہاں تک کہ والدین اُس کی رُخصت کی درخواست اسکول بھیج دیتے ہیں۔ اس کیفیت کے اظہار کو ہم مکر کہتے ہیں حالانکہ یہ خداع ہے۔ دوسری مثال لیجیے: ایک دو ڈھائی سال کے بچے کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ بچہ ہر وقت ماں کو یاد کرتا ہے۔ جب کھانا سامنے آتا ہے تو زمین پر لوٹنے لگتا ہے اور کسی طرح کچھ نہیں کھاتا۔ اب بتلایئے کہ بچے کی حالت اگر ایسی ہی رہی تو وہ جلد ہلاک ہو جائے گا۔ باپ بچے کو بہلانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے مگر بے سُود۔ بالآخر باپ کے ذہن میں ایک تدبیر آتی ہے۔ اب بچہ جب کھانے کے وقت مچلتا ہے تو باپ بھی زمین پر لیٹ جاتا ہے اور ہائے مرا ہائے مرا کہنے لگتا ہے۔ بچہ دوڑ کر باپ سے لپٹ جاتا ہے اور بے اختیارانہ پوچھتا ہے کہ ابّا جان کیا ہوا ابّا جان کیا ہوا۔ باپ کہتا ہے کہ جب تم تڑپتے ہو اور روتے ہو تو ہمارے دل میں درد ہونے لگتا ہے۔ اب ہم بھی مر جائیں گے۔ بچہ باپ سے چمٹ جاتا ہے اور کہتا ہے ابّا جان تم نہ مرنا۔ باپ کہتا ہے اگر تم مچلو گے اور روؤ گے اور کھانا نہیں کھاؤ گے تو ہم ضرور مر جائیں گے پھر تم کو پیار کرنے والا کوئی بھی نہ رہیگا۔ بچہ وعدہ کرتا ہے کہ اب میں کبھی نہ روؤں گا اور کھانا بھی کھاؤں گا۔ لیجیے بچے کی جان بچ گئی۔ اس کو آپ کیا کہیں گے؟ یہ ہی مکر ہے یعنی پوشیدہ تدبیر۔ یہ خداع نہیں ہے۔ اب اس مکر کا ثواب خدا سے پوچھیے۔ وہ فرماتا ہے "ومن احیاھا فکانما احیا النّاس جمیعاً"، یعنی جس نے ایک نفس کو جِلا لیا تو گویا اُس نے تمام انسانوں کو جِلا لیا۔ ایک نفس کو ہلاکت سے بچانا ایسا ہے جیسا تمام دُنیا کے انسانوں کو ہلاکت سے بچانا۔ کون اندازہ لگا سکتا ہے اُس ثواب کا جو باپ نے بچے کو ہلاکت سے بچا کر حاصل کیا۔

خدا، رسول، انبیاء، آئمہ، اولیاء اللہ سب مکر کرتے ہیں۔ اگر ایک لفظ مکر کی شرح کی جائے تو کم از کم ستر اسّی گھنٹے درکار ہوں گے۔ یہاں تو اجمالاً کچھ عرض کیا جا سکتا ہے۔

خدا کا مکر:۔ جناب باری تعالیٰ اپنے کلام پاک میں ارشاد فرماتا ہے:۔

"یا حسرۃً علی العباد ، ما یاتیھم من رسول الّا کانوا بہٖ یستھزؤن"

ترجمہ: کیسی حسرت ہے بندوں پر۔ نہیں آیا اُن کے پاس کوئی رسول مگر یہ کہ اسکے ساتھ ٹھٹا (ہنسی) کرتے رہے۔ یعنی جو بھی رسول ہم اُن کے پاس بھیجتے ہیں وہ اُن کی ہنسی اُڑاتے ہیں۔ اب ذرا سوچیں اور غور کریں کیا اللہ تعالیٰ کو حسرت ہو سکتی ہے۔ العیاذ باللہ! خدا سے اور حسرت سے کیا واسطہ۔۔ خدا پر اور کسی کیفیت کا طاری ہونا، اس سے لغویات اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ تو ہمارے دلوں کو متاثر کرنے کے لئے اسنے اپنے لئے ایک ایسی کیفیت ظاہر کی ہے جو درحقیقت اُس پر نہیں بلکہ ہم پر طاری ہوتی ہے۔ اور ایسا کرنا اسلئے ضروری تھا کہ ہم پر اثر ہی صرف اُس کیفیت کے ذکر سے ہوتا ہے جو ہم پر طاری ہوتی رہتی ہے۔ جس کو ہمارا دل جانتا ہے۔ جس کا ہم تجربہ رکھتے ہیں۔ تو اس آیت میں خدا نے اپنے لئے یہ جو "حسرت" کہا ہے یہ اللہ کا مکر ہے اور یہ ایک متشابہ آیت ہے۔

دوسری مثال لیجئے:۔ "ان اللہ سمیع بصیر" ارشاد ہوتا ہے اللہ بڑا سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ اب آپ خود سوچ لیں کہ یہ مکر نہیں تو اور کیا ہے اس لئے کہ سننے کے معنی ہیں کانوں کے ذریعہ واقفیت حاصل ہونا اور دیکھنے کے معنی ہیں آنکھوں کے ذریعہ واقفیت حاصل ہونا۔ اس کی کچھ مزید شرح کی ضرورت ہے۔ جب ہم کسی چیز کی طرف نظر کرتے ہیں تو اُس کی تصویر پتلی میں بنتی ہے جو دماغ کے اندر منتقل ہوتی ہے تب ہم کو اُس کی واقفیت حاصل ہوتی ہے کہ اس کی شکل، صورت، جسامت رنگ وغیرہ کیا ہیں۔ لہٰذا دیکھنے کے معنی یہ ہوئے کہ آلات بصارت کے ذریعہ واقفیت یا علم حاصل ہونا۔ اس کے سوا سننے اور دیکھنے کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔ تو کیا اللہ تعالیٰ کے پاس بھی دو آنکھیں اور دو کان ہیں؟۔ نعوذ باللہ!! اب اگر یہ کہا جائے کہ

جو کچھ بھی ہم کان اور آنکھ کے ذریعہ جانتے ہیں یا علم و واقفیت حاصل کرتے ہیں وہ خدا بغیر آنکھ اور کان کے جان لیتا ہے یا جان جاتا ہے۔ تو یہ بھی غلط ہے اس لئے کہ وہ تو ہمیشہ سے جانتا ہے۔ اُس کے لئے جان لینا یا جان جانا کیسا؟ بات صرف اتنی سی ہے کہ یہ ہماری جیسی کیفیات صرف ہمارے سمجھانے کے لئے بیان کی گئی ہیں اور یہ مجاز ہے اور ایسی تمام آیات کو متشابہات کہتے ہیں۔

انبیاء اور معصومینؑ کا مکر و تقیّہ:۔ اسی طرح تمام انبیاء اور معصومین علیہم السلام کی زندگی کے حالات ہیں۔ اِن حضرات کی تمام زندگی ہی تقیہ پر مبنی ہے۔ یہ امر تو قرآن و حدیث سے ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے ایسے افعال بھی صادر ہوئے ہیں جن کو اکثر فرقِ اسلامیہ کے علماء نے خطا سے تعبیر کیا ہے۔ مگر علماء شیعہ کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے ایسے اعمال کو خطا نہیں بلکہ ترکِ اولیٰ کہنا چاہیے لیکن یہ تو صرف لفظوں کا اُلٹ پھیر ہے مفہوم وہی ایک ہے۔ بہرحال غلطی ضرور کہا جائے گا حالانکہ ایسا خیال معصوم کے لئے کسی طرح بھی جائز نہیں۔ مگر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن و حدیث سے تو یہ اَمر ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے معاذ اللہ غلطی یا ترکِ اولیٰ صادر ہُوا تو پھر اس کی تاویل کیا ہو سکتی ہے۔ اس کے متعلق جب تک فطرت نفس کا مطالعہ نہ کریں کچھ بھی سمجھ میں نہیں آسکتا۔

دیکھئے بچے سے اگر کسی کام کو کہیں تو وہ اس سے بچتا ہے۔ وہ تو صرف وہی کام کرتا ہے جسے اُس کا جی چاہے۔ بجائے اس کے کہ بچے سے کسی کام کے لئے کہیں اگر ہم خود وہ کام کریں تو کچھ دیر تک تو بچہ دیکھتا رہتا ہے۔ پھر اس کو نقل کرنے کی خواہش مجبور کرتی ہے تو نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ایک مثال دیکھئے۔ روزمرہ کا معمولی کام ہے روٹی پکانا۔ اگر کسی لڑکی کو آٹا گوندھنے اور روٹی پکانے کی ترکیب بہت تفصیل سے لکھ کر پڑھا دی جائے اور

اُس کو وہ حفظ بھی ہو جائے۔ پھر زبانی اس کی شرح بھی سُنا دیجائے تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ روٹی پکا سکے۔ نہیں ہر گز نہیں۔ جب تک کہ عملی طور پر پکا کر نہ دکھایا جائے، ممکن ہی نہیں کہ لڑکی روٹی پکانا سیکھ سکے۔ اِس مثال سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ نفس انسان کو جو کچھ سکھانا ہو عمل کر کے اُس کو دکھانا ضروری ہے۔ بغیر اس کے کسی کام کا سیکھنا اُس کے لئے ممکن نہیں۔

اَب غور کریں اور بتلائیں کہ انبیاء علیہم السلام خلقِ خدا کو توبہ و اَنابت و استغفار کرنا کیسے سکھلائیں؟۔ اس کے لئے اُن پر لازم ہے کہ ظاہرا کوئی مکروہ کام کر لیں اور پھر یہ ظاہر کریں کہ ہم سے غلطی ہو گئی ہے۔ اَب گریۂ وزاری اور توبۂ واستغفار کر کے لوگوں کو تعلیم دیں کہ دیکھو اگر تم سے کوئی غلطی ہو جائے تو استغفار اس طرح کرتے ہیں۔ اسی کو مکر اور اسی کو تقیہ کہتے ہیں۔

ایک مثال قرآن شریف سے پیش کیجاتی ہے۔ سورہ کہف میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کی ملاقات کا ذکر ہے۔ تمام فرقِ اسلامیہ کی تفاسیر اِس اَمر پر متفق ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کو ایک مرتبہ یہ خیال آگیا کہ اس وقت روئے زمین پر اُن کے برابر کوئی عالِم نہیں۔ اُسی وَقت وَحی ہوئی کہ اے موسیٰؑ تم کو یہ خیال آیا کہ تمہاری مثل دُنیا میں کوئی عالم نہیں ہے تو جاؤ اور ہمارے بندے سے علم سیکھو۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ مع اپنے وصی یوشع بن نونؑ حضرت خضرؑ کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ جب حضرت خضرؑ سے ملاقات ہوئی تو اُن سے کہا کہ کیا میں آپکی متابعت کر سکتا ہوں اس غرض سے کہ جو کچھ علم آپ کو سکھلایا گیا ہے اُس میں سے کچھ مجھے بھی سکھا دیں۔ حضرت خضرؑ نے جواب دیا "قال انک لن تستطیع معی صبراہ" (آیت ۶۷) ترجمہ: تحقیق کہ تم میرے ساتھ ہر گز صبر نہ کر سکو گے" وکیف تصبر علی مالم تحط بہ خبرا (۶۸) اور تم اُس پر کیسے صبر کرو گے جس کی تمہیں پوری طرح خبر نہ ہو۔

"قال ستجدنی ان شاء اللہ صابرا و لا اعصی لک امرا (۶۹)" حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ انشاءاللہ تعالیٰ مجھے تم صبر کرنیوالا پاؤ گے اور میں کسی بات میں تمہاری نافرمانی نہ کروں گا۔ اس پر حضرت خضرؑ نے کہا کہ اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو مجھ سے کسی شے کے متعلق کچھ سوال نہ کریں جب تک کہ میں خود ہی اس کے متعلق آپکو نہ بتلاؤں۔ پس دونوں روانہ ہوگئے یہاں تک کہ ایک کشتی میں سوار ہوئے اور حضرت خضرؑ نے اس میں سوراخ کر دیا حضرت موسیٰؑ نے کہا تم نے اس میں اسلئے سوراخ کیا ہے کہ سب کشتی والوں کو غرق کر دو۔ یہ تم نے عجب کام کیا۔ "قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّکَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا (۷۲)" حضرت خضرؑ نے کہا کیا میں نہ کہتا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے۔ حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا کہ میری بھول پر مجھ سے مواخذہ نہ کرو اور میرے کام میں دشواری پیدا نہ کرو۔ "فانطلقا" پس دونوں روانہ ہوگئے یہاں تک کہ ایک لڑکا ملا اور حضرت خضرؑ نے اُسے قتل کر دیا۔ فوراً حضرت موسیٰؑ بول پڑے۔ ہائیں! تم نے ایک نفس کو بے جرم قتل کر دیا۔ یہ تو البتہ تم نے برا کام کیا۔ "قال الم اقل لک انک لن تستطیع معی صبرا" حضرت خضرؑ نے کہا کیا میں تم سے نہ کہتا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ اگر اس کے بعد میں آپ سے کسی شئے پر سوال کروں تو آپ میرا ساتھ چھوڑ دیں۔ اب آپکا عذر مجھ پر معقول ہوگیا ہے۔ "فانطلقا" پھر دونوں روانہ ہوگئے یہاں تک کہ ایک گاؤں میں پہنچے اور وہاں کے رہنے والوں سے کہا ہم مسافر ہیں کوئی ہماری مہمانی کرے یا ہمیں کھانا کھلائے مگر سب نے انکار کر دیا اور کوئی فرد بھی میزبانی کے لئے تیار نہ ہوا۔ اسی عرصہ میں حضرت خضرؑ نے ایک دیوار جو شکستہ حالت میں تھی دیکھی۔ یہ جلدی ہی گرنے والی تھی۔ حضرت خضرؑ نے اس کو مرمت کر کے تعمیر کر دیا۔ حضرت موسیٰؑ بول پڑے کہ اگر آپ چاہتے تو اس کی اجرت لے لیتے یعنی مطلب حضرت کا یہ تھا کہ ایسے خشک اور بداخلاق لوگوں کے لئے جنھوں نے مسافروں کو مہمان بنانا گوارا نہ کیا آپ

نے یہ کام مُفت کیوں کیا۔ اس پر حضرت خضرؑ نے کہا" قال ھذا فراق بینی وبینک"
یعنی اَب میرے اور تمہارے درمیان جُدائی ہے۔ اَب میں تم کو ان تمام کاموں کی تاویل
بتلاتا ہوں جن پر تم صبر نہ کر سکے۔ پہلی چیز وہ کشتی کہ وہ دو مسکینوں کی ملکیت ہے۔
دریا میں چلاتے ہیں اور اسی پر ان کی گزر بسر ہے۔ میں نے اس میں سوراخ کر کے عیب دار
بنا دیا اس لئے کہ بادشاہ کے آدمی پیچھے آ رہے تھے اور ہر بے عیب کشتی کو بیگار کے لئے
پکڑ رہے تھے۔ میں نے اُس کو خراب کر کے غصب ہونے سے بچا لیا۔ کشتی مرمّت
ہو جائے گی اور مسکینوں کی کمائی بند نہ ہوگی۔ لڑکے کے قتل کے متعلق تبلایا کہ اسکے
ماں باپ مومن ہیں اور یہ ایسا کافر اور بد باطن تھا کہ اپنے والدین کو بھی گمراہ کر دیتا۔
اس لئے میں نے چاہا کہ رَبّ العزت ان کو اس کا نعم البدل عطا فرمائے اور وہ گمراہی
سے محفوظ رہیں۔ اور وہ دیوار۔ پس وہ دو یتیموں کی ملکیت ہے جو شہر میں رہتے ہیں ان کا
باپ نہایت نیک و صالح تھا اور اس دیوار کے نیچے ایک خزانہ دبا ہوا ہے جو ان یتیموں
کا مال ہے۔ اگر دیوار گر جاتی تو اندیشہ تھا کہ کوئی اُس مال کو نکال نہ لے۔ لہٰذا میں نے
وہ دیوار پھر سے بنا دی تا کہ جب وہ یتیم جوان ہو جائیں تو اپنے مال کو نکال لیں۔"

یہ تمام متن قرآن ہے۔ کوئی روایت یا حدیث تو نہیں جس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ
یہ ضعیف ہے یا قابل اعتماد نہیں۔ دیکھئے اس واقعہ پر کتنے ہی شبہات و وساوس
پیدا ہوتے ہیں۔ پہلے یہ کہ حضرت موسیٰؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر کو ایسا خیال آنا جو رضائے
الٰہی کے موافق نہ ہو کہاں تک درست ہو سکتا ہے؟ دوسرے یہ کہ ایک مقرب بارگاہ
پیغمبر، حضرت خضرؑ سے سوال کرتا ہے، اور وہ بھی بارگاہ ایزدی میں مقرب ہے، اسکے
جواب میں حضرت خضرؑ کا کہہ دینا کہ تم ہرگز ہرگز صبر نہ کر سکو گے کہاں تک اخلاق کا اظہار
کرتا ہے؟ تیسرے کشتی کا واقعہ تو ایسا ہے کہ ایک رمّال یا نجومی جو علم میں ماہر ہو، یا
ایک صاحب ریاضت فقیر کو بھی اس کا علم ہو سکتا ہے بلکہ سفلی عملیات کا عامل کامل

بھی اِن باتوں سے خبردار ہو سکتا ہے کہ پیچھے بادشاہ کے آدمی کشتیاں پکڑنے کے لیئے آرہے ہیں۔ اور حضرت موسیٰؑ جیسا جلیل القدر پیغمبر اِن صفات سے کورا ہو' یہ کہاں تک درست ہو سکتا ہے؟ چوتھے یہ کہ ایک مومن کامل الایمان کو بھی سہو و نسیان نہیں ہوتا اور ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سہو و نسیان کے عیب سے پاک ہوتے ہیں۔ مگر یہاں قرآن گواہی دے رہا ہے کہ موسیٰؑ وعدہ کرتے ہیں کہ میں آپ کے کاموں کے متعلق کچھ بھی آپ سے دریافت نہ کروں گا لیکن تھوڑی ہی دیر میں بھول جاتے ہیں اور ایک مرتبہ نہیں تین مرتبہ۔ ہر مرتبہ وعدہ کر کے بھول جانا' یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ایسا سہو و نسیان تو ایک معمولی اِنسان کو بھی نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ کلیم اللہ! مقرب بارگاہِ ایزدی سے ایسا عمل صادر ہو۔؟ تعجب ہی تعجب ہے! اور نہایت حیرت انگیز بھی۔

اگر اس واقعہ کی حقیقت سمجھنا چاہیں تو اس امر پر غور کریں کہ دین کا تعلق نفسِ انسان سے ہے۔ رسولؐ کی بعثت کا مقصد کوئی سلطنت یا حکومت قائم کرنا نہیں ہے۔ اِس کے لیئے دیکھیں سورہ جمعہ آیت ۲ میں جناب باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"ھوالذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوعلیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتٰب والحکمۃ ط" وہ وہی ذات ہے جس نے اُمیوں میں اُن ہی میں سے ایک رسول بھیجا تاکہ اس کی آیتیں اُن پر تلاوت کرے اور اُن کے نفسوں کا تزکیہ کرے اور اُن کو تعلیم دے کتاب و حکمت کی"۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ بعثتِ رسول کا مقصد تزکیہ نفس ہے لہٰذا دین کا تعلق نفس سے ہے۔ اس لیئے ضروری ہوا کہ ہم دین کے متعلق اگر کچھ سمجھنا چاہتے ہیں تو پہلے فطرتِ نفس کا مطالعہ کریں ورنہ کچھ سمجھ نہیں سکتے۔ نفس پر کسی بات کا گہرا نقش بٹھانے کے لیئے ہنگامے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیجیئے اس بات کو ایک سیدھی سادی اور سامنے کی مثال سے سمجھیئے۔ آپ مجالسِ عزا میں محافلِ میلاد میں برابر شریک ہوتے رہتے ہیں

جہاں اَن گنت لوگ اور سیکڑوں چہرے نظر آتے ہیں مگر اُن میں سے کیا کسی کا کوئی نقش آپ کے ذہن پر گہرا ہو کر اپنی یاد چھوڑ جاتا ہے ؟ ۔ نہیں ! ایسا نہیں ہوتا ۔ اس محفل کی سرسری اور دُھندلی سی ایک جھلک باقی رہ جاتی ہے اور بس اتنا سا خیال رہ جاتا ہے کہ ہاں وہاں بہت سے لوگ تھے ۔ لیکن اگر ایسی ہی کسی مجلس یا محفل میں دو آدمیوں میں کچھ جھگڑا ہو جائے یا کسی کا بچہ بہت روئے اور شور مچائے اور سب لوگ اُس کو وہاں سے اٹھ جانے کے لئے کہیں لیکن وہ نہ اُٹھے بلکہ نوبت تُو تُڑ میں تک آجائے اور جھگڑا لڑنے کے بعد ہی بچے کو لے کر وہاں سے نکلے تو ایسی صورت میں ان لوگوں کی شکل وصورت اور اس واقعہ کا ایسا گہرا نقش ذہن پر بیٹھے گا کہ آپ اُن کو کسی اور جگہ ایک نظر دیکھتے ہی پہچان لیں گے بلکہ اگر کوئی دوست ساتھ ہو تو اُس کو بھی پہچنوائیں گے کہ دیکھو یہ وُہی لوگ ہیں ۔ اس سے ثابت ہوا کہ انسان کے ذہن پر گہرا نقش بٹھانے کے لئے جس کو وہ کبھی نہ بھول سکے ، ہنگامے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ لہٰذا ہادیان دین وجملہ انبیاء ومُرسلین لوگوں کی ہدایت کے لئے ہنگامے برپا کرتے ہیں تاکہ جو بھی سبق وہ لوگوں کو دینا چاہتے ہیں اُس کا خُوب گہرا نقش اُن کے ذہنوں پر بٹھا دیا جائے ۔ حضرت خضرؑ اور حضرت موسیٰؑ کے واقعہ کی بھی حقیقت یہ ہی ہے کہ یہ محض ایک ڈرامہ ہے یعنی ایک ہنگامہ برپا کیا گیا ہے اور وہ بھی ایک سبق سکھانے کے لئے ، صرف ایک بات ذہن نشین کرانے کے لئے کہ اے دُنیا والو دیکھو اتم چاہے کتنے ہی علوم میں مہارت حاصل کرلو ، کتنی ہی منازل معارفت طے کرلو مگر کوئی شخص کسی وقت اور کسی منزل پر یہ خیال نہ کرے کہ مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا ۔ ایسے خیال ہی سے تمام محنت برباد ہو جائے گی اور جو بھی صفات حسنہ اُس شخص میں پیدا ہوئی ہوں گی وہ زائل ہو جائیں گی ۔ جناب موسیٰؑ دکھلاتے ہیں کہ لوگو دیکھو ! میں خدا سے ہم کلام ہونیوالا اُس کا پیغمبر ہوں مگر ایسا خیال میرے دل میں آیا اور اس کے آتے ہی اللہ تعالیٰ نے

مجھے جھڑک دیا۔ اس واقعہ سے متعلق تمام آیات متشابہات ہیں اور یہ تمام افعال و اقوال مکر یا تقیہ ہیں۔

جتنے مراتب کمال بلند ہوتے جاتے ہیں اتنا ہی مکر و تقیّہ کا لزوم اور ان کی منازل بھی شدید ہوتی جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ شدید مکر و تقیہ سردار رُسل اور اُن کے اہلبیتؑ کا ہے۔ یہ چونکہ اکمل افرادِ انسانیت ہیں اس لئے ان کا مکر و تقیّہ بھی اعلیٰ ترین منازل پر ہے۔ رسولؐ اور ائمہؑ علیھم السلام کا تو ذکر ہی کیا ہے اُن کے دیگر افرادِ خاندان کو دیکھیے۔ محبوبِ خدا اشرف الانبیاء کے متعلق ذکر کرنا ہو تو کئی مجالس درکار ہوں گی۔ ذرا اُن کی بیٹی کی بیٹیوں پوتیوں کو ہی دیکھ لیں۔ یہ تو نبی نہ تھیں، رسول نہ تھیں، امام نہ تھیں۔ ان پر ہدایتِ خلق لازم نہ تھی لیکن انھوں نے ہدایتِ خلق کے لئے امامِ زمانہ کی نصرت و تائید میں جیسا مکر و تقیّہ کیا ہے اس کی مثال روئے زمین پر نہیں ملتی۔ سُننے والوں کو حیرت تو ضرور ہوگی کہ یہ تقیہ کا کون سا محل تھا اور ایک نادان جاہل تو یہاں تک کہہ دیگا کہ حالات و واقعات ہی ایسے تھے اور اس میں ان بیبیوں کا کون سا ارادہ شامل تھا۔ تمام اعزّا و اقارب قتل ہو چکے تھے۔ دشمنوں نے اُن کو قید کر لیا تھا۔ انسان پر جیسی پڑتی ہے اُسے بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ اس میں انکی کیا خصوصیت ہے۔ ایک ظاہر بین تو ایسا ہی سمجھے گا، ایسا ہی کہے گا مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ رسولؐ کی نواسیوں سیدہؑ کی بیٹیوں نے رسن بستہ، سر برہنہ تشہیر ہو کر اسلام کی کیا خدمت انجام دی ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اُس وقت تمام مملکتِ اسلامی میں جو اسوقت کی آباد دُنیا کے تقریباً ایک چہارم حصّہ پر پھیلی ہوئی تھی، لوگوں کے ضمیر مُردہ ہو چکے تھے۔ بادشاہوں کے مظالم سے یہ حال ہو گیا تھا کہ کسی کی بنو اُمیّہ کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت نہ تھی۔ کسی میں اتنی بھی اسلامی حمیت باقی نہ رہی تھی کہ کلمۂ حق زبان پر لا سکے۔

مگر جب رسول زادیوں کو قید کرکے شہر بہ شہر پھرانا شروع کیا اور کوفے سے دمشق لے کر چلے تو جب لوگوں کو معلوم ہوتا تھا کہ یہ اولادِ رسولؐ اور اہلبیتِ نبوّت ہیں تو ان ہی مُردہ ضمیر لوگوں میں ہیجان برپا ہو جاتا تھا۔ لوگ لشکرِ یزید پر پتھر برساتے تھے۔ کتنے ہی شہروں میں ایسا ہُوا کہ اہلِ شہر مرنے کے لئے تیار ہو کر فوجِ یزید کے مُقابلے پر آمادہ ہو گئے۔ غرضیکہ ان مخدراتِ عصمت و طہارت نے دُنیائے اسلام کے مُردہ ضمیر میں جان ڈال دی اور مُردہ نفوس کو جلا دیا۔ ظالم حکومت کا خوف زائل ہُوا اور خدا کا خوف دلوں میں جاگزیں ہو گیا۔ لوگ حق کی حمایت پر کمر بستہ ہونے لگے گویا کہ اسلام جو مُردہ ہو چُکا تھا زندہ ہو گیا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ مخدراتِ عصمت و طہارت کیا یہ تمام آلام و مصائب سہنے پر اور ظالموں کی قید میں رہنے پر مجبور تھیں اور اس سے بچنے کی کوئی صورت نہ تھی یا یہ امرِ اختیاری تھا۔ اس کے لئے صرف ایک واقعہ ہی دیکھ لینا کافی ہے۔ دیکھئے جب اہلبیتِ رسالت کا لُٹا ہُوا قافلہ بے ہودج و محمل کے اونٹوں پر سوار سر برہنہ، بال کھولے ہوئے بے مقنعہ و ردا بازارِ کوفہ میں پہنچا تو وہاں جشن منایا جا رہا تھا۔ فوج کا اژدہام، لاکھوں تماشائیوں کا ہجوم، ہزاروں گھوڑے اور اونٹ ہنہنا اور بلبلا رہے تھے۔ بچّے چلّا رہے تھے۔ لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ غرضکہ ان تمام آوازوں سے ایسا شور برپا تھا کہ کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ مگر ایسے میں ایک بی بی کی، جو سر برہنہ اونٹ پر سوار تھی، آواز بلند ہوتی ہے کہ اہلِ کوفہ حق کی طرف کان لگاؤ! اس آواز کا بلند ہونا تھا کہ اونٹوں کا بلبلانا بند۔ گھوڑوں کا ہنہنانا موقوف۔ لوگ چُپ اور بچّے خاموش ہو گئے۔ تمام مجمع پر ایک سنّاٹا سا چھا گیا۔ انسان تو انسان جانوروں کے بھی سانس لینے کی آواز تک نہ آتی تھی۔ گویا کہ کوئی ذی رُوح وہاں موجود ہی نہیں تھا بلکہ سب پتھر کی مورتیں تھیں۔ سامعین سمجھ گئے ہوں گے یہ آواز کس کی تھی۔ ارے! یہ محبوبِ خدا

کی نواسی، سیدہ عالم کی نور دیدہ، مولا علیؑ کی بیٹی جناب زینب کبریٰ کی صدا تھی۔ اب غور کریں کہ کسی بڑے سے بڑے طاقتور شہنشاہ کے لئے بھی کیا اس کا امکان ہے کہ ایک آواز سے تمام مجمع کے آدمیوں، گھوڑوں، اونٹوں، خچروں کو خاموش کردے؟ نہیں! ہرگز نہیں!! یہ تو کسی شخص کے لئے ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ تو سیدہ کی بیٹی، رسول اللہ کی نواسی کی قوت ارادی تھی۔ دنیا کو یہ دکھلانا تھا کہ دیکھو ہم کو مجبور نہ سمجھ لینا۔ اگر ہم چاہیں تو طبقات الارض کو الٹ دیں۔ ایک اشارے سے پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹا دیں۔ مگر اس قوت ایمانی کے باوجود صرف ہدایت خلق کے لئے بازوؤں میں رسن بندھوانی۔ قید ہونا گوارا کیا۔ طرح طرح کے مظالم برداشت کئے۔ اہلبیت اطہار میں ہی ایک مخدّرہ کا بیان ہے کہ (ان دمعت عینا قرح راسہ بالرمح) فوج یزید کے ظلم کا یہ حال تھا کہ اگر ہم میں سے کسی کے آنسو نکلنے لگتے تھے تو اس کے سر کو نوک نیزہ سے زخمی کر دیا جاتا تھا۔

قربان ہوں ہماری جانیں ان مخدرات عصمت و طہارت پر جنھوں نے ہماری ہدایت کے لئے ایسے شدید مصائب و آلام برداشت کئے اور ہر دم یہ ظاہر کرتی رہیں کہ وہ بھی ہماری طرح مظلوم و مجبور ہیں حالانکہ ان کے ایک اشارہ سے دشمنوں پہ آسمان سے بجلی گر کر سب کو ہلاک کر سکتی تھی۔ اگر وہ زمین کو حکم دیتیں تو شق ہو کر سب کو نگل جاتی۔ ہوا سے کہتیں تو وہ مثل قوم عاد اعدائے دین کو تباہ کر دیتی لیکن ان میں سے کسی نے بھی اپنی قوت باطنی کو استعمال نہیں کیا اور تمام شدائد و مصائب اسی طرح سہتی رہیں جیسے کہ ان میں ان کو دفع کرنے کی قوت نہ تھی اور وہ بھی ہماری طرح مجبور تھیں۔ یہی ان کا تقیہ ہے۔ کیا تاریخ عالم میں ایسی کوئی مثال مل سکتی ہے؟ نہیں نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اس کا تو امکان ہی نہیں ہے۔ تقیہ کی یہ بلند منزل صرف آل محمدؑ میں ملے گی خواہ وہ کوئی بی بی ہو یا بچہ، جوان ہو یا بوڑھا۔

روکر کہو ہم زینبؑ دلگیر کے صدقے
کھولے ہوئے گیسوئے گرہ گیر کے صدقے

ہم خاک پہ زنداں میں ترے سونے کے قرباں
ہم آپ کی چھینی ہوئی چادر کے تصدق
عباسؑ کے قرباں علی اکبرؑ کے تصدق

مقتول جفا شاہ کی ہمشیر کے صدقے
اُس بولتے قرآن کی تفسیر کے صدقے

دربار میں سر ننگے کھڑے ہونے کے قرباں
ٹوٹے ہوئے گہوارۂ اصغرؑ کے تصدق
ہم آپ کے مجروح برادر کے تصدق

ریتی پہ پڑے لاشۂ بے سر کے ہوں صدقے
بے غسل و کفن، خلق کے سرور کے ہوں صدقے

دوسری مجلس

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ الحمد للہ الذی قرب من خطرات الظنون وبعد عن ملاحظۃ العیون والصلوٰۃ والسلام علیٰ درّ المکنون ۔ حبیبہ الذی یسلمہ المرسلون محمدن المصطفےٰ والہ واھل بیتہ الذین یصلون علیہم الملٰئکۃ المقربون ۔ اما بعد فقد قال اللہ تبارک تعالیٰ فی کتابہ المجید وفرقانہ الحمید وقولہ الحق ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ یا ایہا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین ۝

جناب رب العزت اپنے کلام پاک میں ارشاد فرماتا ہے کہ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ! صلوٰۃ۔

خدا کا حکم ہے کہ سچوں کے ساتھ ہو جاؤ تو اب سچوں کی تلاش کیجیے۔ سچا کون ہو سکتا ہے۔ جو سچ بولے وہی سچا۔ یہ تو ٹھیک ہی کہ جس نے کسی حقیقت کے مطابق عمل سے یا قول سے اظہار کیا وہ سچا تو ہے مگر یہ کیا ضروری ہے کہ اس موقع کے علاوہ کسی اور وقت یا کسی دوسری جگہ اس نے سچ کیخلاف نہ کہا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص ہمیشہ جھوٹ ہی بولتا رہا ہو مگر ہمارے سامنے جو ایک معاملہ آگیا اس وقت اُس نے سچ کہدیا تو ایسے شخص کو صادق نہیں کہا جا سکتا۔ صادق تو صرف وہی ہو سکتا ہے جس نے کبھی کسی وقت اور کسی حالت میں بھی جھوٹ نہ بولا ہو اور ایسا شخص سوائے معصوم کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

ہمارے خیال کے مطابق تو یہی درست ہے کہ صادق کے لقب کا وہی شخص مستحق ہے جس نے دنیا میں آکر یعنی پیدائش سے لے کر آخر عمر تک کبھی عمل سے یا قول سے خلافِ حقیقت اظہار نہ کیا ہو۔ یعنی کبھی جھوٹ نہ بولا ہو۔ اس کی زبان پر سچ ہی رہا ہو۔ پہلی مجلس اسی مضمون کو لئے ہوئے گزر چکی ہے۔ جس میں صدق کے معنی واضح کئے جا چکے ہیں۔ نیز ان نکات پر روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ:۔

۱۔ حقیقت کے مطابق اظہار کرنا بشرطیکہ احقاقِ حق کے لئے ہو صدق ہے اور بدنیتی سے ہو تو جھوٹ۔

۲۔ خلافِ حقیقت بیان جبکہ ہدایتِ خلق کی ضرورت کے لئے کیا جائے وہ جھوٹ نہیں ہے بلکہ مکر و تقیہ کہلاتا ہے۔ نفسِ انسان پر گہرے نقوش بٹھانے کے لئے، قوانینِ فطرت کی رو سے ہنگاموں کی ضرورت ہوتی ہے جو حقیقت نہیں ہوتے۔ موسیٰؑ اور خضرؑ کی ملاقات بھی ایک امر کا گہرا نقش بٹھانے کے لئے ایک ہنگامہ ہے۔ ہر صاحبِ ایمان اور صاحبِ معرفت پر تقیہ واجب ہے تاکہ نااہلوں پر حقائق کا اظہار نہ کریں۔

جتنے مراتبِ ایمان و معرفت بلند ہوتے جاتے ہیں اتنی ہی منزلِ تقیہ بلند ہوتی جاتی ہے حتیٰ کہ ولادت سے وفات تک ہادیانِ دین کی تمام زندگی تقیہ ہی تقیہ ہے مثلاً وہ اپنے کو مجبور و لاچار ظاہر کر کے مظلومیت کی زندگی ہدایتِ خلق کے لئے اختیار کرتے ہیں درآنحالیکہ وہ ہر شے پر قادر ہیں۔ غرض کہ ہم صادق اس کو کہہ سکتے ہیں جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو مگر اس سے بھی کچھ بلند درجہ رکھنے والی ہستیاں ہمارے سامنے آتی ہیں کہ جو کچھ وہ کہہ دیں وہی سچ ہو جائے۔ جن کا ہر قول و فعل حق ہی نہیں بلکہ جدھر کو وہ پھریں حق بھی اُدھر ہی پھر جائے۔ جنابِ سرورِ کائنات فخرِ موجودات کا ارشاد ہے "علی مع الحق والحق مع علی یدور حیثما دار" یعنی علیؑ حق کے ساتھ ہے اور حق

علیؑ کے ساتھ۔ جس طرف علیؑ پھرتے ہیں اسی طرف حق بھی پھر جاتا ہے۔" ان ہستیوں میں سے جن پر صادقین کا اطلاق ہو سکتا ہے ایک ہستی امیر المومنین سید الوصیین علیؑ ابن ابی طالبؑ کی ہے کہ سچ کے محتاج نہیں بلکہ سچ خود اُن کا محتاج ہے۔ جو کچھ یہ کہہ دیں خود سچ مجبور ہو جائے گا کہ اُسی کی مطابقت کرے۔ اس کی مثال دیکھنا ہو تو آئیں علیؑ کے در پہ آکر دیکھیں۔

محبوبِ خدا کی دُختر نیک اختر سیدۃ النساء العالمین صدیقہؑ طاہرہ زوجۂ علیؑ مرتضیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام صحن خانہ میں تشریف فرما ہیں کہ محبوب کبریا کے پیارے سیدۂ عالم کے راج دلارے علیؑ مرتضیٰ کی آنکھوں کے تارے حسنین علیہم السلام گھر میں تشریف لاتے ہیں اور آتے ہی مادر گرامی سے لپٹ جاتے ہیں۔ حبیبِ خدا کی پیاری اپنے پیاروں کو سینہ سے لگا لیتی ہیں تو وہ عرض کرتے ہیں اماں جان کل عید ہے سب لڑکے عید پر نئے کپڑے پہنیں گے۔ اماں جان ہمارے عید کے کپڑے کہاں ہیں۔ اُس وقت تو سیدۂ عالم نے بچوں کو بہلا دیا مگر جب دن ختم ہو گیا اور بچے اصرار کرنے لگے تو معصومہ نے فرمایا بچو! تمہارے کپڑے درزی لائے گا تم اطمینان سے سو رہو۔ یہاں روایت کا بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ صرف یہ بیان کرنا ہے کہ چونکہ صدیقہؑ طاہرہ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے تھے کہ درزی تمہارے کپڑے لائے گا تو قدرت اسکی تصدیق اس طرح کرتی ہے کہ صبح سے پہلے دق الباب ہوتا ہے۔ دریافت کرتی ہیں کون ہے تو جواب ملتا ہے حسنینؑ کا درزی ہوں۔ صاحبزادوں کے کپڑے لایا ہوں۔ اللہ اکبر رضوانِ جنت صدیقہ کے کلام کی تصدیق کے لئے درزی بن کر اہلبیتؑ کے دروازے پر آتا ہے۔ صلوٰۃ!

اعتراض کرنے والے مشککین کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو ایک فرقہ کی روایت ہے جو دیگر فرقِ اسلامیہ کے لئے لائق وثوق نہیں ہے۔ اچھا ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ایک فرقہ کی روایت ہے جو دیگر فرقِ اسلامیہ پر حجت نہیں ہو سکتی لیکن اس بات کے ماننے

ہے تو کسی کو چارہ نہیں کہ صادقین کا اطلاق صرف ان ہی ہستیوں پر ہو سکتا ہے جن سے کبھی صداقت کے خلاف اظہار نہ ہوا ہو اور ایسی ہستی صرف معصوم ہی ہو سکتی ہے۔

کسی نبی کی زندگی کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام عوام کی مثل ہی زندگی گزارتے ہیں۔ جیسی کیفیات نفسی عوام کے نفوس پر طاری ہوتی ہیں وہ ویسی اپنے اوپر طاری کر کے دکھلاتے ہیں۔ حضرت یعقوبؑ کو دیکھیے کہ فراق یوسفؑ میں روتے روتے بینائی زائل ہو گئی جس کی شہادت قرآن کریم میں موجود ہے جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے" وابیضت عیناہ من الحزن فھو کظیم" یعنی اُن کی دونوں آنکھیں روتے روتے سفید ہو گئیں اور وہ بڑا ضبط صبر کرنے والے تھے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ حالت اضطراری تھی یا اختیاری۔ اس کے لئے اس پر غور کرنا ضروری ہے کہ نبی اُن تمام کمالات کا حامل ہوتا ہے جو دیگر افراد انسان ریاضت نفس کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں اگر ایسا نہ ہو یعنی نبی کے پاس وہ کمالات نہ ہوں جو عام انسان ریاضت کے ذریعے حاصل کر لیتے ہیں تو ظاہر ہے ایسے لوگوں کے سامنے نبی کی منزلت کم ہو جائے گی، اُن کا درجہ گر جائے گا اور وہ پست ہو جائینگے اور یہ بات وہ ہے کہ کوئی بھی مسلمان ماننے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ ایک ماہر علم رمل ایک علم نجوم کا صحیح واقف، ایک صاحب ریاضت فقیر بھی سیکڑوں میل دُور کے حالات اور کھوئی ہوئی چیزوں اور لوگوں کا پتہ بتا دیتے ہیں۔ ریاست اندور میں ایک صاحب ریاضت سید صاحب ۱۹۲۳ء تک تو بقید حیات تھے۔ اب معلوم نہیں زندہ ہیں کہ نہیں۔ اُن کے پاس اکثر ایسے سائل آیا کرتے تھے۔ ایک دن ایک آدمی آیا اور کہنے لگا کہ میری گائے کھو گئی ہے۔ سید صاحب نے اپنے ہاتھ کو غور سے دیکھا اور اس کو بتلا دیا کہ تیری گائے یہاں سے چند میل کے فاصلے پر فلاں پہاڑی کے دامن میں ایک درخت کے نیچے موجود ہے۔ چنانچہ وہ شخص اس پتہ پر پہنچ گیا اور اپنی گائے کو

لے آیا۔

جب یہ کمالات عام لوگ علوم اور ریاضت کے ذریعے حاصل کر سکتے ہیں تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک نبی کے نفس میں یہ اہلیت نہ ہو۔ لہٰذا حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کا یہ فراق ظاہری ہے۔ حضرت یعقوبؑ نبی ہیں معصوم ہیں اور معصوم کے نفس میں تمام کمالات کا موجود ہونا لازم ہے۔ چنانچہ اس کے تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ یعقوب و یوسف علیہم السلام ہر وقت ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے اور ایک دوسرے کے حالات سے واقف تھے۔ حضرت یعقوبؑ کا گریہ اور مسلسل روتے رہنا ایک مظاہرۂ درد تھا تاکہ لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف جذب کریں۔ اس لئے کہ انسان کی فطرت یہ ہے کہ اُس کا دل مصیبت زدہ کی طرف کھنچتا ہے اور اُس سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔

نبی پیدائش سے ہی نبی ہوتا ہے۔ وہ پیدا ہی معصوم ہوتا ہے اور جملہ کمالات میں کامل ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے کمالات کا اظہار کرے اور عامۃ الناس جیسے جذبات اور کیفیات کا اظہار نہ کرے تو لوگ یا تو حیرت زدہ ہو کر گمراہ ہو جائیں گے یا خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوں گے اور نتیجہ میں باب ہدایت مسدود ہو جائیگا اور ہدایت خلق کا جو فرض نبی کے سُپرد ہے وہ پورا نہ ہو سکے گا۔ اس لئے انبیاء اور معصومین علیہم السلام پر لازم ہے کہ وہ حقیقت کو چھپائے رہیں اور عامۃ الناس جیسی کیفیات اپنے اوپر طاری کر کے دکھلائیں۔ اسی کو "تقیہ" کہتے ہیں۔

دیکھئے جناب سرورِ کائنات افضلِ موجودات صلعم نے ایک موقعہ پر جناب امیرالمومنین سید الوصیین حضرت علیؑ ابن ابیطالب علیہ السلام سے ارشاد فرمایا کہ یا علیؑ اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ تمہارے بارے میں اُسی کی مثل کہنے لگیں گے جو عیسیٰؑ کے بارے میں بہت سے لوگ کہتے ہیں تو میں آج تمہارے ایسے فضائل بیان کرتا کہ جس طرف سے تم گزرتے لوگ تمہارے

پاؤں کے نیچے کی خاک طلبِ شفا اور حلِ مشکلات کے لئے اُٹھایا کرتے۔ اس فرمان سے ظاہر ہوا کہ محبوبِ خدا اشرف الانبیاء نے حقیقت کو چھپائے رکھا۔ کیوں؟ صرف لوگوں کی گمراہی کے خوف سے۔ یہ آنحضرت کا "تقیہ" ہے۔ لفظ "تقیہ" سے چڑنے والے اسکے لئے کوئی اور لفظ بتلائیں۔ اس کے لئے کوئی دوسرا کلمہ بل ہی نہیں سکتا۔ "تقیہ" کی تعریف جو علامہ شیخ محمد یعقوب کلینی علیہ الرحمہ نے اصول کافی میں بیان فرمائی ہے وہ تو صرف اتنی ہے کہ ضرورت کے وقت خلافِ ضمیر اظہار کرنا تقیہ ہے۔ اسکی مثال قرآن کریم ہی میں دیکھ لیں۔ مکہ میں جب لوگ اسلام قبول کرنے لگے تو کفار قریش بہت غضبناک ہوئے۔ جو شخص مسلمان ہو جاتا تھا اُس پہ طرح طرح کے ظلم کرتے تھے جلتی ہوئی ریت پر لٹا کر سینہ پہ پتھر رکھ دیتے۔ کسی کو قید کر دیتے۔ شدید ضربیں لگاتے ایک دن چند مشرکین نے حضرت عمار یاسر کے گھر پہ حملہ کر دیا۔ اُن کے والدین کو تو مشرکین نے شہید کر دیا اور حضرت عمار کو پکڑ لیا۔ بہت مارا اور مجبور کیا کہ وہ رسول اللہ کی شان میں نازیبا الفاظ کہیں۔ چنانچہ بمجبوری جو کچھ اُنہوں نے کہلوایا وہ حضرت عمار نے کہدیا۔ تب جا کر انہیں چھوڑا گیا۔ جب یہ واقعہ مشہور ہوا تو بعض لوگوں نے جنابِ سرورِ کائنات صلعم سے جا کر کہا کہ عمار تو کافر ہو گئے۔ ادھر حضرت عمار بھی باحالِ پریشان روتے ہوئے حضور کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور وہ دردناک واقعات سنائے۔ اسی وقت یہ آیہ شریفہ نازل ہوئی " ومن کفر باللہ من بعد ایمانہ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان" (اور جو شخص ایمان لانے کے بعد کافر ہو جائے سوائے اُس شخص کے جو مجبور کیا جائے درآنحالیکہ اُس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو) "ولکن من شرح بالکفر صدرا فعلیھم غضب من اللہ ط ولھم عذاب عظیم ٥" (اور لیکن جو کفر کے لئے سینہ (دل) کھولدے پس اُن پر اللہ کا غضب ہوگا اور اُن کے لئے بڑا عذاب ہے)۔ اُس وقت آنحضرت صلعم نے حضرت عمار کو بشارت

سُنائی کہ تم کافر نہیں ہوئے۔ یہ تم نے جو کچھ کیا ہے اپنے ضمیر اور دل کے خلاف کیا ہے اور بالکل مجبوری کی حالت میں۔ تمام تفاسیر میں اس آیت کی شانِ نزول میں یہ واقعہ موجود ہے۔ اسی کو "تقیہ" کہتے ہیں۔ لیکن یہ تو تقیہ کی پست ترین منزل ہے جو عامۃ الناس کے لئے ہے یعنی ضرورت کے وقت خلافِ ضمیر اظہار کر دینا جائز ہے اگر ایسا نہ کرے تو مجرم نہیں۔ اُس پر کوئی گناہ نہیں ہے جیسا کہ حالتِ اضطرار میں مُردار یا سُور کا گوشت یا کوئی اور حرام شے کھانے پر گناہ نہیں ہے (بقرہ آیت ۱۷۳) انما حرم علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر ۔۔۔ فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیہ ؕ"

(ہم نے تم پر مُردار اور خُون اور سُور کا گوشت حرام کیا ہے۔ پس جو شخص حالتِ اضطرار میں ہو (اور ایسی چیز کھالے) تو اُس پر گناہ نہیں ہے بشرطیکہ اُس کی نیت بغاوت کی نہ ہو یعنی یہ نیت نہ ہو کہ اچھی اس میں رکھا ہی کیا ہے۔ کھاؤ! یا یہ نیت ہو کہ ہم تو بار بار کھایا کریں گے۔ مثل مشہور ہے کہ تیسرے فاقہ میں تو مُردار بھی حلال ہے مگر یہ اختیاری ہے۔ ہلاکت سے بچنے کے لئے کھالے تو گناہ نہیں اور نہ کھائے تو بھی گناہ نہیں۔ اسی طرح عامۃ الناس کے لئے جان و مال کے تلف ہو جانے کے اندیشہ سے خلافِ ضمیر اظہار کرنا جبکہ دِل میں ایمان ہو، جائز ہے۔

اب تقیہ کی اس سے بلند تر منزل سامنے آتی ہے جہاں تقیہ واجب ہے اور تقیہ نہ کرنا جُرم اور گناہ ہے جس کی سخت سزا ملتی ہے۔ چُنانچہ اصول کافی میں جناب شیخ مُلا محمد یعقوب کلینی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب التقیہ میں حضرت صادق علیہ السلام کی ایک حدیث نقل فرمائی ہے اور وہ یہ ہے۔

"اتقوا علی دینکم بالتقیۃ انکم علی دین من کتمہ اعزہ اللہ ومن اذاعہ اذلہ اللہ۔"

حضرت اپنے محبوں سے ارشاد فرماتے ہیں کہ تم اپنے دین کو تقیہ سے چھپائے

رہو۔ تم ایسے دین پر ہو جس نے اُسے چھپائے رکھا اُس کو اللہ تعالیٰ فطرت پر غلبہ فرمائیگا اور جس نے اس کو افشا کیا اُس کو اللہ تعالیٰ ذلیل و خوار کرے گا۔

ہندوستان میں مُراد آباد کے ایک شخص نے ایک کتاب نصیحۃ الشیعہ لکھی تھی۔ اس میں تقیہ پر بہت اعتراضات کئے تھے۔ یہ حدیث جو آپ نے ابھی سُنی ہے اس کو نقل کر کے اُس شخص نے بہت مضحکہ اُڑایا ہے۔ ایک نظم بھی لکھ ڈالی تھی کہ کبھی امرِ حق کو زبان پر نہ لانا۔ جو سچ پوچھے کوئی تو ناحق بتانا" وغیرہ وغیرہ۔ اگر تقیہ کا مفہوم صرف یہ ہی ہو کہ ضرورت کے وقت خلافِ ضمیر اظہار کرنا تب تو اس حدیث کا سمجھنا مشکل ہے اس لئے کہ وہ تقیہ جائز ہے مگر صرف ضرورت کے وقت لیکن اس حدیث سے تقیہ کے لئے وجوب ظاہر ہوتا ہے اور وہ بھی ہر وقت۔ اس میں ضرورت کی بھی تخصیص نہیں بلکہ مولا فرما رہے ہیں کہ ہر وقت اور ہر حال میں تقیہ کرنا واجب ہے۔ لہٰذا یہ تقیہ وہ عوام کا تقیہ نہیں ہو سکتا اور یہ دین بھی جس کو ہر وقت چھپائے رکھنا لازم ہے عام مذہب اور عام دین نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہو تو یہ سب ماتم مجلس وغیرہ ختم کرنی پڑیگی مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ تقیہ کچھ اور ہی ہے۔ ہر چند کہ اس کا سمجھنا سہل نہیں ہے مگر کچھ نہ کچھ تو بیان کرنا ضروری ہے۔ پہلے ایک حدیث کا مضمون سُن لیں۔ مولوی مقبول احمد صاحب مرحوم نے اپنے ترجمۂ قرآن کے ضمیمہ میں حضرت صادق علیہ السلام کی ایک طولانی حدیث نقل فرمائی ہے جو توحید کے متعلق ہے جسکے ایک جزو کا لُبِ لُباب یہ ہے کہ مولا فرماتے ہیں کہ عُقلاء وہ ہیں جو تفکّر کرتے رہتے ہیں۔ غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب اُن کو حُبّ اللہ پیدا ہوتی ہے اس وقت وہ منزل ربوبیت میں پہنچ جاتے ہیں تب خلق اللہ کو اُن سے فوائد پہنچنے لگتے ہیں۔ پھر اُن کو امورِ قدرت میں دخل ہو جاتا ہے۔ یہاں پہنچکر علم اُن کو اس طرح عطا ہونے لگتا ہے کہ عُلماء کو نہ ملا ہو، وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ حدیث بہت طولانی ہے لہٰذا موقع کی ضرورت کے لئے اسی قدر پر اکتفا کی جاتی

ہے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے اور اکثر حضرات نے علمائے کرام سے بھی سُنا ہوگا کہ ایمان کے مدارج بہت ہیں۔ پست ترین درجہ ایمان ظاہری ہے۔ جس کو مدارجِ ایمان میں ترقی کی خواہش ہوتی ہے اور وہ اُس راستہ پر چلتا ہے جو اہلبیت طاہرین علیہم السلام نے تعلیم فرمایا ہے یعنی وہ ایسے اعمال بجالاتا ہے جن کا تعلق تزکیہ نفس یا حصولِ ایمان حقیقی سے ہے تو روح میں صفائی پیدا ہوتی ہے۔ باطنی قوتوں میں ترقی ہوتی ہے اور دین کے راز منکشف ہونے شروع ہوتے ہیں۔ جب کوئی راز منکشف ہوتا ہے تو سینہ میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ بے انتہا گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے اور اس وقت بہت دل چاہتا ہے کہ کسی سے اس راز کا ذکر کروں۔ پس اگر وہ صبر کرے گا اور اُس منکشف شدہ بات کو زبان پر نہ لائے گا تو علم کے دروازے کھلنے لگیں گے اور مدارجِ ایمان میں ترقی ہوتی رہے گی۔ اور اگر صبر نہ کر سکے اور لوگوں سے کہتا پھرے تو وہ کیفیت جو پیدا ہوتی ہے زائل ہوجائیگی اور آئندہ کوئی نعمت اُس کو نہیں ملے گی۔

اس کا سمجھنا تو مشکل ہے مگر آپ اتنا تو سمجھ سکتے ہیں کہ بہت سے اعمال و اوراد و وظائف ایسے ہیں کہ اُن کے کرنے سے مقدس روحوں سے رابطہ پیدا ہوجاتا ہے۔ بعض کو آئمہ علیہم السلام میں سے کسی کی زیارت ہوجاتی ہے۔ بعض کو خواب نظر آنے لگتے ہیں۔ کسی کو اعزا کی ارواح دکھائی دیتی ہیں۔ کبھی آوازیں سُنائی دیتی ہیں۔ پس جو لوگ ان مشاہدات یا خوابوں کا کسی سے ذکر نہ کریں گے اُن کی یہ باطنی قوتیں ترقی کرتی رہینگی اور قدرت کے راز اُن پر کھلنے لگیں گے۔ ارواح مقدسہ اُن کو آئندہ کی خبروں سے بھی مطلع کرنے لگیں گی۔ مگر وہ جو اُن کا ذکر کر دے گا وہ اس قوت سے بالکل محروم ہوجائے گا۔ اکثر عملیات جن میں کسی آیت وغیرہ کا ورد کیا جاتا ہے ایسے ہوتے ہیں کہ لوگ اپنی کسی حاجت کے لئے وہ ورد کرتے ہیں اور عمل کے دوران کسی بزرگ یا معصوم کی زیارت ہوتی ہے۔ پس اگر اُس کا ذکر زبان پر نہ آئے گا تو عمل مقبول ہوگا۔ حاجتیں

بتائیں گی اور اگر ذکر زبان پر آگیا تو عمل باطل ہو جاتا ہے بلکہ اُلٹا نقصان پہنچ جاتا ہے۔
یہ تفصیلات بھی ایسی ہیں کہ ہر شخص انکو بھی نہیں سمجھ سکتا۔ بات ایسی ہونی چاہیئے جو عام فہم ہو لہٰذا اب قرآن کریم ہی کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔ یہ تو ہر مسلمان کہتا ہے کہ قرآن پر میرا ایمان ہے اور الحشر کی آیت ۲۱ کہتی ہے "لو انزلنا ھٰذا القران علیٰ جبل لرایتہ خاشعا متصدعا من خشیۃ اللّٰہ" (اگر ہم اس قرآن کو پہاڑوں پر نازل کر دیتے تو تم دیکھتے کہ خوفِ خدا سے لرز لرز کر ٹکڑے ہو جاتے) یہ قرآن کی آیت ہے۔ پس جس کا ایمان قرآن پر ہے اُس کو تو اس میں ذرا بھی شک نہیں ہو سکتا کہ قرآن کا بوجھ پہاڑ نہیں اُٹھا سکتے مگر ہم تو کئی ایک قرآن ہاتھ میں اُٹھا لیتے ہیں۔ رمضان شریف میں کئی قرآن پڑھ ڈالتے ہیں اور ذرا سا بوجھ بھی محسوس نہیں ہوتا۔ ایک واقعہ سُنیئے۔ کسی عدالت میں ایک گواہ سے دریافت کیا گیا کہ کیا تم قرآن اُٹھاؤ گے۔ کہنے لگا کہ صاحب پہلے مجھے دکھا دیں تو پھر بتلا سکوں گا۔ چنانچہ قرآن کی ایک جلد اُسے دکھلائی گئی۔ دیکھ کر کہنے لگا جی ہاں ایسے تو میں دس قرآن بھی اُٹھا لوں گا۔ جس طرح کہ یہ جاہل قرآن اُٹھانے کا مطلب کتاب کے مادی جسم کو اُٹھانا سمجھتا رہا اسی طرح قرآن کے بوجھ کا مطلب بھی لوگ نہیں سمجھتے۔ لائق غور امر یہ ہے کہ آخر اس کا سبب کیا ہے کہ لوگوں کو قرآن کا بوجھ محسوس نہیں ہوتا۔ اس کے سمجھنے کے لئے صرف سورج کی مثال کافی ہوگی۔ کوئی شخص سورج کی شعاعوں کے سامنے ہاتھ، پیر، سر، سینہ غرضکہ جسم کا کوئی عضو کھول دے تو اُن میں سے ہر عضو سورج کی شعاعوں کی چمک برداشت کر لیگا مگر سورج کے مقابل آنکھ نہیں کھول جا سکتی۔ اگر آئینہ پر سے لوٹی ہوئی شعاع بھی آنکھ پر پڑ جائے تو آنکھ کے لئے اُس کی چمک بھی برداشت کرنا مشکل ہوگا۔ پس جس طرح سورج کی شعاعوں کا بار سارے جسم میں صرف آنکھ پر ہی محسوس ہوتا ہے اسی طرح چونکہ قرآن بھی نور ہے لہٰذا اس کا بار بھی تاریک قلوب کو محسوس نہیں ہو سکتا۔ جس طرح آئینہ پر سیاہی لگا دینے سے

شعاعوں کی چمک اس میں معلوم نہیں ہوتی اسی طرح قلب بھی اگر صاف نہیں تو اس پر نورِ قرآنی کا اثر نہیں ہوگا۔

احادیثِ متواترہ سے یہ امر ثابت ہے کہ کلام اللہ کے ایک ایک کلمہ کے ستّر ستّر بطن ہیں اور ہر بطن کے ستّر ستّر بواطن ہیں۔ عامۃ النّاس کا حال تو یہ ہے کہ کلام اللہ کے ظاہری مفاہیم پر ہی عمل نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ جناب ایسے اعمال تو متقی لوگوں کے لئے ہیں۔ ہم بھلا پورے قرآن پر کس طرح عمل کر سکتے ہیں پس اگر ان لوگوں کو قرآن کے اعلیٰ مفاہیم سُنا دیئے جائیں تب تو وہ مذہب ہی سے بیزار ہوجائیں گے اور کہنے لگیں گے کہ اگر یہی اسلام ہے تو ہمارے لئے اس پر عمل کرنا ناممکن ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ اعلیٰ مفاہیم کو لوگوں پر ظاہر نہ کیا جائے اس لئے کہ ان کے اظہار سے اگر ایک فرد بھی گمراہ ہوگیا تو اس کی ذمہ داری اُس بیان کرنے والے پر ہوگی اور اس کی سزا کا مستوجب ہوجائے گا۔ یہی وہ تقیّہ ہے جو ہر وقت اور ہر زمانہ میں لازم و واجب ہے اور جس کا ترک کرنا گناہ ہے۔

ہر چند کہ مطلب اچھی طرح واضح کردیا گیا ہے مگر سامعین صبر نہ کرسکیں گے اور مثال کے طالب ہوں گے تو صرف ایک صراط کی مثال ہی اُن کو مبہوت کرنے کیلئے کافی ہوگی۔ ہر روز کم از کم دس مرتبہ پڑھتے رہتے ہیں "اھدنا الصراط المستقیم" مگر کیا اس کا مفہوم بھی سمجھتے ہیں۔ ہر شخص یہ ہی سمجھتا ہے کہ عقائدِ صحیحہ کو تسلیم کرلینا ہی صراطِ مستقیم ہے۔ اور احادیث سے یہ امر بھی ثابت ہے کہ صراط پر چل کر ہی جنت میں پہنچا جاسکتا ہے۔ جو صراط پر نہ چل سکے گا وہ جہنم میں گر جائے گا۔ اب حضور سرورِ کائنات کا فرمان دیکھیں۔ ارشاد ہے" یا علی الصّراط صراطک"؛ اے علیؑ صراط تمہارا راستہ ہے! اب سوال یہ ہوگا کہ وہ راستہ کیا ہے؟ تو اسکو امیرالمومنین سیّد العارفینؑ نے واضح کردیا ہے۔ فرماتے ہیں " ما اشرکت باللہ طرفتہ عینی"؛ یعنی میں نے اللہ

کے ساتھ پلک جھپکانے میں بھی شرک نہیں کیا۔ جہال عوام اس کا مفہوم یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے اتنی دیر کو بھی بُت پرستی نہیں کی جتنی کہ پلک جھپکانے میں دیر لگتی ہے۔ اب اگر اس کا یہی مطلب ہے تو ہر وہ بچہ جو مُسلمان کے گھر پیدا ہوا ہے یہی دعویٰ کر سکتا ہے اس لئے کہ وہ پیدا ہی مُسلمان کے گھر میں ہوا ہے۔ اُس سے اور بُت پرستی سے کیا واسطہ۔ تو اگر امیر المومنینؑ نے بھی یہی بات کہی ہے تو اس میں اُن کی کونسی فضیلت ہوئی۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ اس بات کا ہرگز ہرگز یہ مفہوم صحیح نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب عوام کے تصور سے بہت بالاتر ہے۔ جب تک کیفیاتِ نفس کا مطالعہ نہ کیا ہو یا نہ کریں اس کا مفہوم حقیقی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا۔

سُنیے! جسمِ انسان میں بے شمار کام ہر وقت ہوتے رہتے ہیں مثلاً حرکتِ قلب، دورانِ خون، معدہ و جگر و آنتوں، گردوں، پھیپھڑوں وغیرہ کے کام۔ یہ افعال اضطراری کہلاتے ہیں اور نفس ان کا فاعل ہے لیکن اُس کو ان کا احساس تک نہیں ہوتا۔ یہ سب حرکات کیفیتِ لاشعوری میں جاری رہتی ہیں۔ زندگی کے اور تمام کام جو امورِ دُنیا کے متعلق ہیں اگر غیر ارادی اور لاشعوری میں صادر ہوں گے تو قرآن و حدیث کی رُو سے ان کو شرک سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہی ہوائے نفس ہے۔ جناب امیر المومنینؑ فرماتے ہیں سب سے بڑا معبود جس کی دُنیا میں عبادت کی جاتی ہے وہ ہوائے نفس ہے۔ اب مولا کے فرمان کا مطلب سمجھ میں آ سکتا ہے کہ پلک جھپکانے کا شرک سے کیا تعلق ہے۔ اب سمجھیں اور غور کریں کہ جسمِ انسانی کے اندر تمام اعضاء و جوارح کے سب کام ہر دم اور ہر لحظہ غیر ارادی اور لاشعوری طور پر ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی کام ایسا نہیں ہے جس پر انسان کو کچھ بھی اختیار حاصل ہو۔ مثلاً دل کی دھڑکن پر اور خون کے رگوں میں دوڑتے پھرنے پر انسان کو کیا اختیار ہو سکتا ہے۔ البتہ ایک پلک جھپکنے کا کام ہی ایسا ہے جو غیر ارادی اور لاشعوری طور پر ہوتا رہتا ہے مگر اُس پر

انسان کو اختیار بھی حاصل ہے۔ پس اگر اُس کو فریضۂ فطری سمجھ کر ارادتاً پلک جھپکائے تو یہ اللہ کی عبادتِ حقیقی ہوگی اور اگر غیر ارادی ولاشعوری طور پر یہ فعل صادر ہو تو یہ ہی شرکِ باطنی اور شرکِ خفی ہوگا۔ تو مولا کا مفہوم تو یہ ہے کہ غیر ارادی ولاشعوری طور پر میں نے کبھی پلک بھی نہیں جھپکائی یعنی اگر میری پلک تک جھپکی ہے تو میں نے اُسے فریضۂ فطری سمجھ کر رضائے الہٰی کے حصول کے لئے ہی جھپکایا ہے۔ یہ ہے مولا کا عمل اور یہ ہے اُن کا راستہ۔ اَب چلیئے مولا کے راستے پر اور کہیے " اھدنا الصراط المستقیم"۔

سامعین اَب ذرا غور فرمائیں کہ اگر صراط کا مفہوم حقیقی عامۃ الناس پر واضح کر دیا جائے تو کیا وہ وحشت میں مبتلا نہ ہو جائیں گے؟ کیا اُن میں سے بہت سے دین سے بیزار ہو کر یہ نہ کہنے لگیں گے کہ اگر یہی دین ہے تو ہم تو ایسے دین سے باز آئے دیکھئے البقرآیت ۲۸۶ " لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا" یعنی اللہ کسی نفس کو اُس کی اہلیت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ لہٰذا فریضۂ فطری ہے کہ عوام کو آیاتِ قرانی کا پست ترین مفہوم ہی بتلایا جائے۔ جیسے جیسے کسی فرد کا نفس ترقی کرتا جائے گا۔ ویسے ویسے اُس میں بلند مفاہیم سُننے اور اُن کا بار اٹھانے کی اہلیت پیدا ہوتی جائے گی۔

یہ ٹھیک ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نفس پر اُس کی اہلیت سے زیادہ بار نہیں ڈالتا مگر عزادارو! ہم دیکھتے ہیں کہ آلِ رسولؐ کا گھرانہ اِس قاعدہ سے مستثنیٰ ہوگیا۔ چنانچہ منقول ہے کہ بعد شہادتِ امامِ مظلومؑ عُمر سعد نے شمر ملعون سے کہا کہ ابنِ زیاد کا حکم ہے کہ حسینؑ کو قتل کرنے کے بعد اُن کے اہلِ حرم کو لُوٹو اور اُن کے خیموں میں آگ لگا دو۔ یہ سُنتے ہی ؎

نکلا عُمر کے خیمے سے ہنستا وہ بدگہر
اور نیزہ پر بلند کیا شاہِ دیں کا سر
پھر جا بسمت کو یہ ندا دی پکار کر
ہاں افسرانِ شام نہ کھولو ابھی کمر

برپا ہے گو حرم میں عزاداری حسینؑ
لوٹو، جلاؤ خیمۂ زنگاری حسینؑ

پھر تو سمٹ سمٹ کے سب اہل ستم چلے
وہ رُوسیاہ کھول کے کالے علم چلے
کہتے ہوئے یہ سوئے خیام حرم چلے
عباس اب کہاں ہیں ہو سوئے خیمہ ہم چلے

گھر عرب کی ہو گئی خالی حسینؑ سے
لوٹیں گے اب حسینؑ کی سرکار چین سے

جناب فضہ در خیمہ پر ننگے سر، غمزدہ و ششدر کھڑی ہوئی تھیں اور ادھر فوج کفار اژدہام کی صورت میں خیموں کو لوٹنے کے لئے بڑھی چلی آرہی تھی۔ آپ نے چلّا کر ان سے کہا کہ اے دشمنانِ دیں! کچھ تو خوفِ خدا کرو۔ اے ظالمو! کہاں بڑھے چلے آرہے ہو۔ یہ خیمہ گاہ شاہنشاہِ دوجہاں کی بارگاہ ہے، اس میں تمہارے رسولؐ کی آل پناہ گزیں ہے، گروہاں کون تھا جو ان ملاعین کو روکتا۔ عباسؑ دلاور، اکبرؑ و قاسمؑ، عونؑ و محمدؑ، امامِ مظلومؑ سب رخصت ہو چکے تھے۔ ایک ہُو کا عالم تھا۔ چند لاوارث بی بیاں اور کچھ یتیم بچے تھے جو حسرت و یاس سے ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے کہ دفعتہً:۔

"خیمہ میں بھر گئے جو ستم گار جا بجا
اہل حرم کو بھول گئی مرگِ اقربا
ماتم کی صف سے چھپنے کو دوڑی برہنہ پا
بانوؑ نے دھیان میں علی اکبرؑ سے یہ کہا

بیٹا کہاں ہو تم! یہ غضب کا مقام ہے
واری تمہارے کنبہ پہ بلوائے عام ہے

انبوہ خاص و عام تھا خیمے کے درمیاں
لیتا تھا کوئی مسندِ پیغمبرؐ زماں
عابدؑ کا فرش کھینچتا تھا کوئی بدگماں
اک چھینتا تھا بالی سکینہؑ کی بالیاں

بنتِ حسینؑ بالوں سے چہرہ چھپاتی تھی
کانوں پہ دونوں ہاتھ دھرے تھر تھراتی تھی"

ابھی یہ حشر برپا تھا کہ ناگہاں آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ ظالموں نے خیمہ میں آگ لگا دی تھی اور بچے گھبرا گھبرا کر اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ راوی کہتا ہے کہ ان ہی بچوں میں اُس نے دیکھا کہ ایک بچی کے کرتے میں آگ لگی ہوئی ہے اور وہ میدان میں بھاگتی چلی جا رہی ہے۔ اُسکے دونوں کانوں سے خون بہہ رہا ہے اور وہ اپنے مقتول باپ، چچا اور بھائیوں کو بلک بلک کر پکار رہی ہے مگر کوئی نہیں جو اسکی فریاد کو پہنچے۔

عزادارو! جب خیام جل کر خاکستر ہو چکے تو جنابِ زینبؑ و اُمِ کلثومؑ نے بچوں کو یکجا کرنا چاہا مگر اُن میں ایک بچی کا پتہ نہ تھا اور سیدۂ عالمین کی بیٹیاں اُس کو تلاش کرتی پھر رہی تھیں کہ حضرت زینبؑ کو مقتل کی جانب سے آتا ہوا ایک شخص نظر آیا۔ چاہا کہ اُس سے پوچھیں مگر نامحرم کے سامنے لب نہ ہل سکے۔ بالآخر بمشکل تمام اُس سے دریافت کیا کہ کیا تم نے کسی بچی کو تو اُدھر جاتے نہیں دیکھا ہے۔ اُس نے کہا ہاں۔ ایک لڑکی مقتل کی طرف جا رہی تھی۔ آپ اُس سمت بڑھیں تو جنابِ سکینہؑ کی آواز آ رہی تھی "بابا آپ بولتے کیوں نہیں؟ بابا آپ نے جو گوشوارے مجھے پہنائے تھے وہ ظالموں نے چھین لئے۔ میرے کان بھی زخمی ہو گئے۔ سارا کُرتہ خُون سے بھر گیا ہے۔ بابا جان! اماں اور پھوپھی کے سروں سے ظالموں نے چادریں بھی چھین لیں۔ بابا آپ بولتے کیوں نہیں؟ اپنی پیاری سکینہ کو جواب کیوں نہیں دیتے ہے بابا! بابا!"۔ بی بی زینبؑ جب لاشِ مطہر کے قریب پہنچیں تو دیکھا کہ جناب سکینہؑ لاشہ سے لپٹی ہوئی فریاد کر رہی ہیں۔ حضرت زینبؑ نے تسلیاں اور دلاسے دے کر بچی کو اُٹھایا اور پوچھا کہ بیٹی تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ تمہارے بابا کا لاشہ ہے۔ جناب سکینہؑ نے عرض کی کہ پھوپھی جان جب ظالموں نے میرے کان چیر کر میرے بُندے چھین لئے تو میں درد کے مارے رونے لگی۔ اس پہ

اُن ظالموں نے میرے رُخساروں پر طمانچے مارے تو میں فریاد کرتی ہوئی، بابا بابا پکارتی، روتی پھر رہی تھی۔ میں نے روتے روتے کہا کہ میرے اچھے بابا اگر میں آپ کو پیاری ہوں تو مجھے اپنے پاس بُلا لو! تو پھوپھی اماں اس لاشے سے آواز آئی "الیَّ الیَّ یا بنیا" میری بیٹی میرے پاس آؤ۔ میں بھاگ کر لپٹ گئی۔ پھوپی اماں! اُس وقت سے فریاد کر رہی ہوں مگر بابا اب کچھ نہیں بولتے۔

بی بی سکینہ! ہم عزادار آپ کے بابا کے اُس لاشہ بے سر پر سلام بھیجتے ہیں جس کا پاس تک لوٹ لیا گیا اور جو خاک و خون میں غلطاں تھا۔

"السلام علیٰ مسلوب الردا۔ والسلام علیٰ مرمّلن الدّماء"

تیسری مجلس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۰ الحمد للہ الذی خلق السمٰوٰت والارض وھو منزل البرکات وسامع الاصوات غافر الخطئیات ۰ والصلوٰۃ والسلام علیٰ حبیبہ افضل المخلوقات محمد المصطفیٰ وآلہ الطیبین یصلون علیھم ملائکتہ السمٰوات ۰ اما بعد فقد قال اللہ تبارک وتعالیٰ فی کتابہ المجید وفرقانہ الحمید وقولہ الحق ۰ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۰ یاایہا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین ۰

(ظاہری مفہوم اس آیۂ وافی ہدایہ کا یہ ہے کہ جناب باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔)

صدق اور صادقین کے متعلق پہلی مجالس میں جو بیان ہو چکا ہے اس کا لُبِ لباب یہ ہے:۔

(۱) حقیقت کے مطابق اظہار کرنا بشرطیکہ احقاقِ حق کے لئے ہو صدق ہے، بدنیتی سے ہو تو جھوٹ۔

(۲) خلافِ حقیقت بیان جبکہ ہدایتِ خلق کی ضرورت کے لئے کیا جائے وہ جھوٹ نہیں ہے بلکہ مکر و تقیہ کہلاتا ہے۔ نفسِ انسان پر گہرے نقوش بٹھانے کیلئے قوانینِ فطرت کی رُو سے ہنگاموں کی ضرورت ہوتی ہے جو حقیقت نہیں ہوتے۔ موسیٰؑ و خضرؑ کی ملاقات بھی ایک اَمر کا ہمارے نفوس پر گہرا نقش بٹھانے کے لئے ایک ہنگامہ ہے۔ ہر صاحبِ ایمان و معرفت پر تقیہ واجب ہے کہ

نا اہلوں پر حقائق کا اظہار نہ کریں۔ جتنے مراتب ایمان و معرفت بلند ہوتے جاتے ہیں اُتنی ہی منزلِ تقیہ بلند ہوتی جاتی ہے حتیٰ کہ ہادیانِ دین کی ولادت سے وفات تک تمام زندگی تقیہ ہی تقیہ ہے۔ مثلاً وہ اپنے کو مجبور و لاچار ظاہر کر کے مظلومیت کی زندگی ہدایتِ خلق کے لیے اختیار کرتے ہیں درآنحالیکہ وہ ہر شے پر قادر ہیں۔ غرضیکہ ہم صادق اُسی کو کہہ سکتے ہیں جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو۔

اب لازم ہو گیا کہ صادقین کی تلاش کریں۔ مگر یہ امر تو قریب قریب محال ہے۔ کہاں تلاش کریں اور کیسے تلاش کریں۔ بہرحال اتنا تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جناب باری تعالیٰ عزّ اسمہ جس کو صادق کا لقب عطا فرمائے گا وہ وہی ہو سکتا ہے جس کی زبان ولادت سے وفات تک کبھی جھوٹ سے ملوث نہ ہوئی ہو اور وہ معصوم ہی ہو سکتا ہے۔ کوئی غیر معصوم ایسا ہو سکے ممکن ہی نہیں۔ اب اس مشکل امر کی تلاش میں ایک صورت تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ کتبِ تواریخ اور سوانح کا مطالعہ کریں۔ جتنے بزرگانِ دین گزرے ہیں۔ اُن سب کی سوانح عمری دیکھ جائیں پھر بھی یہ شک باقی رہتا ہے کہ سوانح عمری لکھنے والے کو ضروری نہیں کہ تمام عمر کے سب حالات و جملہ اعمال و اقوال پر عبور حاصل تھا۔ لہٰذا اس صورت میں بھی کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ اب تو صرف ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ قرآن سے ہی پوچھیں کہ جن صادقین کے ساتھ ہونے کا حکم دیا ہے وہ کون ہیں۔ قرآن نے ایک تو حضرت ابراہیمؑ کو صدیقاً نبیاً کا خطاب عطا کیا ہے اور حضرت اسمٰعیلؑ کو بھی صادق کا لقب دیا ہے۔ اِن الفاظ سے ہمارے اس خیال کی پوری پوری تصدیق ہو گئی کہ جناب باری تعالیٰ عزّ اسمہٗ کی بارگاہ سے صادق کا لقب سوائے معصوم کے کسی غیر معصوم کو نہیں مل سکتا۔

غرضیکہ یہ امر تو اب واضح ہو گیا کہ جناب باری تعالیٰ عزّ اسمہٗ ایمان لانے والوں کو حکم دیتا ہے کہ معصومین کے یعنی انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہو جاؤ۔ مگر ہم انبیاء کے

ساتھ کیسے ہو سکتے ہیں؟ انبیاء اب ہیں کہاں؟ وہ تو جوارِ رحمت میں پہنچ چکے ہیں تو پھر کس کے ساتھ ہو جائیں۔ یہ وسوسہ اس سبب سے پیدا ہوتا ہے کہ ہم الفاظِ قرآنی کے مفاہیم نہیں سمجھتے۔ ساتھ ہونے کا مفہوم بھی قرآنِ کریم ہی سے دریافت کرنا لازم ہے۔

چنانچہ ربّ العزت ارشاد فرماتا ہے۔ ومن یطع اللہ ورسولہ فاولئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیّین والصدیقین والشہداء والصالحین ۔ (اور وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں وہ اُن لوگوں کے ساتھ ہو جائیں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے۔ نبیوں میں سے، صدیقوں میں سے اور شہداء اور صالحین میں سے)۔

اس آیۂ وافی ہدایہ سے صاف واضح ہو گیا کہ "کونوا مع الصادقین" یعنی سچوں کے ساتھ ہو جاؤ سے احکامِ خدا اور رسول کی اطاعت مراد ہے اس کے لئے حکم دیا گیا ہے کہ دن کی پانچ نماز فریضہ میں دس مرتبہ صدقِ دل سے دعا کریں۔

اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیہم " (اے رب ہمارے ہم کو بھی سیدھا راستہ دکھا اور اس پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔ اُن لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا ہے)۔ دونوں آیات کو سامنے رکھ کر صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اھدنا الصراط المستقیم کہہ کر ہم جناب باری تعالیٰ سے معصومین کی پیروی کی کی توفیق ہی طلب کرتے ہیں۔

جناب باری تعالیٰ عزّ اسمہٗ اپنے کرم سے ہماری دعائیں قبول فرمائے اور ہم کو معصومین کے احکام کی پیروی اور اُن کی زندگی کی نقل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین ثم آمین!

اس امر کی وضاحت ایک اور آیۂ شریفہ میں بھی کی گئی ہے " قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ " (اے رسولؐ لوگوں سے کہدو کہ اگر تم اللہ سے

محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ یعنی میں جس طرح دُنیا میں عمل کرتا ہوں اُسی کی نقل کرو، تو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا، تم اللہ کے محبوب ہو جاؤ گے)۔ اللہ اکبر اُس محبوب الہٰی کی منزلت کون سمجھ سکتا ہے جس کی پیروی کرنے والے خدا کے محبوب بن جائیں۔ صلوٰۃ۔ اللھم صلی علی محمد و آل محمد!

اگر محبت و متابعت کی تفصیل بیان کی جائے تو اصل مقصد سے بُعد ہو جائیگا۔ اس وقت تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ آیا صادقین جن کے ساتھ ہونے کا حکم دیا جا رہا ہے محض انبیاء علیہم السلام ہی ہیں یا انبیاء کے علاوہ کچھ اور مقدس ہستیاں بھی ہیں جن کو جناب ربّ العزت نے صادقین کا خطاب عطا فرمایا ہے۔ آئیے قرآن کریم ہی سے دریافت کریں۔ قرآن کا یہ معجزہ ہے کہ وہ کسی کا نام تو نہیں بتلاتا مگر ایسی صفات بیان کر دیتا ہے جس سے خدا کے ممدوح کو اس طرح دیکھا جا سکے جیسے کہ دن میں آفتاب کو دیکھتے ہیں۔

سورۃ بقر رکوع ۲۱۔ پارہ سیقول آیت ۱۷۷ میں اوصاف و محاسن کی فہرست بیان کی گئی ہے اور یہ بتلایا گیا ہے کہ جن اشخاص میں یہ محاسن و محامد جمع ہوں وہ ہی صادقین ہیں اور وہی متقین ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے "لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر والملٰئکۃ والکتٰب والنبیین ج واٰتی المال علٰی حبہ ذوی القربٰی والیتٰمٰی والمسٰکین وابن السبیل والسآئلین وفی الرقاب ج واقام الصلوٰۃ واٰتی الزکوٰۃ ج والموفون بعھدھم اذا عاھدوا ج والصٰبرین فی البأسآء والضرآء وحین البأس ط اولٰئک الذین صدقوا ط واولٰئک ھم المتقون ○ (یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم اپنے مونہہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لو۔ بلکہ حقیقی نیکی وہ ہے (یا اُسی کی ہے) جو ایمان لائے اللہ پر اور یوم

قیامت پر، ملائکہ پر، کتاب پر اور نبیوں پر۔ اور مال دے اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو یتیموں کو مسکینوں اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور غلاموں کو آزاد کرانے میں۔ اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور پورا کرنے والے اپنے عہدوں کے جبکہ عہد کر لیں۔ اور صبر کرنے والے تنگی میں، بیماری و پریشانی میں اور لڑائی کی سختی میں۔ وہی لوگ ہیں جو صادقین ہیں اور وہی ہیں جو متقین ہیں۔

ممکن ہے کوئی شخص یہ کہے کہ صادقین تو کتنی جگہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے۔ دیکھیں سورۂ حجرات آیت ۱۵ میں ارشاد ہے "انما المومنون الذین ...... تا ..... اولئک هم الصّادقون" پھر سورۂ حشر کی آیت ۔ ۸ میں یہ آیت موجود ہے۔ "للفقرآء المهاجرین ..... تا ..... اولئک هم الصّادقون"۔ درست ہے کہ ان ہر دو آیات میں "صادقون" موجود ہے مگر ان سے کسی خاص ذات یا اشخاص کی طرف اشارہ نہیں ملتا۔ دوسرا امر یہ ہے کہ آیۂ زیرِ بحث کونوا مع الصّادقین میں پہلا حکم ہے کہ تقویٰ اختیار کرو۔ اس کے بعد ہے کہ صادقین کے ساتھ ہو جاؤ۔ لہٰذا یہ لازمی امر ہے کہ جن صادقین کے ساتھ ہونے کا حکم دیا جا رہا ہے وہ متقین کے بھی پیشوا ہونے کے اہل ہوں۔ اب ہمیں کلام اللہ میں ایسی آیت تلاش کرنی چاہیئے جس میں صدق اور تقویٰ ہر دو صفات یکجا بیان کی گئی ہوں اور ایسی آیت کلام اللہ میں سوائے سورۂ بقر کی اس آیت کے "لیس البر ان تولوا وجوهکم ..... تا آخر" کوئی اور نہیں ہے۔ اب ہم پر لازم ہو گیا کہ جو صفات اس آیت میں بیان کی گئی ہیں ان صفات سے متّصف اشخاص کی تلاش کریں۔

عجیب بات جو نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ آیت میں کہا جا رہا ہے کہ مشرق یا مغرب کو مونہہ پھیر لینا جیسا کہ یہود و نصاریٰ عبادت کے وقت کرتے ہیں نیکی نہیں ہے بلکہ نیکی وہ ذات یا ذوات ہیں جن کی صفات آگے بیان کی گئی ہیں۔

آیت ان کو نیک ہی قرار نہیں دیتی بلکہ مجسّم نیکی قرار دیتی ہے۔ لہٰذا جو نیکی کے ساتھ ہوں گے وہ نیک کہلائیں گے۔ پہلی صفت اس آیۂ وافی ہدایہ میں اٰمنّا باللّٰہ ہے۔ اب اگر ہم قرآن میں دیکھیں تو ایمان لانے والوں کی کیفیات جو بیان کی گئی ہیں ان میں بہت زیادہ تعداد ایسی ہے جن کی مذمّت وارد ہے مثلاً ایک گروہ تو ایسا ہے جس کے لئے کہا گیا ہے " ومن النّاس من یّقول اٰمنّا باللّٰہ و بالیوم الاٰخر وماھم بموٴمنین" (اور لوگوں میں سے ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ اور یوم آخر پر حالانکہ وہ موٴمن نہیں ہیں۔ سورۂ بقر۔ آیت ۸)

ان کی یہ صفات بیان کی جارہی ہیں کہ وہ اللہ اور موٴمنوں کو دھوکہ دیتے ہیں حالانکہ وہ اپنے نفسوں کو ہی دھوکہ دے رہے ہیں اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ اور جب کہا جاتا ہے جیسے اور لوگ ایمان لائے ہیں ایسے ہی سیدھی سادی طرح تم بھی ایمان لاؤ تو کہتے ہیں کہ کیا ہم بھی ان احمقوں کی طرح سے ایمان لے آئیں حالانکہ وہ خود ہی احمق ہیں۔ اور جب وہ موٴمنین سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اور جب اپنے شیاطین کی طرف خلوت میں جاتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو تمہارے ہی ساتھ ہیں۔ یہ ایمان لانے کا دعویٰ کرکے اِن لوگوں سے ٹھٹھا کرتے ہیں یعنی ہنسی اُڑاتے ہیں، تو اللہ بھی اُن سے ٹھٹھا کرتا ہے اور اُن کو اُن کی گمراہی میں پڑا ہوا چھوڑ دیتا ہے۔

اس آیت میں جن لوگوں کا ذکر ہے وہ اہلِ عرب ہی ہیں، یہودی یا نصرانی نہیں۔ ایسے ہی دھوکہ باز اور فریبی یہودیوں میں بھی بکثرت موجود تھے جن کا ذکر سورہ بقرہ آیت ۷۵ میں کیا گیا ہے۔ ارشاد باری ہے:۔

افتطمعون ان یوٴمنوا لکم وقد کان فریق منھم یسمعون کلام اللّٰہ ثمّ یحرّفونہ من بعد ما عقلوہ وھم یعلمون ہ (کیا تم

اس کی طمع کرتے ہو کہ وہ تمہارے لئے ایمان لے آئیں۔ حالانکہ ایک گروہ اُن میں کا ایسا ہے کہ اللہ کا کلام سُنتے ہیں پھر سمجھ لینے کے بعد جانتے ہوئے اُس میں تحریف کرتے ہیں،۔ اس گروہ کے بارے میں جو ارشاد باری ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ یہود کا ایک گروہ ہے جو تخریبِ اسلام کے لئے مُسلمان ہوا ہے۔ انکی حالت یہ بیان کی گئی ہے کہ جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اور جب اُنہیں کے بعض، بعض کے ساتھ خلوت میں جاتے ہیں تو تحریف کرتے ہیں۔ یہودیوں کا یہی وہ گروہ ہے جس نے بے شمار خلافِ عقل و فطرت باتیں مسلمان علماء کو پہنچائیں (تاریخیں اس پر گواہ ہیں کہ ان میں پیش پیش کعب الاحبار ہے) اور وہ تصانیف علم دین میں داخل ہو گئیں۔ اور باوجودیکہ ان کا فطرت کے خلاف اور حماقت پر مبنی ہو جانا ثابت ہو چکا ہے پھر بھی یہ علم دین میں آجتک شامل ہیں جن پر اکثر علماء آج بھی ایمان رکھتے ہیں۔

بعض ایمان لانے والوں کی یہ تعریف کی جارہی ہے کہ باوجود اس کے کہ اُن کو کانا پھوسی سے منع کر دیا گیا ہے مگر وہ اس سے باز نہیں آتے اور گناہ و سرکشی اور توہینِ رسولؐ کے متعلق کانا پھوسی کرتے رہتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ہماری باتوں پر اللہ عذاب کیوں نہیں کرتا۔ تو جب اُن سے خطاب کیا جاتا ہے تو "یا ایها الذین اٰمنوا" ہی کہا جاتا ہے۔ دیکھیں سورہ مجادلہ۔ کہا جارہا ہے "اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم کانا پھوسی کرو تو گناہ و سرکشی اور رسولؐ کی توہین کے متعلق بات نہ کیا کرو"۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ ایسے بد باطنوں سے "اے منافقو!" خطاب کیا جاتا مگر لا الٰہ الا اللہ ،، کہہ لینے کی وجہ سے ان کو بھی "اے ایمان لانے والو" ہی سے خطاب کیا جاتا ہے۔ اب تو کچھ مایوسی سی ہوئی جاتی ہے کہ آخر اُن ایمان والوں کو کہاں تلاش کریں جو متقی اور صادق ہیں تو پہلے ایمان کی تعریف ہی دیکھ لیں۔ ارشادِ باری ہے "والذین اٰمنوا اشد حبا للّٰه" اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اللہ کی محبت

میں بڑے شدید ہیں۔ اب حُبِّ شدید کی علامت بچے سے پوچھ لیں۔ بچہ جس سے ہلا ہُوا ہو اور وہ چھوٹ جائے تو اُس کی نگاہیں اُس کو تلاش کرتی ہیں اور اگر بچے کے سامنے اُس شخص کا نام لیا جائے تو اُس کے دل کی حرکت تیز ہو جاتی ہے۔ حُبِّ شدید کی یہی علامت قرآن بتلاتا ہے جیسا کہ ارشادِ باری ہے: "انما المومنون الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم" (سوائے اُن کے کوئی مومن ہے ہی نہیں کہ جب اُن کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو اُن کے دِل لرزنے لگیں) مگر مشکل یہ ہے کہ دِل کا حال تو خدا ہی جانتا ہے۔ ہمیں تو اِس سے کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔

اگر ہمیں طلبِ صادق ہوگی تو ایسی آیات بھی مل جائیں گی جن سے مطلب حل ہو جائے۔ چنانچہ دیکھیں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۵ "امن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمومنون ط کل اٰمن باللہ وملئکتہ وکتبہ ورسلہ لا نفرق بین احد من رسلہ قف" (ایمان لایا رسول اُس پر جو نازل کیا گیا اُس پر اُس کے رب کی طرف سے اور کچھ مومن بھی۔ سب کے سب ایمان لے آئے اللہ پر، اُس کے ملائکہ پر، اُس کی کتابوں پر، اُس کے رسولوں پر۔ ہم اُس کے رسولوں میں سے کسی ایک کے لئے بھی فرق نہیں کرتے (یعنی یہ سب معصوم ہیں)۔ اس آیت میں البتہ ایسے ایمان والوں کا ذکر ہے جو رسولؐ کے ساتھ ایمان لائے یا یہ کہیے کہ رسولؐ کے ساتھ ایمان میں شریک ہیں۔ اب اور آیات تلاش کرنے کی ضرورت پیش آگئی۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے "لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم۔ الخ (البتہ اللہ نے بڑا احسان کیا مومنین پر کہ اُن ہی کے نفسوں میں سے ایک کو رسولؐ بنا دیا)۔ یہاں صاف ظاہر ہے کہ مومنین بعثت کے وقت موجود تھے جن کی تعداد کم از کم تین ہونی چاہیئے ورنہ جمع کا اطلاق نہ ہوگا۔ عامتہ الناس اس سے یہ مُراد لیتے ہیں کہ بعثتِ رسولؐ کے بعد جو لوگ

ایمان لائے اور مومن ہوئے اُن پر احسان کیا مگر یہ تو بالکل خلافِ عقل ہے اس لئے کہ آیت تو کہہ رہی ہے کہ اُن ہی کے نفسوں میں سے ایک کو رسول بنایا تو بعد بعثت ایمان لانے والوں میں رسُول کیسے شریک ہوسکتے ہیں؟ لہٰذا یہ تخیل وسوسۂ شیطانی ہے۔ قرآن پر ایمان لانے والا تو اس میں ہرگز شک نہیں کرسکتا کہ وقتِ بعثت وہ مومن موجود تھے جو ایمان میں رسُول کے ساتھ شریک تھے جن کا ذکر اس سے پہلی آیت یعنی "امن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمومنون" میں ہوچکا ہے اچھا اب اور تلاش کریں۔ سورۂ بلد میں ۱ تا ۳ آیات دیکھیں۔ ارشادِ باری ہے: "لا اقسم بھٰذا لبلد ۵ و انت حل بھٰذا البلد ۵ ووالد وما ولد ۵" (میں قسم کھاتا ہوں اُس شہر کی درآنحالیکہ تو اس شہر میں موجود ہے اور ایک باپ اور بیٹے)۔ اب غور کریں کہ وہ باپ اور بیٹے کون ہوسکتے ہیں جنکی وجہ سے شہر کی یہ عظمت ہے کہ جناب ربِّ اکبر اس شہر کی قسم کھاتا ہے تو معلوم ہوگا کہ وہ رسالت کے محافظ جناب ابو طالبؑ اور اُن کے صاحبزادوں کو سوا کوئی نہیں ہوسکتا جس کا ثبوت شعب ابو طالب کے واقعہ سے ملتا ہے۔ چنانچہ منقول ہے کہ جب بعثت میں رؤساء قریش کا ایک وفد جناب ابو طالبؑ کے پاس آیا اور شکایت کی کہ تمہارا بھتیجہ ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد کو گمراہ کہتا ہے اور ہمکو احمق ٹھہراتا ہے۔ اس لئے یا تم بیچ میں سے ہٹ جاؤ یا تم بھی میدان میں آؤ کہ ہم دونوں میں سے ایک کا فیصلہ ہوجائے۔ جناب ابو طالبؑ نے دیکھا کہ اب معاملہ نازک ہوگیا ہے اور قریش تحمل نہیں کرسکتے اور میں تنہا قریش کا مقابلہ نہیں کرسکتا تو جناب ابو طالبؑ نے آنحضرتؐ سے مختصر لفظوں میں کہا "جانِ عم! میرے اُوپر اتنا بار نہ ڈال کہ میں اُٹھا نہ سکوں"۔ آنحضرتؐ نے فرمایا "خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لاکر دیدیں تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا۔ خدایا اس کام کو پورا کرے گا یا خود میں اس پر نثار ہوجاؤنگا"۔

آپ کی پُر اثر آواز سے متاثر ہو کر جناب ابو طالبؑ نے کہا جا کوئی شخص تیرا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ قریش جناب ابو طالبؑ کے جواب سے سخت مایوس ہوئے۔ چنانچہ تمام قبائل نے متفقہ طور پر ایک معاہدہ مرتب کیا جس کی رُو سے بنی ہاشم کے ساتھ مکمل مقاطعہ طے پایا۔ ان شرائط میں درج تھا کہ کوئی شخص بنی ہاشم سے نہ قرابت کرے گا، نہ اُن کے ہاتھ خرید و فروخت کرے گا، نہ اُن سے ملے گا اور نہ ہی اُن کے پاس کھانے پینے کا سامان جانے دے گا جب تک کہ وہ محمدؐ کو قتل کے لئے اُن کے حوالے نہ کر دیں۔ یہ معاہدہ منصور بن عکرمہ نے لکھا اور در کعبہ پر آویزاں کر دیا۔

جناب ابو طالبؑ مجبور ہو کر تمام خاندان بنی ہاشم کے ساتھ شعب ابو طالبؑ میں جو پہاڑ کا درہ تھا اور اُن کا موروثی تھا، پناہ گزیں ہو گئے۔ ۷ بعثت سے لیکر ۱۰ بعثت تک تین سال بنو ہاشم نے اس حصار میں بسر کئے۔ یہ زمانہ ایسا سخت گزرا کہ درختوں کے پتے کھا کر گزارا کرتے تھے۔ بچے جب بھوک سے روتے تھے تو قریش سُن کر خوش ہوتے تھے۔

سال میں دو مرتبہ، رجب اور ذی الحجہ، میں بنو ہاشم شعب سے باہر آتے اور خرید و فروخت کر کے پھر شعب میں چلے جاتے تھے۔ اس قید نے بنو ہاشم پر بڑی مصیبت ڈالی۔ جسمانی اور روحانی اذیتوں کے علاوہ کھانے پینے کی تنگی نے اور پریشان کر رکھا تھا۔ ناطے رشتے والے جو مخفی طور پر کوئی چیز بھیجتے اور کفار کو خبر ہو جاتی تو انکو ذلیل اور رُسوا کیا جاتا۔ لیکن جناب ابو طالبؑ کو ان تمام مصیبتوں سے زیادہ آنحضرتؐ کی حفاظت کی فکر دامنگیر تھی۔ چنانچہ آپؑ نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ ہر شب حضرت رسولؐ خدا فرماتے کہ میرے پاس میرے ہی فرش پر سو رہو۔ پھر جب سب لوگ سو جاتے تو آپؑ آنحضرتؐ کو اس جگہ سے ہٹا دیتے اور اپنے بیٹوں میں سے کسی کو جگہ دیتے کہ رسولؐ خدا کی جگہ سو جائے۔ تاکہ اگر کوئی دشمن اس جگہ کو یاد رکھ کر حملہ کر دے تو حضرتؐ

رسولؐ خدا کو وہاں نہ پائے۔ اس طرح آنحضرتؐ بچ جائیں اور اُن کی جگہ آپ کا کوئی فرزند قتل ہو جائے۔ اسی صورت سے آپ ہر روز اپنے بیٹوں کو آنحضرتؐ پر فدا کرتے رہتے تھے۔

اس شعب سے باہر نکلنے کا بھی ایک عجیب و غریب واقعہ ہے۔ جب تقریباً تین برس گزر گئے تو ایک روز آنحضرتؐ نے جناب ابوطالبؑ سے فرمایا۔ اے چچا! مجھے یہ وحی نازل ہوئی ہے کہ عہدنامہ قریش کو کیڑوں نے کھالیا ہے اور اُن میں سے صرف وہ ٹکڑا باقی ہے جس پر خدا کا نام لکھا ہوا ہے۔ یہ سنتے ہی جناب ابوطالبؑ شعب سے باہر نکل کر قریش کے پاس گئے اور کہا کہ جو عہدنامہ تم نے لکھا تھا اُسے کیڑا کھا گیا ہے اور خدا کے نام کے سوا اُس میں کوئی مضمون باقی نہیں رہا۔ محمدؐ نے مجھ سے ایسا ہی بیان کیا ہے اب تم اُس کاغذ کو لا کر دیکھو۔ اگر میرے بھتیجے کی خبر صحیح ہو تو جان لو کہ تم سب ہم لوگوں پر ظلم اور قطع رحم کر رہے ہو اور اگر یہ خبر جھوٹ نکلے تو ہم سب جان جائیں گے کہ تم لوگ حق پر ہو۔ یہ سنتے ہی سب کھڑے ہو گئے اور اُس عہدنامہ کو اتار لائے دیکھا تو معلوم ہوا کہ رسولؐ خدا نے جو فرمایا تھا وہ بالکل درست تھا۔ اس پر جناب ابوطالبؑ نے فرمایا "اب تو تم لوگوں پر اچھی طرح واضح ہو گیا کہ اس معاملہ میں تم ہی ظلم و ستم اور قطع رحم کا ارتکاب کر رہے ہو"۔ یہ سن کر سب مخالفین نے اپنے سر جھکا لئے اور عہدنامہ کو توڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ یہ ہیں وہ صاحبانِ ایمان باپ اور بیٹے جو خدا کے محبوب پر ہر وقت قربان ہونے اور اُس کے لئے ہر طرح کی قربانیاں دینے کے لئے تیار رہتے تھے۔ ان کے ایمان کی یہ منزلت ہے کہ جناب ربّ اکبر اُس شہر کی قسم کھا رہا ہے جس میں یہ قیام پذیر ہیں یعنی لا اقسم بھٰذا البلد و انت حلّ بھٰذا البلد و والدٍ و ما ولد۔

حضرت ابوطالبؑ کے فرزندوں میں سے ہی ایسے ہو سکتے ہیں جن کے ایمان کی اُن نے شہادت دی ہے۔ لیجیے سورۂ توبہ کی آیت اور تفسیر دیکھ لیں۔ ارشادِ

باری ہے اجعلتم سقایۃ الحاج وعمارۃ المسجد الحرام کمن اٰمن باللہ والیوم الاخر وجاھد فی سبیل اللہ ط لا یستوٗن عند اللہ ط واللہ لا یھدی القوم الظّٰلمین ۝" (کیا تم نے حاجیوں کا پانی پلانا اور مسجد الحرام کا آباد رکھنا اُس شخص کے برابر کر دیا جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لایا اور جس نے راہِ خدا میں جہاد کیا۔ اللہ کے نزدیک تو یہ سب برابر نہیں اور اللہ ظالموں کی رہبری نہیں فرماتا)۔ (سورۃ توبہ آیت ۱۹)

تو واقعہ یہ ہے کہ جناب عبّاس وطلحہ اور امیر المومنینؑ خانہ کعبہ کے آگے کھڑے ہوئے ہیں۔ جناب عبّاس کہتے ہیں کہ ہم حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں، ہمارے برابر کون ہو سکتا ہے۔ طلحہ کہتے ہیں کہ خانہ کعبہ کی چابی میرے پاس ہے، میرے برابر کون ہو سکتا ہے۔ اور مولائے مومنین فرماتے ہیں کہ "میں تو اللہ اور یوم آخر پر ایمان لایا اور راہِ خدا میں جہاد کیا۔ اور کیا میں ہی وہ نہیں ہوں جس نے تمہاری گردنوں کو اسلام کے آگے جھکا دیا!" — اب تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ بلا واسطہ ایمان لانے والے ائمہ طاہرین ہی ہیں۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ اُمّتِ محمدیہ میں کامل الایمان اشخاص کی تلاش کریں تو وہ سوائے کربلا کے اور کہیں نہیں ملیں گے۔ یہ وہ کامل الایمان افراد ہیں جنھوں نے اس نور کا بار بے حجاب اُٹھایا جس کو موسیٰؑ اور کوہِ طور برداشت نہ کر سکے بلکہ وہ پہاڑ جل کر خاکستر ہو گیا۔ ان کے ایمان پر معصوم کی شہادت موجود ہے۔ حضرت امام حسینؑ ان کی توصیف میں فرماتے ہیں "انی لا اعلم اصحابا اوفیٰ ولا ابر من اصحابی،" (میں دُنیا میں کسی کے اصحاب کو نہیں جانتا جو میرے اصحاب سے زیادہ وفادار اور نیکوکار ہوں) چنانچہ کتبِ مقاتل میں منقول ہے کہ نہم محرّم کی شام کو فوجِ یزید خیامِ اہلِ حرم کی جانب بڑھی۔ امامِ مظلوم نے جناب عبّاس علمدارؑ کو حکم دیا کہ اے بھائی تم جاؤ اور ان لوگوں سے اس پیش قدمی کا سبب دریافت کرو۔ جناب عباسؑ لشکرِ بد کردار

کی طرف بڑھے تو عمر سعد ملعون آگے آگے تھا۔ حضرت نے اُس سے پیش قدمی کی وجہ پوچھی تو وہ ملعون گویا ہوا کہ اگر فرزندِ رسولؐ کو بیعتِ یزید منظور ہے تو خیر ورنہ ہم جنگ کے لیے تیار ہو کر آئے ہیں۔ حضرت نے فرمایا تم لوگ یہیں ٹھہرو۔ میں امامؑ کی خدمت میں جاتا ہوں اور جو کچھ حکم ملے گا وہ تم تک پہنچاؤں گا۔ حضرت عباسؑ خدمتِ امامِ عالی مُقام میں حاضر ہوئے اور اُن کی گفتار کا مفہوم بہ عنوانِ شائستہ عرض کیا۔ امامِ مظلوم نے فرمایا کہ اے بھائی ایک مرتبہ اور جا کر اُن اشرار سے کہو کہ اگر وہ لڑائی کے لئے تیار ہو کر آئے ہیں تو ہمیں ایک شب کی مہلت دیں اور لڑائی کل پر موقوف رکھیں۔ حضرت عباسؑ واپس ہوئے اور عمر سعد کے پاس آ کر فرزندِ رسولؐ کا پیغام دہرایا۔ عُمر سعد کہنے لگا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم ابھی اور اسی وقت فیصلہ چاہتے ہیں۔ اس پر چند سردارانِ لشکر نے عمر سے کہا

"کافر تلک تو مہلتِ جنگ و جدال ہے
اے ابن سعد یہ تو پیمبرؐ کا لال ہے"

عمر سعد کو کچھ سرداروں کے انحراف کا خوف پیدا ہوا تو کہنے لگا کہ اچھا کل صبح ہی سے لڑائی شروع ہو گی اور یہ کہہ کر فوج کو اپنی جگہ واپس لے گیا۔ حضرت عباسؑ خدمتِ امامؑ میں پھر حاضر ہوئے اور عرض کی کہ بدقّت تمام مہلتِ شب ملی ہے۔ غرضیکہ بعدِ غروبِ آفتاب جب تاریکئ شب چھا گئی تو امامؑ مظلوم کربلا نے تمام اعزّا اور انصار کو جمع کیا۔ پھر خطبہ ارشاد فرما کر سب کے لئے دُعائے خیر فرمائی اور یُوں گویا ہوئے۔ "یہ تمہاری آخری شب ہے۔ کل تم میں سے کوئی باقی نہ رہے گا۔ لہٰذا آج کی رات ذکر اللہ اور تلاوت میں صرف کرو اور اپنے کپڑوں میں خوشبو لگاؤ کہ وُہی تمہارے کفن ہوں گے۔" اس کے بعد حضرت اپنے خیمہ میں جا کر مصروفِ دُعا و تلاوت ہوئے۔ ایک روایت میں ہے کہ نصف شب کے بعد حضرتؑ نے خیامِ اہلِ بیت کا دورہ کیا۔ جب جنابِ زینبؑ کے

خیمہ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ آپ دونوں فرزندوں کو بٹھائے ہوئے کہہ رہی ہیں کل بازارِ قتال گرم ہوگا۔ سیدۂ عالمین کے فرزند پر سے صدقہ اُتارنے کے لئے سب بی بیاں اپنے اپنے لال یا شوہروں کی قربانیاں پیش کریں گی اور ہر ایک کی کوشش یہی ہوگی کہ جناب سیدہ کی بارگاہ میں سرخروئی حاصل کرنے کے لئے پہل کی جائے۔ مجھے اندیشہ ہے تو صرف یہ کہ تم دوسروں سے پیچھے نہ رہ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ روزِ محشر مجھے اماں جان کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ عون و محمد عرض کر رہے ہیں کہ اماں جان! آپ کسی اندیشہ کو دِل میں جگہ نہ دیں۔ ہم ہر ممکن کوشش کریں گے کہ تمام عزیزوں سے پہلے اپنی جانیں ماموں جان پر قربان کر دیں لیکن ہمیں یہ فکر ہے کہ ماموں جان سے اجازت لینے میں کہیں تاخیر نہ ہو جائے۔ اُن کی اجازت کے بغیر ہم قدم کیسے بڑھا سکتے ہیں۔

جب جنابِ اُمِّ لیلےٰ کے خیمہ میں پہنچے تو دیکھا کہ حضرت علی اکبرؑ کے سرہانے چراغ لئے ہوئے بیٹھی ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ یہ چاند اور سورج کو شرمندہ کرنے والی صورت جو محبوبِ خدا سے مشابہ ہے کل خاک میں مل جائے گی۔ جب رسولؐ اللہ کی یاد آتی تھی تو سب تمہاری زیارت کر لیتے تھے مگر افسوس کہ اب تمام اہلبیتؑ و اہلِ حرم زیارتِ رسولؐ سے محروم ہو جائیں گے اور پھر یہ رشکِ قمر کبھی نظر نہ آئے گا۔ جنابِ علی اکبرؑ کہہ رہے ہیں کہ اماں جان! سب بیبیاں سیدہ کے لال پر قربانیاں پیش کریں گی۔ آپ کو بھی لازم ہے کہ سب سے سبقت لے جانے کی کوشش کریں اور مجھے فرزندِ رسولؐ کے قدموں پر پہلے نثار کر دیں۔

جب والدۂ قاسمؑ جنابِ اُمِّ فروہ کے خیمہ میں آئے تو دیکھا کہ جنابِ قاسمؑ کو بٹھائے ہوئے کہہ رہی ہیں کہ بیٹا! کل سب بیبیاں سیدہؑ کے لال پر کوئی نہ کوئی قربانی نذر کریں گی۔ بیٹا! میرے پاس کوئی جوان فرزند بھی نہیں۔ تمہاری کم سنی سے مجھے خوف آتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ تم میدانِ جنگ میں مرعوب ہو جاؤ۔ اور یہ بھی خیال آتا ہے کہ تمہارے

یہ چچا جان تمہاری کم عمری کا عذر کر کے تمہیں میدان میں جانے کی اجازت نہ دیں حالانکہ تم ہی اس وقت اپنے والدِ ماجد کے نمائندے ہو۔ مگر مجھے اُمید ہے کہ تم کسی سے پیچھے نہ ہو گے تاکہ میں روزِ محشر سیّدہ عالمین کے سامنے شرمندہ ہونے سے محفوظ رہوں۔ جنابِ قاسم عرض کر رہے ہیں کہ اماں جان! آپ متفکر نہ ہوں مشکل صرف چچا جان سے اذن حاصل کرنے میں پیش آئے گی! اجازت ملتے ہی آپ دیکھیں گی کہ فرزندِ رسول کی نصرت میں کس طرح میں دشمنوں کی فوج میں گھس کر اُن کو منتشر کرتا ہوں۔ اُن کو نیزوں سے مارونگا پھر تلوار سے اُن کے ٹکڑے کروں گا اور اُن نابکاروں کے نیزے اور تلواریں اپنے سینہ پر کھاؤں گا۔ اماں جان! آپ یہ بھی دیکھیں گی کہ میری پُشت زخمی نہ ہوگی اور اُس وقت تک لڑتا رہونگا جب تک میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائیں۔

عزادارو! جنابِ قاسم نے جو کچھ کہا تھا وہ پورا کر دکھایا۔ بڑے بڑے نامی پہلوانوں کو داخلِ جہنم کیا جس کی وجہ سے بہت سے دشمنوں نے مل کر یکبارگی حملہ کر کے آپ کو زخمی کر دیا۔ ایک ملعون کے وار سے آپ گھوڑے سے زمین پر تشریف لائے تو پکارا " یاعمّاہ ادرکنی !! " (اے چچا جان میری خبر لیجیے)۔ امامِ مظلومؑ بھتیجے کی آواز سنتے ہی مقتل کی طرف تیزی سے روانہ ہوئے۔ حضرت قاسم کا قاتل سامنے آیا تو حضرت نے اُس پر حملہ کیا۔ اُس ظالم کو بچانے کے لئے بہت سے سوار دوڑ پڑے اور آہ، وہ کمسن مجاہد زندگی میں ہی اپنے چچا کی نظروں کے سامنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے پائمال ہو گیا۔ امامِ مظلوم نے حسرت سے فرمایا "قسم خدا کی تیرے چچا پر یہ امر بہت گراں ہے کہ تو اُس کو مدد کے لئے پکارے اور وہ مدد کو نہ آسکے"!

راوی بیان کرتا ہے کہ حضرت قاسم کی لاش اُٹھانے کے قابل نہ تھی لہذا ایک چادر میں جسم کے ٹکڑوں کو جمع کر کے اُٹھایا گیا۔ حضرت قاسمؑ نے اپنی والدہ سے کیا ہوا عہد پورا کر دیا مگر اُن کے چھوٹے بھائی عبداللہ بن حسنؑ نے تو کوئی وعدہ نہیں کیا تھا،

ہاں! ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے دل ہی دل میں عہد کیا ہو کہ ہم بھی اپنی قربانی پیش کرینگے چنانچہ جب سیدالشہدا مجروح ہو کر زمین پر تشریف لائے تو تمام عورتیں اور بچے درِ خیمہ پر جمع تھے۔ عبداللہ نے ماں سے پوچھا کہ وہ کون ہیں جو اس قدر زخمی ہوئے سامنے زمین پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ماں نے ایک آہ کے ساتھ درد بھری آواز میں جواب دیا "بیٹا! یہ تمہارے چچا جان ہیں" تو وہ بچہ بے قراری کے عالم میں یہ کہتا ہوا مقتل کی طرف بھاگا کہ میں اپنے چچا جان کو ابھی خیمہ میں اٹھا کر لاتا ہوں۔ ہر چند کہ اہلِ حرم اس بچے کو پکڑتے اور روکتے رہے مگر وہ کسی طرح نہ رُکا اور دوڑ کر اپنے چچا کے پاس پہنچا اور لپٹ کر بولا "اے چچا جان! اُٹھئے اور اپنے خیمہ میں چلیے۔ یہاں دشمنوں میں آپ کا ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہے"۔ جناب سیدالشہدا نے دلاسہ دیا اور فرمایا "بیٹا! تم اس وقت ایک نیا داغ دینے کے لئے یہاں کیوں آگئے؟" اتنے میں ایک ملعون تلوار اُٹھائے آیا اور جانِ رسولؐ پر وار کرنا چاہا۔ جونہی اُس ظالم نے آنحضرتؑ پر تلوار چلائی، ابنِ حسنؑ نے اپنے دونوں چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو اپنے چچا کے اُوپر بلند کر دیا۔ تلوار ان نازک ننھے ہاتھوں کو کاٹتی ہوئی امامِ مظلوم پر پڑی اور وہ دو قطع کئے ہوئے ہاتھ بھی آپ کے اوپر آن گرے۔ ساتھ ہی وہ معصوم بچہ بھی آپ کی آغوش میں گر کر تڑپنے لگا۔ تیروں کی بارش تیز ہو گئی اور ایک تیرِ ظلم نے بچے کا خشک گلا چھید دیا۔ عبداللہ ابنِ حسنؑ نے اس طرح ماہیِ بے آب کی مانند اپنے چچا جان کی زخمی گود میں دم توڑ دیا۔

سوگوارانِ حسینِؑ مظلوم! آپ حضرات میں ہر شخص پر واضح ہے کہ یہ قربانیاں جبری اور قہری نہیں بلکہ ہم بدبختوں تک اسلامِ حقیقی پہنچانے کے لئے ہماری خاطر ارادتاً پیش کی گئی ہیں لہٰذا ہم پر بھی لازم ہے کہ اس میدانِ جور و ستم کا تصور سامنے رکھیں گویا اپنی آنکھوں سے ان خونیں و دردانگیز مناظر کو دیکھتے

ہوئے اپنے قلوب کو متوجہ کریں۔ تو آئیے ایک بار پھر اس خزاں رسیدہ چمنِ زہراؑ کی بن کھلی اور بے وقت اپنے ہی خون میں ڈوب کر مرجھا جانے والی کلی پر خونِ جگر میں بھیگے ہوئے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کریں۔

حسینیو! کہو رو کر کہ اے دلا سُن تو! ترے امام کے بچوں نے کیا کیا سُن تو!
پہاڑ ظلم کا سر پہ اُٹھا لیا۔ سُن تو! ہمارے واسطے خود کو مٹا دیا سُن تو!
غضب ہے دیکھ! ارے تُو تو چین بیٹھا ہے
وہ تپتی ریت پہ زخمی حسینؑ بیٹھا ہے

ترے امام پہ تیغوں کا اَبر ہے چھایا قریں حسینؑ کے ابنِ بتولؑ کا جایا
حسنؑ کا لال، وہ دس گیارہ سال کا آیا نہ پیچھے ہی لئے ہے، نہ ہے سپر لایا
نہ حرب و ضرب کا ساماں ہی ساتھ لایا ہے
فقط حسینؑ کی اُلفت میں دوڑا آیا ہے

وہ کہہ رہا ہے، چچا! تم پہ میں فدا صدقے! ذرا سی دیر میں کیا حال ہو گیا کہئے!
ہر ایک خون کا پیاسا ہے آپ کے اُٹھیے قسم ہے سَر کی مرے، اب خیام کو چلیے
کہیں کچھ اور مصیبت نہ سر پہ آجائے
کوئی لعین نہ تیغِ ستم لگا جائے

کبھی تو غیظ میں آ آ کے جھومتا ہے وہ کبھی حسینؑ کے زخموں کو چومتا ہے وہ
بہ چچا کے گرد محبت سے گھومتا ہے وہ لگا کے آنکھوں سے قدموں کو چومتا ہے وہ
اُسے ہے فکر کہ زخموں کا کیا علاج کرے
مددِ حسینؑ کی کس طرح سے وہ آج کرے

کہ آیا تیغ لئے ایک ظالم غدّار وہ چاہتا تھا لگائے دلِ رسول پہ وار
دفاع کے لئے اُٹھا حسنؑ کا وہ دلدار دکھا رہا ہے جہاں کو جہاد بے ہتھیار

محبِ حسینؑ کے دفعِ فساد کرتے ہیں
خدا کی راہ میں ایسے جہاد کرتے ہیں

کہو پکار کے ظالم! ذرا خیال تو کر
ابھی نہ تیغِ ستم کی چلا خیال تو کر
ہے ایک طفل بھی واں پر کھڑا خیال تو کر
نہ جانے خیمہ سے کیسے گیا خیال تو کر
اُٹھا لیا ہے تو رُک جا نہ ہاتھ ہلنے دے
خدارا اسکو چچا سے گلے تو ملنے دے

مگر نہ مانا وہ بیکس پہ کر ہی بیٹھا وار
حسنؑ کے لال نے ہاتھوں پہ روک لی تلوار
کٹے جو ہاتھ، گرا خاک پر بہ حالِ زار
تڑپ رہا تھا کہ تیروں کی ہوگئی بوچھار
گلا بھی چھد گیا تیر ایسا چل گیا ہے
چچا کی گود میں ہی دم نکل گیا ہے

کہو پکار کے یارو! کہ اے امامؑ کے لال
تجھے ہماری برأت کا کس قدر تھا خیال
ہوا نہ ماں کی جدائی کا مطلقاً بھی ملال
دکھا دیا کہ رہِ حق میں کس طرح ہو جدال
وہاں نہ تیر، نہ تلوار کی ضرورت ہے
بس عشقِ حق کی کھڑی دھار کی ضرورت ہے

قتیلِ جور و جفا، ابنِ مجتبیٰ، اُٹھ تو!
یہ کیسی نیند تجھے آگئی ذرا اُٹھ تو!
ہیں چور زخموں سے تنہا ترے چچا، اُٹھ تو!
وہ لے کے تیغ کوئی اور آگیا اُٹھ تو!
لے اُٹھ! چچا کی مصیبت میں پھر مدد کر دے
وہ ننھے ننھے سے بازو ذرا سپر کر دے

درِ خیام سے ماں تک رہی ہے بیچاری
زبانِ حال سے کہتی ہے درد کی ماری
ذرا سنو تو مرے لال تم پہ میں واری
کرو جہاد کی پیارے اب اُٹھ کے تیاری

چلے بھی تو ذرا یہاں آکے پھر چلے جانا
ذرا میں تیغ و سپر باندھ دوں، پھر چلے جانا

ولائیو! کہو ابنِ حسنؑ ترے صدقے
ذرا سی عمر میں امت پہ تم ہوئے صدقے
دکھائی شانِ کرم، ہم پہ ہو گئے صدقے
کہ ننھے ننھے سے بازو بھی کر دیے صدقے

ادیم ایسے جو ظلم و ستم سے مرنا تھا
حسنؑ کے لال کو، دل تیرا غم سے بھرنا تھا

چوتھی مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم ٥ الحمد للہ الّذی خلق السمٰوٰت والارض وھو منزل البرکات وسامع الاصوات غافر الخطئیات والصلوٰۃ والسلام علیٰ حبیبہٖ فضل الکائنات محمّد ن المصطفیٰ واٰلہٖ الطیبات یصلون علیھم ملائکۃ السمٰوٰت ٥ امّا بعد فقد قال اللہ تبارک وتعالیٰ فی کتابہ المجید وفرقانہ الحمید وقولہ الحق ٥ بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ٥ یا ایہا الّذین اٰمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصّادقین ٥

جناب باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

صدق اور صادقین کے متعلق پہلی مجالس میں جو بیان ہو چکا ہے اُس کا لُبِّ لباب یہ ہے کہ:۔

(۱) حقیقت کے مُطابق اظہار کرنا بشرطیکہ احقاقِ حق کے لئے ہو صدق ہے، بدنیتی سے ہو تو جھوٹ ہے۔

(۲) خلافِ حقیقت بیان جبکہ ہدایتِ خلق کی ضرورت کے لئے کیا جائے، وہ جھوٹ نہیں ہے بلکہ مکر و تقیّہ کہلاتا ہے۔ نفسِ انسان پر گہرے نقوش بٹھانے کے لئے، قوانینِ فطرت کی رُو سے ہنگاموں کی ضرورت ہوتی ہے جو حقیقت نہیں ہوتے۔ موسیٰ و خضر علیہم السلام کی ملاقات ایک اَمر کا گہرا نقش بٹھانے کے لئے ایک ہنگامہ ہے۔

اب صادقین کی تلاش کے لئے کلام اللہ میں بہت مشکل پیش آتی ہے مگر اس امر سے کچھ سہولت ہوجاتی ہے کہ آیۂ زیر بحث میں متقین کو حکم ہے کہ صادقون کے ساتھ ہوجاؤ۔ لہٰذا ضروری ہے کہ وہ صادق امام المتقین ہونے چاہئیں۔ اب ہمیں ایسی آیت تلاش کرنی چاہئیے جس میں صدق و تقویٰ دونوں صفات یکجا کی گئی ہوں اور ایسی آیت ہم کو ایک ہی ملتی ہے جو سورۂ بقرکے رکوع ۲۲ کی پہلی آیت ہے "لیس البران تو لوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من اٰمن باللہ والیوم لاٰخر والملٰئکۃ والکتٰب والنبیین۔ واٰتی المال علیٰ حبہٖ ذوالقربیٰ والیتٰمیٰ والمسٰکین وابن السبیل۔ والسّائلین وفی الرقاب واقام الصلوٰۃ واٰتی الزکوٰۃ۔ والموفون بعھدھم اذا عاھدوا والصابرین فی البأساء والضراء وحین البأس اولٰئک الذین صدقوا واولٰئک ھم المتقون (بقر۔ ۱۷۷)

(یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم اپنے مونہہ مشرق یا مغرب کی طرف کرو بلکہ حقیقی نیکی وہ ہے (یا اُسی کی ہے) جو ایمان لائے اللہ پر اور یوم قیامت پر، ملائکہ پر اور نبیوں پر۔ اور مال دے اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو، یتیموں کو، مسکینوں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو۔ اور غلاموں کے آزاد کرانے میں۔ اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور پورا کرنے والے اپنے عہدوں کے جب عہد کرلیں۔ اور صبر کرنے والے تنگی میں، بیماری و پریشانی میں۔ اور لڑائی کی سختی میں۔ وہی لوگ ہیں جو صادقین ہیں اور وہی ہیں جو متقین ہیں)

یہ آیت ایسے صادقین اور متقین کی طرف اشارہ کرتی ہے جن میں صفات مندرجہ آیت موجود ہوں۔ چنانچہ اٰمنّا باللہ وملٰئکتہٖ ورسلہٖ کے متعلق تو سابق مجالس میں بیان ہوچکا ہے کہ وہ کون ہوسکتا ہے جسکے ایمان کی شہادت خود قرآن نے کھلے لفظوں میں دی ہو اور وہ سید العارفین مولائے کائنات حضرت امیر المومنینؑ ہی ہیں۔

اب ہم دوسرے جزو کو لیتے ہیں" واٰتی المال علیٰ حبہٖ ذوالقربیٰ والیتمیٰ

والمسٰکین وبن السبیل والسائلین وفی الرقاب (اور مال دے اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو، یتیموں کو، مسکینوں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور غلاموں کو آزاد کرانے میں)۔ اس کے لئے ہم کو چاہیئے کہ کلام باری میں شہادت تلاش کریں تو وہ ہم کو سورۂ دہر میں ملتی ہے:" یوفون بالنذر ویخافون یوما کان شرہ مستطیرا ویطعمون الطعام علیٰ حبہ مسکینا و یتیما واسیرا ۞ (یہ وہ لوگ ہیں جو نذریں پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی سختی ہر طرف پھیلی ہوگی اور اس کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں)۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ ایک دفعہ حسنؑ اور حسینؑ بیمار ہوئے تو حضرت رسولؐ خدا کچھ لوگوں کے ساتھ عیادت کو تشریف لائے اور جناب امیرؑ سے فرمایا کہ بہتر ہوتا اگر تم اپنے لڑکوں کی صحت کے واسطے نذر کرتے۔ یہ سنتے ہی جناب امیرؑ اور بی بی فاطمہؑ اور فضہؓ نے تین تین روزوں کی نذر کی۔ غرض جب دونوں صاحبزادے اچھے ہوئے اور نذر کے پورا کرنے کا وقت آیا تو گھر میں کچھ نہ تھا۔ جناب امیرؑ نے شمعون یہودی سے تین صاع جو قرض لئے۔ جناب سیدہؑ نے ایک صاع جو پیسے اور پانچ روٹیاں پکائیں۔ شام کو ایک سائل نے آواز دی۔ "السلام علیکم یا اہلبیت محمدؐ" میں ایک مسلمان مسکین ہوں۔ مجھے کھانا دو۔ خدا تمہیں جنت کے خوان عطا کرے گا۔" یہ سنتے ہی سب نے اپنے آگے کی روٹیاں دیدیں اور فقط پانی پی کر سو رہے اور دوسرے روز پھر روزہ رکھا۔ پھر جناب سیدہؑ نے پانچ روٹیاں پکائیں اور افطار کرنے بیٹھے کہ ایک یتیم نے آواز دی اور سب نے اپنی اپنی روٹیاں اسے دیدیں اور صرف پانی سے افطار کیا۔ تیسرے روز پھر افطار کرنے بیٹھے تھے کہ ایک قیدی نے آواز دی اور پھر سب بزرگواروں نے اپنی اپنی روٹی نذر کر دی۔ چوتھے دن صبح کو جناب امیرؑ نے دونوں صاحبزادوں کے ہاتھ پکڑے اور حضرت رسولؐ خدا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جب رسول اللہ کی نظر پڑی کہ بھوک کی شدت سے بچے کانپ رہے

ہیں تو فرمایا کہ میں تم لوگوں کو کس قدر تکلیف کی حالت میں دیکھ رہا ہوں۔ پھر خود اٹھے اور اُن کے ساتھ جناب سیدہؑ کے مکان میں تشریف لائے تو بی بیؑ کو محراب عبادت میں دیکھا کہ اُن کی پیٹھ پیٹ سے مل گئی ہے اور آنکھیں دھنس گئی ہیں۔ یہ دیکھ کر حضرتؐ کو بہت رنج ہوا کہ یکایک حضرت جبرئیل نازل ہوئے اور کہا "لیجئے یارسولؐ اللہ آپکو مبارک ہو کہ خدا نے یہ سورہ آپ کے اہلبیتؑ کی شان میں نازل کیا ہے" اور سورۂ دہر کی تلاوت فرمائی۔

بعض معاندین و مشککین کے دلوں میں وساوس پیدا ہونگے کہ امام حسینؑ بچہ ہونے کے باوجود معصوم مانے جاتے ہیں تو یقینی بات ہے کہ اصولِ حفظانِ صحت سے پوری طرح واقف ہوں۔ پھر بیمار ہو جانا کیا معنی؟۔ اسلئے کہ مرض تو مادۂ فاسد کے جسم میں جمع ہو جانے سے پیدا ہوتا ہے جو اصولِ حفظانِ صحت کی ناواقفیت سے اور خود اپنی غلطی سے جمع ہوتا رہتا ہے۔ پھر جب اس میں جوش پیدا ہوتا ہے تب کیفیتِ مرض ظاہر ہوتی ہے تو معصومین کے گھر میں ایک معصوم کا بیمار ہو جانا کسی طرح قرینِ قیاس نہیں ہو سکتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے وساوس اُن ہی لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہو سکتے ہیں جو ہادیانِ دین اور معصومین کی عظمت اور اُن کے طریقۂ ہدایت سے ناواقف اور جاہل ہوں۔ ہادیانِ دین کا فریضہ ہے کہ اُمّت کو عملی ہدایت کریں لہٰذا وہ ہدایتِ خلق کے لیے مظاہرہ کرکے وہ کیفیات اپنے اوپر طاری کرکے دکھلاتے ہیں جو ہدایتِ خلق کے لئے ضروری ہوں۔ لہٰذا یہ بھی ہماری ہدایت کے لئے ایک مظاہرہ ہے۔

آیۂ زیرِ بحث میں "والسّائلین و فی الرّقاب" کے بعد ارشاد ہے "واقام الصلوٰۃ واٰتی الزکوٰۃ" تو اس کا دعویٰ ہر مسلمان کرتا ہے۔ مگر ہمیں تو قرآن کی شہادت چاہیئے۔ تو دیکھیں آیۂ ولایت "انّما ولیّکم اللہ ورسولہ والّذین اٰمنوا الّذین یقیمون الصّلوٰۃ ویؤتون الزّکوٰۃ وھم راکعون۔" تا آخر مائدہ آیت ۵۵ کے متعلق بکثرت تفاسیرِ عرب میں منقول ہے کہ ایک روز مسجدِ رسولؐ میں نمازِ جماعت ہو

ہو رہی تھی کہ ایک سائل آیا اور اہلِ مسجد سے سوال کیا کسی نے کچھ نہ دیا۔ اُس وقت اُس نے دونوں ہاتھ اپنے آسمان کی طرف اُٹھائے اور کہا "خداوندا تُو گواہ رہنا کہ میں نے تیرے گھر میں مسجدِ رسولؐ میں سوال کیا مگر کچھ نہ پایا۔ اب تیرے گھر سے محروم پھرا جاتا ہوں۔" اُس وقت جنابِ امیرؑ رکوع میں تھے۔ آپ نے اپنی اُنگلی کی طرف اشارہ کیا۔ اُس سائل نے انگوٹھی اُتار لی اور چلا گیا۔ جنابِ رسولِ خداؐ کو نماز ہی میں معلوم ہو گیا۔ جب فارغ ہوئے تو اپنا سر آسمان کی طرف اُٹھایا اور دُعا کی "خداوندا میرے بھائی موسیٰؑ نے تجھ سے یہ سوال کیا تھا کہ کشادہ کر میرا سینہ اور میرا امر میرے لئے آسان کر۔ اور میری زبان کی گرہ کھول دے کہ لوگ میری بات کو سمجھیں۔ اور میرے واسطے میرے اہلبیت سے میرے بھائی ہارون کو وزیر قرار دے۔ اُن کے سبب میری پُشت کو مضبوط کر اور اُن کو امرِ رسالت میں میرا شریک کر۔ خداوندا تُو نے اُن کی دُعا قبول کی اور قرآن میں فرمایا "ہم تمہارے بھائی سے تمہارے بازو کو مضبوط کرینگے۔" خداوندا! میں تیرا نبی اور تیرا برگزیدہ ہوں۔ میرے بھی سینہ کو کھول دے اور میرے اہلبیتؑ سے میرے بھائی علیؑ کو میرا وزیر مقرر فرما اور اُسی سے میری پُشت قوی کر۔" ابُوذر کہتے ہیں کہ قسم ہے خدا کی ہنوز کلامِ رسولؐ تمام نہ ہُوا تھا کہ جبرئیل منجانب خداوند جلیل یہ آیت لے کر نازل ہوئے۔

بعض مُترجمین اس آیت کے ترجمہ میں تعصّب سے کام لیتے ہوئے تحریف کرتے ہیں یعنی یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون کا مطلب بیان کرتے ہیں کہ "وہ نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور رکوع کرتے ہیں۔" یعنی اس "واو" کو واوِ عاطفہ قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ واوِ حالیہ ہے کہ "وہ زکوٰۃ دیتے ہیں در آنحالانکہ وہ رکوع میں ہوں۔" اگر اس کو واوِ عاطفہ قرار دیا جائے تو کُل آیت ہی مہمل ہو جاتی ہے۔ آیت میں تو یہ بیان ہے کہ وہ نماز قائم کرتے

اور زکوٰۃ دیتے ہیں، تو کیا نماز میں وہ رکوع شامل نہیں ہے؟ خدا کا کلام مہمل نہیں ہوسکتا۔ آیت کا ترجمہ یہی صحیح ہے کہ وہ زکوٰۃ دیتے در آں حالانکہ وہ رکوع میں ہوں۔

معاندین اس پر ایک اعتراض یہ بھی وارد کرتے ہیں کہ نماز کے لئے تو حکم ہے "لاصلوٰۃ الّا بحضور القلب" یعنی بغیر توجہ قلبی نماز درست نہیں۔ پھر علی کرم اللہ وجہہ نے نماز میں سائل کی آواز کی طرف کس طرح توجہ کی۔ اگر توجہ تام نہ رہی تب تو نماز ہی باطل ہوجاتی ہے اور فرقہ امامیہ کی ایک مشہور روایت ہے کہ

ایک جنگ میں علی علیہ السلام کے پیر میں تیر بیٹھ گیا۔ اُس کو نکالنا چاہا تو ناقابلِ برداشت تکلیف ہوئی تو سرکارِ دوعالمؐ نے حکم دیا کہ علیؑ جب نماز میں ہوں اُس وقت تیر کھینچ لو۔ چنانچہ جب علی علیہ السلام نماز میں مصروف ہوئے تو وہ تیر کھینچ لیا گیا اور آنحضرت کو مطلق خبر نہ ہوئی۔ اب حیرت ہوتی ہے کہ ایک طرف تو یہ استغراق اور دوسری طرف ایک سائل کی آواز پر نماز سے توجہ ہٹ گئی۔ یہ کیا معاملہ ہے؟ تو اس کا جواب ایک بزرگوار ابو الفارق واسطی نے اپنی کتاب جامع الانوار کے جزو سوئم انوار الاسلام میں بہت تفصیل سے دیا ہے۔ یہ جواب ایک ہندو فلسفی کے اسلامی نماز پر شدید اعتراض کرنے کی بنا پر دیا گیا ہے جو سامعین کے لئے بالاختصار نقل کیا جاتا ہے:۔

سوال:۔ ایک روز پنڈت جی نے اپنا آخری سوال پیش کیا۔ کہنے لگے "مذہب کا مقصد انسان کے قوائے باطنی کو ترقی دینا ہے۔ کسی مذہب کو قبول کرنے کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ انسان اس پر عمل کر کے قوائے باطنی کا کمال حاصل کر سکے۔ اگر یہی نہ ہوسکا اور مذہب نے اس طرف رہنمائی نہ کی تو وہ دین بےکار اور فضول ہے۔ "قانون فطرت ہے کہ نفس کے قوائے باطنی کی ترقی یکسوئی توجہ مراقبہ یعنی دھیان لگانے سے ہوتی ہے۔ جب ایک جگہ بیٹھ کر کسی ایک مرکز کی طرف توجہ کرنے

کی مشق کرتے ہیں تو روز بروز قوتِ توجہ بڑھتی جاتی ہے مگر اس کے لئے تنہائی کی ضرورت ہے۔ جہاں خیال بٹانے والی کوئی چیز نہ ہو۔ نشست کا طریقہ بھی ایسا ہو کہ کسی عضو کے وزن کو سہارا دینے کی ضرورت نہ ہو اور اسکو کسی خاص حالت میں رکھنے کی طرف توجہ نہ کرنی پڑے ورنہ وہی نفس کے لئے باعثِ مشغلہ ہو کر توجہ میں مخل ہوگا اور جب یکسوئی ذہنی قائم نہ رہ سکے تو باطنی قوتوں کی ترقی ممکن نہیں بسناتن دھرم اور بدھ مت نے تو ایسی بہت سی ریاضتیں اور عبادتیں بتلائی ہیں جن سے گیان حاصل ہو سکے بلکہ ان مذاہب کی تو بنیاد ہی گیان، دھیان اور بھگتی پر ہے لیکن جب ہم اسلام پر نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نماز اس کی افضل ترین عبادت ہے۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ ؎

روزِ محشر کہ جاں گداز بود   اوّلیں پرسشِ نماز بود

اکثر مسلمان دوستوں سے سُنا ہے کہ محمد صاحب (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے فرمایا ہے کہ "نماز دین کا ستون ہے۔ اگر وہ قبول ہوئی تو اور اعمال بھی قبول ہوتے ہیں"۔ گویا کہ یہ ہی وہ عبادت ہے جو تمام دیگر اعمال وعبادت کی رُوح اور ان کی بنیاد ہے۔

اب اگر آزادانہ طور پر ہم نماز پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں مختلف حرکات وسکنات کرنے پڑتے ہیں۔ وہ بھی خاموشی سے نہیں بلکہ کچھ پڑھنے کے ساتھ۔ غرضیکہ نماز تو تمام کی تمام اختلافاتِ حرکات اور تبدیلیٔ خیالات پر مشتمل ہے۔ اور جب خیال تبدیل ہوتا ہے تو یکسوئیٔ ذہن ممکن نہیں۔ پھر جب یکسوئیٔ توجہ نہ ہو تو کمالاتِ نفسانی حاصل نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا نماز سے قوائے باطنی کی ترقی ممکن نہیں۔ پس جو عبادت قوائے باطنی کی ترقی کی طرف بڑھانے والی نہ ہو بے فائدہ ہے۔ جب اسلام کی افضل ترین عبادت کا یہ حال ہو تو مذہبِ اسلام گیان اور صفائے باطن کی طرف کس طرح راہ دکھلا سکتا ہے۔ پھر جب یہ فائدہ بھی نہ ہو تو ایسے مذہب سے کیا فیض حاصل ہو سکتا ہے؟

جواب:۔ بندہ نے کہا: کسی چیز پر ظاہری نظر ڈالنے سے اُس کے عیب و صواب کا نظر آنا محال ہے لہذا جو لوگ اعمال و عقائد اسلام کو سرسری نظر سے دیکھتے ہیں اُن کے ذہن میں وساوس پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کوئی حقائق کی طرف توجہ دلانے والا موجود ہو اور وہ جو کچھ بتلائے، اُس پر غور و فکر کریں تو البتہ محاسن نظر آتے ہیں۔

دیکھئے! جب یہ مانی ہوئی بات ہے کہ کسی مذہب کی حقانیت کی پہچان یہ ہے کہ وہ قوائے باطنی کی تکمیل کے طریقے سکھلائے تو ہر وہ دین جو ایسی تعلیم دے دین حقہ ہے مگر ایسے تمام ادیان میں ہم کیسے معلوم کریں کہ ان میں کون سا دین احق ہے جس کو دوسرے پر ترجیح دینی چاہیئے۔ بعض ادیان تو ایسے مشکل اور ناقابل عمل طریقے بتلاتے ہیں جن پر ہر شخص عمل نہیں کر سکتا بلکہ صرف چند افراد ہی عامل ہو سکتے ہیں۔ اور ایک مذہب ایسے سہل اور آسان طریقے سکھلاتا ہے جن پر چل کر اکثر افراد کمالات نفسانی حاصل کر سکیں تو وہی دین لائق ترجیح ہوگا۔ جو شخص اس راستہ کو اختیار نہ کریگا، گھاٹے میں رہے گا۔

دیکھئے۔ ہر صاحب فہم جانتا ہے کہ کمالات قوائے باطنی اور صفائے قلب یکسوئی ذہن اور توجہ الی اللہ سے حاصل ہوتے ہیں تو جو شخص روزانہ کچھ وقت اس پر صرف کرے وہ حصول کمالات میں اُس شخص کے برابر نہیں ہو سکتا جو تمام دن اسی حالت میں گزار دے۔ یہ بات اتنی واضح ہے کہ اس کے لئے کسی دلیل کی حاجت نہیں۔ بس جو شخص تمام دن توجہ الی اللہ میں گزارے گا، وہ منزل کمال کی طرف تیزی سے بڑھے گا اور حصول کمالات باطن میں اُن لوگوں پر سبقت لیجائیگا جو چند گھنٹے روزانہ ریاضت کرتے ہوں۔ اب یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ وہ کونسا مذہب ہے جس نے اپنے پیرووں کو ہر وقت ذکر اللہ اور توجہ الی اللہ میں مصروف رہنے کا حکم دیا ہے۔ اسلام ہی وہ دین واحد ہے جس نے اپنے تابعین کو ہر وقت یاد خدا کرنے کا حکم دیا ہے؟ کلام اللہ میں بہ کثرت

ایسی آیات ہیں جن میں حکم ہے اللہ کی یاد بہ کثرت کرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ (واذکروا اللہ کثیرا لعلکم تفلحون)۔ کہیں حکم ہے مجھے اٹھتے بیٹھتے یاد کرو (واذکروا اللہ قیاماً وقعوداً)، جمعہ کے لئے حکم ہے "جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو (یعنی کاروبار میں مصروف ہو جاؤ) اور اللہ کا ذکر بہ کثرت کرتے رہو تاکہ تم کو فلاح حاصل ہو" (واذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ واذکروا اللہ کثیرا لعلکم تفلحون ہ) جمعہ آیت ۱۰۔ غرضیکہ اسی طرح کی بہت سی آیات قرآن پاک میں موجود ہیں جن سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ بندہ ہر وقت، ہر دم وہر لحظہ اور ہر حال میں مالک کا ذکر کرتا رہے اور کسی وقت بھی اس کی یاد سے غافل نہ ہو۔

ہر اس شخص کے لئے جو کمالات باطنی کا خواستگار ہو عقل تو یہی حکم دیگی کہ ہر وقت مالک کی یاد میں مصروف رہے۔ روز وشب اسی کی یاد میں گزارے تاکہ منازل کمال کی طرف قدم بڑھا سکے۔ اب ہر شخص یہ کہے گا کہ یہ تو دنیا کے کام کاج چھوڑے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے فقراء، سادھو اور اولیاء اللہ دنیا ومافیہا سے قطع تعلق کر کے گوشہ نشین ہو کر ریاضتیں کرتے تھے۔ تب ہی ان کو کمالات باطنی حاصل ہوتے تھے۔ قریب قریب تمام مذاہب عالم میں عوام الناس ان ہی لوگوں کو عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ جو تارک الدنیا ہو کر گوشہ نشینی میں ہر وقت مالک کی یاد میں غرق رہتے ہیں۔ وہ ہی اولیاء اللہ اور محبان خدا سمجھے جاتے ہیں۔

تارک الدنیا اشخاص میں کچھ نہ کچھ کمالات نفسانی ضرور پیدا ہو جاتے ہیں لہذا اہل دنیا کا ان کی طرف رجوع کرنا، ان کو ولی اللہ سمجھنا ناگزیر ہے۔ مگر اسلام نے ترک دنیا کی ممانعت کی ہے اور رسول اسلام نے فرمایا ہے:- لا رھبانیۃ فی الاسلام (اسلام میں رہبانیت نہیں ہے)۔ پس جو شخص دنیا سے منھ موڑ کر زندگانی دنیا کو چھوڑ کر

گوشۂ تنہائی میں بیٹھ رہے اُس نے گویا اسلام سے مُنھ پھیر لیا۔ اسلام کی رُو سے رہبانیت اچھا عمل نہیں ہے۔ مگر عوام النّاس اس کو بہت اچھّا کام سمجھتے ہیں۔ اگر عقل و فطرت کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیں تو صاف نظر آجائے گا کہ رہبانیت باوجودیکہ اس سے کچھ کمالاتِ نفسانی حاصل ہوجاتے ہیں ممدوح نہیں ہے بلکہ مالک کی مرضی کے خلاف ہے۔

جناب کو یہ خیال تو ضرور آئے گا کہ بھلا ایسی کونسی کسوٹی ہوگی جس پر اس عمل کو پرکھا جاسکے اور اس کو غیر ممدُوح ثابت کیا جاسکے؟ مگر کمترین عرض کرتا ہے آپ مُشوّش نہ ہوں۔ ہر عمل کی بُرائی اور بھلائی تمیز کرنے کا سہل ترین طریقہ آپکی خدمت میں پیش کئے دیتا ہوں۔ دیکھئے اگر کوئی عمل ایک شخص کے لئے اچھّا ہے تو دُنیا کے ہر مرد و زن کے لئے اُس پر عمل کرنا مُفید ہی ہوگا۔ اور اگر ایک کام کسی ایک شخص کے لئے بُرا ہے تو ہر شخص کے لئے اُس پر عمل کرنا بُرا ہی ہوگا۔ اب رہبانیت کو اس کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لیں۔ اگر باطنی قوّتوں کے کمالات حاصل کرنے کے لئے کاروبارِ دُنیا کو ترک کرکے گوشۂ تنہائی میں جاگزیں ہوجانا مرضیِ خالق کے مطابق ہے اور اس سے مالک کی خوشنودی حاصل ہوسکتی ہے تو ہر شخص پر لازم ہوگا کہ کاروبارِ دُنیوی سے منھ موڑ کر دُنیا و مافیہا کو چھوڑ کر صحرائے لق و دق میں کسی غار میں جا بیٹھے اور تنہائی میں زندگی گزارے۔

اب غور کریں اور سوچیں کہ اگر دُنیا کا ہر مرد و زن رہبانیت اختیار کرلے تو کیا دُنیا ویران نہ ہوجائے گی اور بہت قلیل مدّت میں رُوئے زمین پر کیا ایک متنفّس بھی باقی رہ جائے گا؟

اب تو واضح ہوگیا کہ رہبانیت رضائے خالق کے منافی، اُس کی مرضی کےخلاف ہے اور اس پر عمل کرکے کوئی شخص خوشنودیِ خالق حاصل نہیں کرسکتا۔ ممکن ہے ایسا شخص کچھ کمالاتِ نفسانی حاصل کرکے مرجع خلائق بن جائے مگر اس سے رضائے الٰہی

حاصل ہونا ممکن نہیں۔

اَب غور طلب اَمر یہ ہے کہ جب ہر فردِ بشر پر قوائے باطنی کو ترقی دینا لازم ہے جسکے بغیر وہ خوشنودیٔ خالق حاصل نہیں کر سکتا جس کا واحد ذریعہ توجہ الی اللہ میں وقت گزارنا ہے، جو گوشہ نشینی کے بغیر ہو نہیں سکتا اور ترکِ دُنیا خالق کی مرضی کے خلاف ثابت ہوا تو آخر انسان وہ کونسا طریقہ اختیار کرے جو مالک کی مرضی کے مطابق بھی ہو اور اُس سے کمالاتِ نفسانی بھی حاصل ہو سکیں۔ اس کے لیے خود اپنے نفس کی فطرت کا مطالعہ لازم ہے۔ اپنے روز مرّہ کے مشاہدہ پر غور کریں۔ آپ روزانہ دفتر میں بیٹھ کر کام کرتے ہیں۔ جب آپ کارخانہ کا حساب کتاب لکھنے میں مصروف ہوتے ہیں تو میز پر قلمدان، کتابیں، رجسٹر وغیرہ رکھے ہوتے ہیں۔ ہر چند کہ آپکی توجہ کا مرکز تو صرف حساب کی رقوم ہوتی ہیں مگر قلم سیاہی لینے کے لیے ہر مرتبہ دوات ہی میں جاتا ہے حالانکہ آپ اُس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اور یہ بھی کبھی نہیں ہوتا کہ آپ کا ہاتھ میز پر رکھی ہوئی کسی چیز سے ٹکرائے۔ ہر چند کہ آپ حساب لکھنے میں ہمہ تن مصروف ہیں مگر کچھ نہ کچھ توجہ ماحول کی چیزوں کی طرف بھی ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ نفسِ انسان جس وقت کسی ایک مرکز کی طرف توجہ کرتا ہے تو وہ اپنے ماحول سے کُلیّتاً غافل نہیں ہوتا بلکہ توجہ کی خفیف شعاعیں ہر طرف پھیلی ہوتی ہیں اور تھوڑی تھوڑی توجہ ماحول کی ہر شے کی طرف رہتی ہے۔ اور یہ بھی قانونِ فطرت ہے کہ نفسِ انسان کی جس قوت کو بھی ترقی دینے کی مشق کریں گے وہ برابر بڑھتی چلی جائے گی۔

خوشخطی ہی کو دیکھ لیں۔ ابتدا میں کوئی حرف صحیح لکھنا کتنا مُشکل ہوتا ہے۔ مگر تدریجی مشق سے یہ حالت ہو جاتی ہے کہ اگر ایک حرف بیس مرتبہ بھی لکھے تو بالکل ایک ہی شکل ہوگی۔ پس جب نفسِ انسان میں تقسیمِ توجہ کی اہلیت موجود ہے کہ وہ ایک مرکز کی طرف توجہ کرتے ہوئے اور طرف بھی اجمالی توجہ کر سکتا ہے تو اگر تقسیمِ توجہ

کی مشق کرائی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ چند سال کی تدریجی اور مسلسل مشق سے اہلیت پیدا نہ ہو جائے کہ ایک وقت میں ایک سے زیادہ مراکز کی طرف توجہ کر سکے۔

جب خالق نے بندوں کو حکم دیا کہ میری یاد ہر وقت کرتے رہو۔ ہر دم و ہر لحظہ میری طرف متوجہ رہو اور میری دُنیا کو بھی آباد رکھو۔ پھر یہ دونوں کام ایک ساتھ کیسے ممکن تھے۔ مگر وہ فاطرِ فطرت جس نے قوائے ظاہری و باطنی نفسِ انسان میں ودیعت فرمائے ہیں، خود بھی خوب جانتا ہے کہ یہ دونوں کام ایک ساتھ اس سے کس طرح لئے جائیں۔

اُس نے اسی واسطے ایمان لانے والے بندوں پر دن میں پانچ وقت کی نماز لازم قرار دی۔ جس میں کھڑا ہونا، رکوع کرنا، بیٹھنا، سجدہ کرنا، سُورے اور تسبیحات پڑھنا ان کی قرأت و مطالب کی طرف توجہ کرنا اور مالک کی طرف بھی توجہ رکھنا ایک جگہ جمع کر دیا تاکہ مومنین کے نفوس کو اس کی مشق کرائی جائے کہ جب نماز کے لئے کھڑے ہوں تو ارکان کی طرف بھی توجہ کریں۔ واجبات کی طرف بھی توجہ کریں! اور ہر حال میں مالک کی طرف بھی توجہ کرتے رہیں۔

پس جو نفس روزانہ پانچ مرتبہ تقسیم توجہ کی ایسی مشق کرتا رہے گا تو کیا چند سال میں اُس میں اتنی بھی اہلیت پیدا نہ ہو سکے گی کہ ایک وقت میں دو طرف ہی توجہ کر سکے۔ یعنی اپنے خالق کی طرف بھی توجہ کرتا رہے اور ساتھ ہی دُنیا کے کاموں کی طرف بھی متوجہ رہ سکے۔ پس جب یہ اہلیت پیدا ہو جائے تو دُنیا کے کاروبار میں مصروف رہتے ہوئے بھی خدا کی یاد سے غافل نہ ہو گا اور اسی طرح قوائے باطنی کے کمالات کے حصول میں جلد کامیاب ہو گا۔ اللہ پاک نے اپنے کلام میں مومنین کاملین کی یہ ہی صفت بیان فرمائی ہے کہ اُن کو معاملاتِ تجارت، کوئی خرید و فروخت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔ نور۔ آیت ۳۷ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔ اور سورۂ جمعہ میں بھی حکم ہے کہ جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے

فضل کی تلاش کرو اور اللہ کی یاد بہ کثرت کرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ یعنی کاروبارِ دنیا میں معروف ہوتے ہوئے بھی اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو۔

اب تو واضح ہو گیا کہ صرف نماز ہی وہ عملِ واحد ہے جس سے انسان قوائے باطنی میں ترقی کر کے کمالاتِ نفسانی بھی حاصل کر سکتا ہے اور مقصدِ خالق کی تکمیل میں بھی معروف رہ سکتا ہے یعنی خالق کی دُنیا کو آباد رکھتے ہوئے، اُس کی مخلوق کی خدمت کرتے ہوئے ایمانِ حقیقی یعنی (گیان) معرفت حاصل کر سکتا ہے جس سے رضائے الہٰی حاصل ہو گی اور نعیمِ اُخروی کا حقدار ہو جائے گا۔ نماز کے سوا کوئی طریقۂ عبادت ایسا نہیں ہو سکتا جس سے کمالاتِ نفسانی بھی حاصل ہو سکیں اور رضائے خالق بھی نصیب ہو۔

اَب تو ظاہر ہو گیا کہ اسلام اور صرف اسلام ہی ایسا دین ہے جو حصُولِ رضائے خالق کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اسلامی نماز تمام ادیان کی عبادت سے بہتر ہے۔

اَب پنڈت جی کہنے لگے کہ واقعی اگر صحیح طریقہ پر عمل کیا جائے تو نماز صفائے باطن کا بہترین ذریعہ ہے (فالحمد للہ ربّ العٰلمین)

(جامع الانوار سے اقتباس)

جب یہ اَمر ثابت ہو گیا کہ نماز کا مقصد تقسیمِ توجہ کی قوّت حاصل کرنا ہے تاکہ نفسِ انسان میں یہ اہلیت پیدا ہو جائے کہ "دستم بکار دل من بیار دل" تو پھر کامل الایمان افراد کے لیئے ایک وقت میں کئی طرف توجہ کرنا ممکن ہو سکتا ہے۔

امیر المومنینؑ کی نماز میں زکوٰۃ دینے سے تو صرف دو ہی طرف توجہ بٹتی ہے تو اس پہ نادان جاہل کیا اعتراض کر سکتے ہیں۔؟

عزادارو! اس وقت کربلا کی چند نمازیں یاد آگئیں۔ شبِ عاشور رُخصت

ہو رہی ہے۔ سپیدۂ سحر نمودار ہونے کو ہے۔ امام مظلوم کے تمام اصحاب و اعزا نماز کی تیاری میں مصروف ہیں بعض نمازیوں کی آنکھیں اس حسرت سے آبدیدہ ہو گئیں کہ آج ہم اتنا بھی پانی فراہم نہیں کر سکتے جس سے فرزندِ رسولؐ وضو کر سکیں الغرض ساقیٔ کوثر کے دلبند نے نماز کے لئے تیمم کیا اور تمام اصحاب و اعزا بھی تیمم کر کے تیار ہو گئے تو ۔

ناگاہ چرخ پر خطِ ابیض ہوا عیاں
تشریف جانماز پہ لائے شہِ زماں
سجادے بچھ گئے عقب شاہِ انس و جاں
صوتِ حسنؑ سے اکبرِ مہ رُو نے دی اذاں

ہر اک کی آنکھ آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی
گویا صدا رسولؐ کی کانوں میں آ گئی

چپ تھے طیور، جھومتے تھے وجد میں شجر
تسبیح خواں تھے برگ و گل و غنچہ و ثمر
محوِ ثنا کلوخ و نباتات و دشت و در
تصویر بن گئے تھے درختوں پہ جانور

اعجاز تھا کہ دلبرِ شبیرؑ کی صدا
ہر خشک و تر سے آتی تھی تکبیر کی صدا

تھے عالمِ سکوت میں سکانِ بحر و بر
پانی سے مچھلیاں ابھر آئی تھیں سر بسر
تھی ہر صدف بھی کان لگائے ہوئے ادھر
پانی سے منھ نکالے تھے دریا کے جانور

سکتے میں تھے گہر بھی، حجر بھی، جبال بھی
سر بے منھ اٹھائے کھڑے تھے غزال بھی

ناموسِ شہ تھے خیمہ میں خاموش اشکبار
چپکی کھڑی تھیں صحن میں بانوئے نامدار
زینب بلائیں لے کے یہ کہتی تھیں بار بار
صدقے نمازیوں کے مؤذن کے میں نثار

کرتے ہیں یوں ثنا و صفت ذوالجلال کی
لوگو اذاں سنو مرے یوسف جمال کی

یہ حسنِ صوت اور یہ قرأت، یہ شدّ ومدّ حقّا کہ اَفصحُ الفُصحا ہے انہیں کا جد
گویا ہے لحنِ حضرتِ داؤدِ باخرد یا رب ! رکھ اس صدا کو زمانے میں تا ابد

شعبِ صدا میں پنکھڑیاں جیسے پھول میں
بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسولؐ میں

حسینیو! ذرا غور کرو کہ اہلِ حرم کے قلوب کی کیا کیفیت ہوگی جبکہ یہ معلوم ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ یہ آخری اذان ہے اور محبوبِ خدا کی آواز سننے کا آخری موقعہ ہے۔ اس کے بعد کبھی اس اذان کی آواز بلند نہ ہوگی اور ان نمازیوں میں سے شام تک کوئی باقی نہ رہے گا۔ جتنی بھی دلوں میں تڑپ ہو کم ہی ہے۔ اس کا تو اندازہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ نمازِ صبح ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ عمرِ سعد کے حکم سے تیروں کی بارش شروع ہوگئی اور پچاس سے زیادہ صحابی نماز ہی میں شہید ہوگئے۔

دورانِ جنگ میں نمازِ ظہر کا وقت آگیا تو ابوثمامہ نے حضرت سے عرض کی کہ میری خواہش ہے کہ حضور کے ساتھ یہ نماز ادا کرکے میں خدا سے ملاقات کروں۔ یہ سن کر حضرت نے سر اٹھایا اور فرمایا اللہ تم کو مُصلّین و ذاکرین کا درجہ عطا کرے کہ تم نے نماز کا ذکر کیا ہے۔ بے شک یہ اوّل وقت نماز کا ہے۔ مخالفین سے کہو کہ ہم کو نماز پڑھنے دیں۔ حصین ابن نمیر بولا کہ تمہاری نماز قبول نہ ہوگی۔ اس پر حبیب ابن مظاہر نے غضبناک ہو کر حصین کو ڈانٹا۔ بہر حال نمازِ ظہر ادا کی گئی جس میں کئی صحابی تیروں کی بارش کو روکنے کے لئے امام کے آگے کھڑے ہو کر شہید ہوگئے۔

اور اب رفتہ رفتہ عالمِ تنہائی حسینؑ کے ساتھ صلوٰۃِ آخر کا وقت آگیا۔ مولا تنہا تھے اور اس نمازِ آخر کے قیام میں تھے کہ ایک ملعون نے نیزہ مارا اور آپ رکوع میں جھک گئے۔ یہ رسولؐ کی پشت پر سجدہ میں چڑھنے والے کی نماز ہے۔ اب وہ سجدہ آتا ہے جو سجدوں کی بنیاد ہے۔ رسولؐ کی پشت پر چڑھنے والے کی پیٹھ پر قاتل سوار ہے۔

اور گلوئے خشک پر اُس کا کند خنجر رواں ہے لیکن سیّدہؑ کے لال کے لبوں پر اُمت عاصی کی بخشش کے لئے دُعا ہے۔ سر جُدا ہو گیا اور وہ سجدہ بھی ختم ہوا مگر ابھی زکوٰۃ دینا تو باقی تھا۔ اس لئے اُنگلی میں پہلے سے انگشتری پہنی ہوئی تھی۔ عزادارو! کیا ایسی بھی کبھی کسی نے زکوٰۃ دی ہے کہ انگشتری کے لئے ہاتھ قطع کروا لیا جائے؟۔ سیّدہؑ کے فرزند نے صلوٰۃ و زکوٰۃ کا حق ادا کر دیا۔ رسولؐ کی نواسیوں نے تمام مال و اسباب زکوٰۃ میں دیدیا مگر اس کے بعد بھی حکم ہوتا ہے" واقرضو اللہ قرضاً حسنا"۔ اب بتاؤ کہ رسولؐ کی نواسیاں اور سیّدہؑ عالمین کی بیٹیاں قرضِ حسنہ کیا پیش کریں؟ ہاں! ابھی سروں پر چادریں باقی ہیں ، وہ بھی پیش کر دی گئیں۔

بچوں کے ہاتھوں کے کڑے، کانوں کے گوشوارے اُن کی چھری ہوئی لووں کا خون، سب کچھ دیا جا رہا ہے۔ خیموں میں تلاطم برپا ہے۔ سیدانیاں اپنے بالوں سے مُنھ چھپائے ایک دوسرے کے پیچھے چھپتی پھرتی ہیں۔ مسندِ رسولِ خُدا چھین لی گئی ہے اور جفا کار اب اصغرِ بے شیر شہید تیر جور و ظلم کے خالی جھولے کی طرف بڑھ رہے ہیں اور بانو فریاد بہ لب ہیں :۔

جھولا اصغر کا نہ لے جاؤ کہ وہ روئے گا
بچہ آئے گا ابھی میرا، کہاں سوئے گا"

پانچویں مجلس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۰ الحمد للہ رب العٰلمین و الصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الانبیاء والمرسلین محمد المصطفےٰ والہ الطیبین الطاھرین المعصومین ۰ اما بعد فقد قال اللہ تبارک وتعالیٰ فی کتابہ المجید وفرقانہ الحمید و قولہ الحق ۰ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۰ یا ایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین ۰

جناب باری تعالیٰ ایمان لانے والوں سے ارشاد فرماتا ہے کہ "اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔" چنانچہ سابقہ مجالس میں ہم نے قرآنِ حکیم کی روشنی میں صادقین کو تلاش کیا اور اس ضمن میں ہم کئی اہم نکات سے گزر کر اس منزل تک آئے ہیں اور وہ نکات یہ ہیں:۔

(۱) حقیقت کے مطابق اظہار کرنا بشرطیکہ احقاقِ حق کے لئے ہو صدق ہے، بدنیتی ہو تو جھوٹ ہے۔

(۲) خلافِ حقیقت بیان جبکہ ہدایتِ خلق کی ضرورت کے لئے کیا جائے وہ جھوٹ نہیں ہے بلکہ مکر و تقیّہ کہلاتا ہے۔ ہادیانِ دین کا ہر حرکت و سکونِ نفسِ انسان پر گہرے نقوش بٹھانے کیلئے مظاہرہ ہوتا ہے جو حقیقت نہیں ہوتا۔

(۳) قرآن نے لا الٰہ الا اللہ کہنے والوں کو یا ایھا الذین آمنو یعنی اے ایمان لانے والو ہی کہہ کر مخاطب کیا ہے مگر ان میں سے اکثر کی جو کیفیات بیان کی ہیں وہ قابلِ مذمت ہیں۔

(۴) قرآن یہودیوں کے ایک ایسے گروہ کی نشان دہی کرتا ہے جو تخریب اسلام

کے لئے مسلمان ہوا اور جس نے بے شمار خلاف عقل و فطرت باتیں مسلمان علماء کو پہنچائیں اور وہ سب حماقت پر مبنی ہونے کے باوجود علم دین میں آج تک شامل ہیں اور اکثر علماء ان پر ایمان رکھتے ہیں۔

(۵) قرآن کی رو سے ایمانِ حقیقی کی پہچان حُبِّ شدید ہے اور حُبِّ شدید کی علامت وَجِلَت قُلُوبُہم ہے یعنی نام سنتے ہی دل لرز جائے۔

(۶) قرآن میں ایسے مومنین کا ذکر موجود ہے جو رسولؐ کے ساتھ ایمان میں شریک ہیں۔ حضرت ابوطالبؑ ان میں شامل ہیں اور اُن کے ایمان کی قسم قرآن نے اس طرح کھائی ہے " لا اقسم بھذا البلد و انت حل بھذا البلد و والد و ما ولد " ترجمہ: قسم ہے اُس شہر کی اور تم اس میں رہتے ہو اور ایک باپ اور بیٹے)۔

(۷) صنم پرستی کیا ہے؟ صنم کیا ہے؟۔ سب سے بڑا صنم ہوائے نفس ہے اور ہوائے نفس کی پرستش شرک ہے اور شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹوں کے لئے ہر طرح کے شرک خفی و جلی سے حفاظت کی دُعا کی ہے اور ایسے حضرات معصوم ہی ہو سکتے ہیں یعنی جو پیدا ہی مومن و معصوم ہوئے اس لئے کہ اُن کو ایمان کی طرف بلانے والا اُن کے رب اور ان کے ضمیر کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ وہ اپنے ایمان کے داعی آپ ہی ہیں اور اُن کی ایک صفت یہ ہے کہ اُن کے بعض بعض میں سے ہیں۔

(۸) اَدیانِ عالم کی جملہ عبادات میں صرف اسلامی نماز ہی ایسی ہے جو تعمیم توجّہ کے ساتھ ذکر الٰہی کی تعلیم دیتی ہے اور کارِ جہاں میں منہمک رہتے ہوئے اس مشق کو ممکن بناتی ہے جس سے قوائے نفسانی کی مخفی قوتوں میں ترقی کا امکان اُن لوگوں کی مناسبت سے بہر حال زیادہ ہے جو صرف مقررہ اوقات ہی میں

ذکرِ الٰہی کرکے بیٹھ رہتے ہیں۔ ہماری نماز نے "ہتھ کار ول من یار ول" کا عجیب نسخۂ کیمیا فراہم کیا ہے۔

مجالسِ سابقہ کے اِن نکات کے اعادے کے بعد اب ہم آپکی توجہ کلام پاک کی اس ایک آیت کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جس کی طرف ہم نے اس لیے رجوع کیا تھا کیونکہ اِس آیت میں صدق وتقویٰ ہر دو صفات یکجا بیان کی گئی ہیں اور وہ سُورۂ بقر کی یہ آیت ہے:۔ لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من آمن باللہ والیوم الآخر والملٰئکۃ والکتب والنبیین ۰ واتی المال علیٰ حبہ ذوی القربیٰ والیتمیٰ والمسٰکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب ۰ واقام الصلوٰۃ واتی الزکوٰۃ ۰ والموفون بعھدھم اذا عاھدوا والصٰبرین فی الباساء والضراء وحین الباس ۰ اولٰئک الذین صدقوا واولٰئک ھم المتقون ۰

اس آیت کی روشنی میں ہم ایسے اشخاص کی تلاش کر رہے تھے جو اُن صفات سے مُتصف ہوں جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے چنانچہ مختلف اوصاف پر گفتگو ہو چکی ہے۔ اب ہم آیۂ مذکورہ کے آخری جزو کو لیتے ہیں یعنی "والصٰبرین فی الباساء والضرآء وحین الباس" (اور صبر کرنے والے تنگی میں، بیماری و پریشانی میں اور لڑائی کی سختی میں)۔ اس صفت کو دیکھنا ہو تو شب ہجرت دیکھیں کہ تلواروں کے سائے میں امیر المومنینؑ کیسی گہری نیند سو رہے ہیں۔

واقعہ یوں ہے کہ جب قریش نے دیکھا کہ مسلمان طاقت پکڑتے جاتے ہیں اور وطن اسلام پھیلتا جاتا ہے تو انھوں نے دارالندوہ میں جو دارالشوریٰ تھا، اجلاس عام کیا اور جملہ سرداران قریش جمع ہوئے تاکہ دفاع محمدؐ پر تجویزیں پیش کریں۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت ایک شخص سفید ریش دروازے

پر آیا تو دربان نے روکا۔ وہ کہنے لگا کہ میں نجد سے آیا ہوں اور یہ سن کر کہ تم لوگ دفاعِ محمدؐ کی تدابیر سوچنے کے لئے جمع ہوئے ہو، میں بھی یہاں آگیا کہ اپنے مشورے سے اعانت کروں۔ یہ شیخ نجدی، شیطان تھا۔

پہلی تجویز ایک شخص نے یہ پیش کی کہ ہم محمدؐ کو قید کر دیں۔ شیخ نجدی نے کہا یہ غلط ہے اسلئے کہ جب حج کا زمانہ ہوگا اور تمام قبائلِ عرب یہاں جمع ہوں گے تو بنی ہاشم فریاد کریں گے اور سب اُن کی آواز پر لبیک کہہ کر محمدؐ کو چھڑا لیں گے۔ دوسری تجویز ہوئی کہ جلاوطن کر دیا جائے۔ شیخ نجدی نے کہا یہ پہلی تجویز سے بھی زیادہ خراب ہے اور وہ یوں کہ اس طرح تم ایک سحر بیان شخص کو تمام قبائلِ عرب میں آزاد چھوڑ دوگے تاکہ وہ بے شمار اطاعت گزار پیدا کر کے تمہارے اُوپر چڑھا لائے۔ یہ ترکیب رد ہوئی تو تیسری یہ پیش ہوئی کہ محمدؐ کو قتل کرا دیں۔ قاتل کو سو اونٹ انعام دیں اور بنی ہاشم کو دُگنا خوں بہا ادا کر دیں۔ شیخ نجدی نے کہا کہ یہ تجویز دوسری سے بھی زیادہ خراب ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ بنی ہاشم سب کا تو مقابلہ نہیں کر سکیں گے مگر اُن کو یہ ہرگز گوارا نہ ہوگا کہ محمدؐ کا قاتل اُن کی آنکھوں کے سامنے زمین پر چلتا پھرتا ہے لہٰذا وہ اُسے ضرور قتل کر دیں گے اور اس طرح تمہارے درمیان خونریزی کا بازار گرم ہو جائے گا۔ آخر کار ابوجہل نے یہ تجویز پیش کی کہ ہر قبیلہ سے ایک آدمی لیا جائے اور ایک آدمی بنی ہاشم سے بھی لیا جائے یعنی ابولہب۔ اور یہ سب جا کر رات کو مکان کا محاصرہ کر لیں اور صبح ہوتے ہی مکان میں داخل ہو کر ہر شخص محمدؐ پر وار کرے اس طرح خون تمام قبائل میں تقسیم ہو جائے گا اور بنی ہاشم اتنے قبائل سے انتقام نہ لے سکیں گے بلکہ چونکہ ایک آدمی خود اُن کے قبیلہ کا بھی شریک ہوگا لہٰذا وہ خوں بہا طلب کرنے کے مجاز نہ ہوں گے پھر بھی ہم اُن کو دُگنا خوں بہا دے دیں گے۔ ابوجہل کی اس تجویز کو شیطان بھی مان گیا اور یہ پاس ہو گئی۔ لوگ خوشی سے تالیاں سیٹیاں بجاتے وہاں سے نکلے۔

سیرت النبیؐ کے مصنف مولوی شبلی رقمطراز ہیں کہ آنحضرتؐ کو قریش کے ارادہ کی پہلے سے خبر ہو چکی تھی۔ چنانچہ ہجرت سے دو تین دن قبل آپ دوپہر کے وقت ابوبکر کے گھر پر گئے۔ دستور کے موافق دروازہ پر دستک دی۔ اجازت کے بعد گھر میں تشریف لے گئے۔ ابوبکر سے فرمایا "کچھ مشورہ کرنا ہے۔ سب کو ہٹا دو"۔ وہ بولے کہ یہاں آپ کے حرم کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ اُس وقت عائشہ سے شادی ہو چکی تھی۔ آپ نے فرمایا "مجھ کو ہجرت کی اجازت ہو گئی ہے"۔ ابوبکر نے نہایت بیتابی سے کہا "میرا باپ آپ پر فدا ہو کیا مجھ کو بھی ہمرہی کا شرف حاصل ہو گا"۔ ارشاد ہوا "ہاں"۔ ابوبکر نے ہجرت کے لیئے چار مہینوں سے دو اونٹنیاں ببول کی پتیاں کھلا کھلا کر تیار کی تھیں۔ عرض کی کہ ان میں سے ایک آپ پسند فرمائیں۔ محسنِ عالم کو کسی کا احسان گوارا نہیں ہو سکتا تھا۔ ارشاد ہوا "اچھا! مگر بہ قیمت"۔ ابوبکر نے مجبوراً قبول کیا۔ عائشہ اُس وقت کم سن تھیں اسلیئے اُن کی بڑی بہن اسماء نے جو عبداللہ بن زبیر کی بیوی تھیں، سفر کا سامان تیار کیا اور دو تین دن کا کھانا ناشتہ دان میں رکھا۔

مختلف تواریخ کی بعض روایات میں یہ ہے کہ حضرتؐ نے صحابہ کو گھروں سے نکلنے کی ممانعت کر دی تھی اور رات کے وقت جب حضرتؐ تنہا غارِ ثور کی طرف جا رہے تھے اُس وقت آپ کو ابوبکر ناگاہ راستہ میں مل گئے اور آپ نے اُن سے کہا کہ مجھے کاندھوں پر اُٹھا لو۔ صبح کو جو سراغ لگانے والے بھیجے گئے تو معلوم ہوا کہ یہاں تک تو محمدؐ اور ابنِ ابو قحافہ دونوں آئے ہیں مگر اس کے بعد محمدؐ کو معلوم نہیں زمین کھا گئی یا آسمان۔

مگر پہلی روایت قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے اس لیئے کہ اگر رسول کریمؐ ابوبکر کے گھر نہیں گئے تو ابوبکر کے گھر والوں کو غارِ ثور کا پتہ کیسے معلوم ہوا جہاں کھانا بھی انتظاماً اور اونٹ بھی پہنچائے گئے۔

قرآن میں غارِ ثور کی حالت کا جو ذکر آیہ غار میں ہے وہ یہ ہے "الا تنصروہ فقد نصرہ اللہ اذ اخرجہ الذین کفروا ثانی اثنین اذھما فی الغار اذ یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا ج فانزل اللہ سکینتہ علیہ وایدہ بجنود لم تروھا وجعل کلمۃ الذین کفروا السفلیٰ ط وکلمۃ اللہ ھی العلیا ط واللہ عزیز حکیم ہ (سورہ توبہ۔ آیت ۴۰)

ترجمہ:۔ اگر تم اس رسول کی مدد نہ کرو تو اُس نے تو اپنے رسول کی اُس وقت مدد کی جب اُس کو کفار نے نکال باہر کیا۔ دو میں کا دوسرا۔ جبکہ وہ دونوں غار میں تھے۔ جبکہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا غم نہ کر۔ یقیناً اللہ ہم دونوں کے ساتھ ہے۔ تو خدا نے اُس پر تسکین نازل فرمائی اور ایسے لشکر سے اُس کی مدد کی جن کو تم نے دیکھا تک نہیں اور خدا نے کافروں کی بات نیچی کر دی۔ اور خدا کا ہی بول بالا ہے۔ اور خدا تو غالب حکمت والا ہے۔"

اس آیت کے سلسلے میں دو باتیں قابلِ غور ہیں:۔

پہلی یہ کہ ارشادِ باری ہے۔ جب تم نے مدد نہ کی تو اللہ نے مدد کی۔ اب اگر غار میں ساتھ رہنا مدد کرنا تھا تو آیت میں مدد نہ کی کیوں کہا؟۔

دوسرے یہ کہ ارشاد ہوا "لا تحزن" یعنی حزن نہ کر۔ حزن غم کو کہتے ہیں اور غم کسی گزشتہ واقعہ کے متعلق ہوتا ہے۔ غار میں جو بھی حالات تھے اُن کے پیشِ نظر خوف تو ہو سکتا تھا مگر غم نہیں۔ خیر اِس کا تعلق مناظرہ سے ہے تو مناظر صاحبان ہی جانیں۔ ہمارا تعلق مناظرہ سے نہیں ہے۔

بہرحال تین دن غار میں رہ کر چوتھے دن آپ باہر نکلے۔ عبداللہ بن اُریقط ایک کافر جس پر اعتماد تھا رہنمائی کے لئے اُجرت پر مقرر کر لیا گیا۔ وہ آگے آگے راستہ بتاتا جاتا تھا۔ ایک رات دن برابر چلتے گئے۔ دوسرے روز دوپہر کے وقت دھوپ

سخت ہوگئی تو ابوبکر نے چاہا کہ رسولؐ اللہ سایہ میں آرام فرمالیں۔ چاروں طرف نظر ڈالی تو ایک چٹان کے نیچے سایہ نظر آیا۔ سواری سے اُتر کر زمین صاف کی اور اپنی چادر بچھا دی۔ آنحضرتؐ آرام فرمانے لگے تو تلاش میں نکلے کہ کہیں کچھ کھانے کو مل جائے تو لائیں۔ قریب ہی ایک چرواہا بکریاں چرا رہا تھا۔ اُس سے کہا کہ ایک بکری کا تھن گرد و غبار سے صاف کر دے۔ پھر اُس کے ہاتھ صاف کروائے اور دُودھ نکلوایا۔ برتن کے اُوپر کپڑا لپیٹ دیا کہ گرد نہ پڑنے پائے اور وہ دودھ لے کر واپس آئے، تھوڑا سا پانی ملایا اور آنحضرتؐ کے سامنے پیش کیا۔ آپؐ نے پی کر فرمایا "کیا ابھی چلنے کا وقت نہیں آیا؟" آفتاب ڈھل چکا تھا۔ آنحضرتؐ اُٹھے اور وہاں سے پھر سفر کے لئے روانہ ہوگئے۔

اِدھر قریش نے اشتہار دیا تھا کہ جو شخص محمدؐ یا ابوبکر کو گرفتار کر کے لائیگا اُسے ایک خونبہا کے برابر سو اونٹ انعام دیئے جائیں گے۔ سُراقہ بن جعشم نے سُنا تو انعام کی اُمید میں نکلا۔ عین اُس حالت میں کہ آپ روانہ ہو رہے تھے اُس نے آپؐ کو دیکھ لیا اور گھوڑا دوڑا کر قریب آگیا لیکن گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور وہ گر پڑا۔ اپنے ترکش سے فال کے تیر نکالے کہ حملہ کرنا چاہیئے یا نہیں۔ جواب میں "نہیں" نکلا۔ لیکن ایک سو اونٹوں کا گرانبہا معاوضہ ایسا نہ تھا کہ تیر کی بات مان لیجاتی۔ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور آگے بڑھا۔ اس مرتبہ گھوڑے کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے۔ گھوڑے سے اُتر پڑا اور پھر فال دیکھی۔ اب بھی وُہی جواب تھا لیکن مکرّر تجربہ نے اُس کی ہمت پست کر دی تھی اور اُس کو یقین ہوگیا تھا کہ یہ آثار کچھ اور ہیں۔ وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں آیا اور قریش کے اشتہار کا قصّہ سُنایا۔ پھر درخواست کی کہ مجھ کو اَمن کی تحریر لکھ دیجئے۔ ابوبکر کے غلام عامر بن فہیرہ نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر فرمانِ اَمن لکھ دیا۔

اب مُشککین کو یہ وساوس پیدا ہوں گے کہ ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ رسولِ کریمؐ

مشرکین کے مجمع میں سے گزر گئے اور کسی نے نہ دیکھا۔ اور دوسری طرف یہ بیان کرتے ہیں کہ خوف سے غار میں جاکر چھپے۔ تو اس راز کو تو واقفانِ حقیقت ہی جانتے ہیں کہ ہادیانِ دین کے تمام کام ہدایتِ خلق کے لئے ہوتے ہیں۔ اُمّت کی تعلیم کیلئے ایک عملی مظاہرہ ہوتا ہے۔ وہ واردات حقیقی نہیں ہوتے چنانچہ یہ بھی ایک مظاہرہ تعلیمی ہے ورنہ خدا کے رسولؐ کو غار میں چھپنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

چونکہ اس مجلس میں صبر کا لفظ آگیا ہے اس لئے اس کلمہ کی طرف توجہ ضروری ہے۔ یہ زیادہ تر حضرت ایوبؑ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ صبرِ ایوبؑ مشہور ہے۔ مگر حضرت ایوبؑ تلواروں کے سایہ میں کبھی نہیں لیٹے اور امیرالمومنینؑ تلواروں کے سایہ میں نہ صرف لیٹے بلکہ اطمینان سے سوئے ہیں۔ حضرت ایوبؑ پر بڑے بڑے شدائد گزرے۔ اللہ اللہ خدا کے خاص بندوں کی بھی عجیب غریب حالت ہے۔ کبھی تو خوشحالی و راحت سے اُن کا امتحان لیا جاتا ہے اور کبھی تکلیف و رنج سے۔ اور اُس کی لذت کو بھی کچھ وُہی لوگ خوب سمجھتے ہیں۔ حضرت ایوبؑ، حضرت یوسفؑ کے داماد تھے اور آپ کی بی بی کا نام رحمہ تھا جو زلیخا کے بطن سے تھیں۔ آپ شروع ہی سے بہت بڑے دولتمند تھے۔ خدا نے لڑکے بالے بھی کثرت سے عطا فرمائے تھے اور آپ ہمیشہ خدا کی عبادت اور شکر گزاری میں بسر کرتے تھے۔ اسّی برس تک تو یوں گزری کہ دولت اور اولاد دے کر امتحان ہوا۔ اب دوسری طرح امتحان شروع ہوا۔ سب اولادیں مر گئیں، دولت تباہ ہوگئی، کھیتیاں برباد ہوگئیں، خود طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہوئے۔ فاقہ پہ فاقہ ہونے لگا۔ غرض ہر صورت سے مجبور ہوگئے۔ لیکن شکر کے سوا اُف تک نہ کی۔ ایک بی بی تھیں کہ ہر حال میں ساتھ تھیں اور خدمت کرتی تھیں۔ سات برس انہی تکالیف میں گزرے تو شیطان کے بہکانے سے لوگوں نے آپ کو طعنے دینا شروع کر دیئے کہ آخر تم سے کونسا گناہ سرزد ہوا ہے جس کی یہ سزا تم بھگت

رہے ہوا ور مصیبتوں پر مصیبتیں آتی جارہی ہیں۔ بلکہ خود شیطان نے بھی اُن سے کہا کہ تمہارا مرض اتنا طولانی ہوگیا ہے لیکن تمہارا خدا تم پر رحم نہیں کرتا۔ اب حضرت کو تابِ ضبط نہ رہی اور خدا سے رحمت کی دُعا کی۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپکی اہلیہ جناب رحمہ کھانا مانگ کر لاتیں اور حضرت ایوبؑ کو کھلاتی تھیں۔ ایک روز ایسا ہوا کہ کہیں سے کچھ نہ مل سکا۔ ایک نانبائی سے روٹی مانگی تو اُس نے کہا کہ اپنے بالوں کی ایک لٹ کاٹ کر مجھے دے دو تو میں تم کو روٹی دوں گا۔ جب حضرت ایوبؑ کے سامنے پہنچیں تو آپ نے بالوں کا حال پوچھا اور جواب سُن کر بے چین ہوگئے۔ فوراً سجدہ میں گِر کر رحمت کی درخواست کی کہ اے میرے رَب! میں ان حالات پر صبر نہیں کرسکتا۔ جناب رحمہ پھر روٹی کی فکر میں گئی ہوئی تھیں کہ بابِ رحمت کھلا اور وہاں ایک نہر جاری ہوئی اور رَب کا حکم ہوا کہ اس میں غسل کرو۔ غسل کرتے ہی تمام کیفیات بدل گئیں صحتِ کلی مل گئی۔ جناب رحمہ نے آکر دیکھا تو فریاد بلند کی کہ میں تو حضرت ایوبؑ کو یہاں چھوڑ گئی تھی، وہ کہاں گئے؟ آپ نے فرمایا کہ میں ہی تو ایوبؑ ہوں۔ خدا نے رحمت نازل کردی اور امتحان کا زمانہ ختم ہوگیا۔ اب پھر سے تمام جائداد، مویشی، اولاد وغیرہ جو ضائع ہوگئے تھے وہ سب واپس مل گئے۔

سامعین! اس وقت ایوبِ کربلا یاد آگئے۔

یا فاطمہؑ! غلام کا دِل تھرتھرا گیا
اس وقت ساربانِ حرم یاد آگیا

عزادارو! کیا ایوبِ کربلا، ایوبِ آلِ محمدؐ سید سجادؑ کے صبر کا حضرت ایوبؑ سے موازنہ کیا جاسکتا ہے؟ نہیں۔ ہرگز نہیں! حضرت ایوبؑ نے تو اپنی اہلیہ کے بالوں کی صرف ایک لٹ کٹی ہوئی دیکھی تو بے چین ہوگئے اور فریاد کرنے لگے ربا! اب میں صبر نہیں کرسکتا حالانکہ وہ لٹ کسی نے بالجبر قطع نہیں کی تھی۔ مگر ایوبِ کربلا کی بہنوں

کے سروں سے چادریں چھینی جا رہی ہیں اور وہ نہایت صبر و شکر سے دیکھ رہے ہیں۔ جناب رحمہ کے ہاتھوں سے کسی نے کڑے نہیں کھینچے تھے لیکن ایوبِ کربلا کی بہنوں کے ہاتھوں سے کڑے بزور اتارے جا رہے ہیں۔ جناب رحمہ کے سر کو کسی نے نوکِ نیزہ سے زخمی نہیں کیا ہے مگر ایوبِ کربلا کی پھوپیاں اور بہنیں چہار طرف بھاگی پھر رہی ہیں اور اُن کے سروں کو نوکِ نیزہ سے زخمی کیا جا رہا ہے۔ جناب رحمہ کے گھر کو کسی نے آگ نہیں لگائی تھی لیکن ایوبؑ کربلا کے حرم کے خیام جلا کر خاکستر کر دیئے گئے ہیں۔ بی بیاں سراسیمگی کے عالم میں خیموں کے بلند ہوتے ہوئے شعلوں میں سے نکل نکل کر صحرا میں پناہ ڈھونڈتی پھر رہی ہیں۔ حضرت ایوبؑ بیمار ہی تھے۔ کسی نے اُن کے نیچے سے بستر نہیں گھسیٹا تھا کہ آپ موہنہ کے بل خاک پر پڑے ہوں حضرت ایوبؑ کا کوئی باپ، چچا، بھائی بھوکا پیاسا ذبح نہیں کیا گیا تھا۔ وہ گھروں سے بے گھر نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی کسی چھوٹی سی معصوم بہن کے کانوں کی چری ہوئی لوؤں سے بہتا ہوا خون نہیں دیکھا تھا۔ اپنی کسی بھوکی پیاسی بچی کے کرتے میں آگ لگی ہوئی نہیں دیکھی تھی۔ انہوں نے دہشت سے بچوں کو فریاد کرتے اور بابا بابا! کہتے نہیں سُنا تھا۔ اُن کے سامنے کوئی شیرخوار بچہ میدانِ جنگ میں ایک گھونٹ پانی کے بدلے اپنا ننھا سا گلا ایک شقی کے تیرِ ظلم سے چھدا کر بے جان نہیں ہوا تھا۔

ایوبؑ کربلا کے غمگسارو! ایسے مصائب پر صبر و شکر کرنے کے لئے نبوت کو نہیں بلکہ امامت کو منتخب کیا گیا۔ چنانچہ منقول ہے کہ جس وقت امام رخصت کے لئے آئے ہیں تو سیدِ سجادؑ بے ہوش پڑے تھے بازو پکڑ کر سورۂ حمد پڑھی۔ کچھ ہوش میں آئے تو فرمایا:۔

کیوں کیسی طبیعت ہے مرے لال کی عرض کہ الطاف الٰہی سے بہتر حال

کچھ اپنا بیاں کیجئے یا شاہِ خوش اقبال فرمایا نہیں کہنے کے قابل مرا احوال

بیٹا سجّادؑ! غریب الوطن مسافروں کا بھی کوئی حال ہو سکتا ہے؟ بس جب تک مرضی خدا ہے جی رہے ہیں۔ جلد یا بدیر سبھی کو اس جہانِ فانی سے کوچ کرنا ہے یہ سن کر عرض کی کہ بابا جان آپ اس وقت تنہا کیسے تشریف لائے۔ فرمایا کہ اب یہ سمجھ لو کہ سوائے میرے اور تمہارے خاندان میں کوئی باقی نہیں ہے۔ تو سیّد سجّادؑ نے کہا اینَ اینَ۔ حبیب ابنِ مظاہر۔ فرمایا قتل َ۔ اینَ اینَ مسلم ابنِ عوسجہ۔ فرمایا قتلَ۔ پوچھا اینَ اینَ زہیر ابن قین۔ بریر ہمدانی۔ فرمایا قتلَ۔ اینَ اینَ عمّی ابوالفضل العبّاسؑ۔ تو فرمایا قتلَ۔ اینَ اینَ قاسمؑ تو فرمایا قتلَ۔ پھر پوچھا اینَ اخی علی الاکبرؑ

تو مولاؑ نے اس موقع پر قتل کہنا مناسب نہ سمجھا بلکہ فرمایا، بیٹا! سمجھ لو کہ مردوں میں میرے اور تمہارے سوا اب کوئی نہیں۔

خالی ہوا سادات کا گھر تین پہر میں سب بھر گیا داغوں سے جگر تین پہر میں
مُرجھا گئے سارے گل تر تین پہر میں دُنیا سے کیا سب نے سفر تین پہر میں

ڈھونڈا جسے وہ صاحبِ شمشیر نہیں ہے
اب بیشۂ حیدرؑ میں کوئی شیر نہیں ہے

یہ میری قبا پر علی اکبرؑ کا لہو ہے بازو پہ گلوئے علی اصغرؑ کا لہو ہے
سینے پہ یہ سب قاسم بے پر کا لہو ہے دامن پہ یہ عبّاسِ دلاور کا لہو ہے

باعث یہ ہے کپڑے جو مرے خوں میں بھرے ہیں
دم توڑ کے یہ سب میری گودی میں مرے ہیں

تم سے یہ وصیّت ہے کہ بے صبر نہ ہونا جب قید سے چھوٹو گے تو پھر باپ کو رونا
ہاتھ تو تکیہ ہو یہ پہلو ہو بچھونا زنداں میں جو بستر نہ ملے خاک پہ سونا

راحت یہی آئین سرافرازی یہی ہے
انجام یہی خاک ہے آغاز یہی ہے

فرما کے یہ استقامت کئے تعلیم
سنتا رہا سر خم کئے وہ جادۂ تسلیم

کی عرض اسیری سے نہیں کچھ خطر و بیم
یہ قید بھی عزت یہ سلاسل بھی ہے تکریم

کانٹوں پہ رسن بستہ گزر جائے گا خادم
سب ہوگا پہ حضرت کو کہاں پائے گا خادم

فرمایا کہ اللہ تمہاری مشکل آسان کرے اور صبر و استقامت عطا فرمائے۔ بیٹا! جب تم قید سے چھوٹ کر مدینہ جانا تو ہمارے دوستوں کو ہمارا اسلام پہونچانا اور یہ پیغام دینا کہ جب بھی وہ پانی پیئں تو ہماری پیاس کو نہ بھولیں خصوصاً میرے ششماہے شیرخوار کی تین روز کی پیاس کو ضرور یاد کرلیا کریں کہ جس کی سوکھی ہوئی زبان کو دیکھ کر دشمن بھی آبدیدہ ہوگئے تھے مگر ظالموں نے پھر بھی اسے تیر کا نشانہ بنا دیا اور وہ بھوکا پیاسا خون میں نہا کر میری آغوش میں تڑپ تڑپ کر دم توڑ گیا۔ اور

قسمت تمہیں دکھلائے جو پیغمبر کی قبر
کہنا مری جانب سے کہ یا شافع محشر

اک دم مجھے راحت نہ ملی آپ سے چھٹ کر
عاشور کو حضرت کا نواسہ ہوا بے سر

جو دین تھا مجھ پر وہ ادا ہوگیا نانا
میں آپ کی امت پہ فدا ہوگیا نانا

چھٹی مجلس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین محمد ن المصطفٰے والہ الطیبین الطاھرین المعصومین

امابعد فقد قال اللہ تبارک وتعالٰی فی کتابہ المجید وفرقانہ الحمید وقولہ الحق ہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ یا ایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین ہ

خداوند تعالٰی ایمان لانے والوں سے فرماتا ہے کہ "اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔"

گزشتہ مجالس میں ہم نے قرآنِ حکیم کی روشنی میں صادقین کو تلاش کیا اور یہاں تک پہنچتے پہنچتے ہم مندرجہ ذیل نکات سے گزرے ہیں:۔

(۱) حقیقت کے مطابق اظہار کرنا بشرطیکہ احقاقِ حق کے لئے ہو صدق ہے بدنیتی سے ہو تو جھوٹ ہے۔

(۲) خلافِ حقیقت بیان جبکہ ہدایتِ خلق کے لئے ضروری ہو، جھوٹ نہیں بلکہ مکر و تقیہ ہے۔

(۳) ہادیانِ دین کا ہر حرکت و سکون نفسِ انسان پر گہرے نقوش بٹھانے کیلیے مظاہرہ ہوتا ہے جو حقیقت نہیں ہوتا۔

(۴) لا الٰہ الا اللہ کہنے والوں کو قرآن میں یا ایھا الذین اٰمنوا یعنی اے ایمان لانے والو ہی کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے مگر اکثر کی جو کیفیات بیان کی ہیں

وہ قابلِ مذمت ہیں۔

(۵) قرآن یہودیوں کے ایسے گروہ کی نشاندہی کرتا ہے جو تخریبِ اسلام کے لئے مسلمان ہوا اور اُس نے بے شمار خلافِ عقل و فطرت باتیں مسلمان علماء تک پہنچائیں جو حماقت پر مبنی ہونے کے باوجود اب بھی علمِ دین میں شامل ہیں اور اکثر علماء ان پر ایمان رکھتے ہیں۔

(۶) قرآن کی رُو سے ایمانِ حقیقی کی پہچان حُبِّ شدید ہے اور حُبِّ شدید کی علامت "وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ" ہے یعنی نام سُنتے ہی دل لرز جائے۔

(۷) قرآن میں ایسے مومنین کا ذکر ہے جو رسولؐ کے ساتھ ایمان میں شریک ہیں حضرت ابو طالبؑ ان میں شامل ہیں اور اُن کے ایمان کی قسم قرآن نے اس طرح کھائی ہے "لا اقسم بھٰذا البلد و انت حلّ بھٰذا البلد و والد وّما ولد" (ترجمہ: قسم ہے اس شہر کی اور تم اس میں رہتے ہو اور ایک باپ اور بیٹے)

(۸) صنم پرستی کیا ہے؟ صنم کیا ہے؟ ۔ سب سے بڑا صنم ہوائے نفس ہے اور اس کی پرستش شرک ہے اور شرک ظلم عظیم ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹوں کے لئے ہر طرح کے شرک خفی و جلی سے محفوظ رہنے کی دُعا کی ہے اور ایسے حضرات پیدائش ہی سے معصوم و مومن ہیں اسلئے کہ اُن کو ایمان کی طرف بُلانے والا بجز اُن کے رب اور اُنکے ضمیر کے اور کوئی دوسرا نہیں۔ وہ اپنے ایمان کے خود آپ ہی داعی ہیں اور اُن کی ایک صفت یہ ہے کہ اُن کے بعض بعض میں سے ہیں۔

(۹) تمام مذاہب میں صرف اسلامی نماز ہی ایسی ہے جو تقسیمِ توجہ کے ساتھ ذکرِ الٰہی کی تعلیم دیتی ہے اور ہماری نماز نے "ہتھ کار دل مَن یار دَل" کا عجیب نسخہ مہیا فراہم کیا ہے۔

(۱۰) سورۂ بقرہ رکوع ۲۲ کی پہلی آیت لیس البّران تولّوا..... ھم المتقون ہ
کے آخری جُز و " والصّٰبرین فی البأساءِ والضرّاءِ وحین البأس "
(اور صبر کرنے والے تنگی میں، بیماری و پریشانی میں اور لڑائی کی سختی میں) کی
اس صفت کو ہم نے شبِ ہجرت تلواروں کے سائے میں سوتے ہوئے امیرالمومنینؑ
میں دیکھ لیا ہے۔ آیئے اس سلسلے میں غزوۂ بدر کا جائزہ لیں تاکہ ان اشخاص
کی نشاندہی ہو سکے جو اُن صفات سے مُتصّف ہیں جن کا ذکر آیہ مذکور میں کیا گیا ہے۔

غزوۂ بدر کا اصل سبب عمرو ابنِ الحضرمی کا قتل تھا۔ یہ اس طرح وقوع پذیر ہوا
کہ ہجرت کے بعد قریش مسلسل مدینہ کی تباہی و بربادی کی تدبیریں کیا کرتے تھے۔
اُن کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں مدینہ کے اطراف میں گشت لگایا کرتیں اور چراگاہوں سے
جو بھی مال مویشی ملتے اُن کو لوٹ لے جاتیں۔

رجب ۲ھ کو آنحضرتؐ نے عبداللہ بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ
بطنِ نخلہ کی طرف بھیجا۔ یہ مقام مکّہ اور طائف کے درمیان واقع ہے۔ آپؐ نے عبداللہ
کو ایک خط دیکر فرمایا تھا کہ دو دن کے بعد اُس کو کھولنا۔ جب وہ وقتِ مُعیّنہ پر کھولا گیا
تو اُس میں لکھا تھا " نخلہ میں قیام کرو۔ قریش کے حالات کا پتہ لگاؤ اور اطلاع دو۔"
اتفاق سے چند آدمی جو شام سے تجارت کا مال لا رہے تھے سامنے سے نکلے۔ عبداللہ
نے اُن پر حملہ کر دیا اور نتیجہ میں عمرو ابن الحضرمی مارا گیا۔ یہ عبداللہ حضرمی کا بیٹا تھا جو
حرب بن اُمیہ یعنی معاویہ کے دادا کا حلیف تھا۔ گرفتار ہونے والوں میں عثمان اور
نوفل، مغیرہ کے پوتے بھی تھے۔ عبداللہ جب مالِ غنیمت لے کر آنحضرتؐ کی خدمت
میں حاضر ہوئے تو تمام قصّہ سُنایا۔ جس پر آپ برہم ہوئے اور مالِ غنیمت لینے
سے انکار کر دیا۔

ان ہی دنوں میں قریش کا ایک بڑا تجارتی قافلہ ابوسُفیان کی سرداری میں

شام کی طرف گیا ہوا تھا۔ جب اُس کو اس واقعہ کی خبر ملی تو وہ بہت خوفزدہ ہوا اور جلد جلد مقام نقرہ پر پہنچا تو اُس نے ضمضم ابن عُمر خزاعی کو کچھ اُجرت دے کر ایک اونٹنی دی اور ہدایت کی کہ ناقہ کی ناک میں نکیل ڈالدے، اس کے کان کاٹ دے اور اپنا کپڑا آگے پیچھے سے پھاڑ ڈالے اور تیزی سے مکہ پہنچکر اپنا رُخ اونٹنی کی دُم کی جانب کر کے باآواز بلند قریش کو یہ سُنائے "اے آلِ غالب! اے آلِ غالب! الطیمہ۔ لطیمہ!!! یعنی قافلہ لُٹ گیا۔ قافلہ لُٹ گیا۔ خبر لو۔ خبر لو۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم خبر نہیں لیتے اور وہاں محمدؐ اور نوجوانانِ یثرب تمہارے قافلہ کے لوٹنے پر مستعد ہیں۔"

الغرض جب یہ ماجرا اسی طرح ضمضم ابن عُمر خزاعی نے اہلِ مکہ کو سُنایا، جن کو عُمر ابن الحضرمی کے قتل کی خبر پہنچ چکی تھی، تو قریش کی آتشِ غضب بھڑک اُٹھی اور وہ سب اکٹھا ہو کر جنگ کی تیاریاں کرنے لگے۔ اور ایک ہزار کی جمعیت لیکر بدر کی طرف روانہ ہوئے۔

اُدھر آنحضرت نے اپنے اصحاب کو جمع کیا اور فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے اُن سے وعدہ کیا ہے کہ دو گروہوں میں سے ایک پر فتح دے گا یا ابوسُفیان کا قافلہ تجارت یا اعیانِ قریش۔ پس تم لوگ مدینہ سے نکل پڑو۔ یہاں مُشککین کو یہ وسوسہ ہو سکتا ہے کہ کیا رسولؐ کو پتہ نہ تھا کہ کیا واقعہ ہوگا جو دو میں سے ایک کی خبر دے رہے ہیں۔ تو یہ خبر رسولؐ نہیں دے رہے بلکہ خود خُدا دے رہا ہے جیسا کہ سورۂ انفعال رکوع میں ہے "واذ یعدکم اللّٰہ احدی الطائفتین (آیت۔۷)

دوسرا اُمرِ خاص یہ ہے کہ جنگ کے اصولوں میں سے ایک اُصول یہ ہے کہ اصل مقصد کو ظاہر نہ کیا جائے تاکہ دشمنوں تک اطلاع نہ پہنچ سکے۔ اسی اُصول کی مسلمانوں کو تعلیم دی جارہی ہے۔ یہ بھی ایک خاص راز ہے۔

بہرحال آنحضرتؐ نے تین سو تیرہ اصحاب کو لے کر بدر کے قریب قیام کیا

اور دو اشخاص کو بطور جاسوس ابوسفیان کے قافلہ تجارت کی خبر لانے کے لئے بھیجا۔ یہ دونوں چاہ بدر پر وارد ہوئے۔ سواریاں بٹھائیں۔ جب پانی پینے لگے تو وہاں دو لونڈیوں کو آپس میں لڑتے سُنا کہ اُن میں سے ایک اپنے درہم کا دوسری سے مطالبہ کر رہی تھی۔ اور دوسری کہہ رہی تھی کہ قریش کا تجارتی قافلہ کل فلاں مقام پر ٹھہرا تھا اور کل یہاں آجائے گا۔ میں اُن کی خدمت کروں گی اور جو اجرت ملے گی اُس سے تیرا درہم ادا کر دوں گی۔ دونوں حضرات یہ خبر آنحضرتؐ کی خدمت میں لائے اور جو کچھ ہوا تھا بتلا دیا۔ اُدھر ابوسفیان اپنے قافلہ کے ساتھ جب بدر کے نزدیک ہوا تو قافلہ کو چھوڑ کر تیزی سے چشمہ بدر پر پہنچا۔ وہاں اُس کو ایک شخص ملا اور بتلایا کہ اُس نے آج یہاں دو سوار دیکھے تھے ابوسفیان اونٹوں کے ٹھہرنے کی جگہ پر آیا اور مینگنیاں اُٹھا کر توڑیں تو اُن میں کھجور کی گٹھلیاں پائیں۔ وہ سمجھ گیا اور بولا کہ واللہ یہ محمدؐ کے جاسوس تھے۔ یہ کہہ کر وہ اُلٹے پاؤں بھاگا اور قافلہ کو جا کر حکم دیا کہ وہ مقرر کردہ راستہ کو چھوڑ کر اب سمندر کے کنارے کنارے ہولیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اُدھر جناب رسولِ خداؐ کو وحی ہوئی کہ قریش کا قافلہ تو نکل گیا ہے اور اب آپ کو قریش سے جنگ کرنے کا حکم ہے جو تجارتی قافلہ کی حمایت میں آن پہنچے ہیں اور یہ کہ آپ سے خداوند تعالیٰ نے نصرت کا وعدہ کیا ہے۔

اس وقت آنحضرتؐ چشمہ صفرا کے کنارے اُترے ہوئے تھے۔ آپؐ نے چاہا کہ اپنے ساتھیوں کی آزمائش کریں کیونکہ گھر میں بیٹھے بیٹھے تو سب نے آنحضرتؐ کو مدد دینے کے لمبے چوڑے وعدے کئے تھے۔ پس آنحضرتؐ نے خداوند تعالیٰ کے حکم سے سب کو مطلع فرمایا۔

یہ سُننا تھا کہ اصحابِ رسولؐ کے رنگ فق ہو گئے اور خوف کے مارے بُرا حال

ہو گیا۔ ایک بزرگوار اُٹھے اور بولے کہ یا رسُول اللہ! یہ قریش ہیں اور تکبّر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ جب سے کافر ہوئے کبھی ایمان نہیں لائے اور جب سے عزّت پائی کبھی ذلیل نہیں ہوئے اور آج تک لڑائی کے لیے گروہ بندی کر کے باہر نہیں نکلے۔ آنحضرتؐ نے ان حضرت کو بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ اس مرتبہ ایک اور حضرت اُٹھے اور ویسے ہی کلمات ادا کیے جیسے کہ پہلے حضرت نے کیے تھے۔ ان کو بھی بیٹھ جانے کا اشارہ ملا۔ پھر حضرت مقداد کھڑے ہوئے اور پُرجوش لہجے میں بولے "یہ قریش ہیں اور تکبّر میں ڈوبے ہوئے ہیں تو ہوا کریں۔ ہم تو آپ پر ایمان لائے ہیں اور آپ کی تصدیق کر چکے ہیں۔ اور ہم تو اس بات کی گواہی دے چکے ہیں کہ جو کچھ آپ لائے ہیں وہ برحق ہے اور اللہ کے پاس سے ہے۔ بخدا! اگر آپ ہم کو حکم دیں کہ ہم آگ میں کود پڑیں تو ہم ایسا ہی کریں گے۔ اور اگر یہ حکم کریں کہ خاردار جھاڑیوں میں گھس جائیں تو ایسا ہی ہوگا۔ اور ہم آپؐ سے وہ فقرہ نہیں کہیں گے جو بنی اسرائیل نے موسیٰؑ سے کہا تھا کہ فاذھب انت وربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون (ترجمہ: ہم یہاں بیٹھے رہتے ہیں تم اور تمہارا رب جاؤ اور لڑو)۔ بلکہ ہم تو آپؐ سے عرض کریں گے کہ "اذھب و ربک فقاتلا انا معکم مقاتلون" (ترجمہ: چلیئے آپ اور آپ کا پروردگار لڑے۔ ہم بھی آپ کے ساتھ لڑنے والوں میں سے ہوں گے)۔

آنحضرتؐ نے مقداد کو دُعائے خیر دی۔ اس کے بعد سعد بن معاذ اُٹھے اور ایسی ہی پُرجوش تقریر کی۔ آنحضرتؐ نے ان دونوں کی تقریروں کو سُن کر فرمایا گویا میں سرداران قریش کے قتل ہونے کی جگہوں کو دیکھ رہا ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دو گروہوں میں سے ایک پر کامل کامیابی کا وعدہ فرمایا ہے اور وہ اپنے وعدہ کے خلاف ہرگز نہیں کرتا۔

پس جنابؐ نے کوچ کا حکم دیا اور شام تک چشمۂ بدر کے کنارے پہنچ کر پڑاؤ ڈالا۔ اُدھر سے قریش بھی آگئے اور وہ یمنی پڑاؤ پر اُترے۔ انھوں نے اپنے غلاموں کو پانی لانے کے لیے بھیجا۔ اصحاب رسولؐ نے اُن کو پکڑ کر قید کر لیا اور پوچھا تم کون ہو۔ انھوں نے کہا، ہم قریش کے غلام ہیں جب اُن کو آنحضرتؐ کے سامنے لایا گیا تو جنابؐ نے قریش کی تعداد کے متعلق سوال کیا۔ انھوں نے کہا خبر نہیں۔ پھر آپؐ نے دریافت فرمایا روزانہ کتنے اونٹ نحر کیے جاتے ہیں تو انھوں نے عرض کی نو سے دس تک۔ تب آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تعداد اُن کی نو سو سے کم نہیں اور ایک ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔

قریش کو جب یہ خبر پہنچی تو وہ خوف زدہ ہوئے۔ عتبہ بن ربیعہ ابوالبختری، ابن ہشام سے ملنے گیا تو اُس نے کہا کہ بھلا تم نے یہ زیادتی دیکھی۔ خدا کی قسم مجھے تو چلنے کی جگہ بھی نہیں سوجھتی۔ ہم تو اپنے تجارتی قافلہ کی حمایت کے لیے نکلے تھے اور وہ راستہ بدل کر چلدیا لہٰذا اب ہمارا آگے بڑھ کر آنا محض ظلم و زیادتی ہے۔ خدا کی قسم جس قوم نے زیادتی کی کبھی فلاح نہیں پائی اور مجھے تو یہ ہی اچھا معلوم ہوتا ہے کہ قافلہ میں اولادِ مناف کا جتنا بھی مال ہوتا اور وہ سب ہی تلف ہو جاتا لیکن ہم اس راستہ نہ آتے۔ ابن ہشام نے کہا آپ سردارانِ قریش میں سے ایک ہیں۔ ذرا چل پھر کر لوگوں سے گفتگو کیجیے اور جس تجارتی قافلہ کو محمدؐ اور اُن کے اصحاب نے مقامِ نخلہ پر نقصان پہنچایا تھا اُس نقصان کی اور ابن حضرمی کے خون کی ذمہ داری لے لیجیے کہ وہ آپ کا حلیف تھا۔ عتبہ نے کہا یہ رائے صحیح ہے اور کوئی بھی میری مخالفت نہیں کرے گا سوائے ابوجہل کے۔ تم جاؤ اور اُس کو اس کی خبر کر دو کہ میں تمام نقصان اور ابن حضرمی کی دیت کا ذمہ لیتا ہوں۔ ابوجہل کو جب یہ سب کچھ بتلایا گیا تو آپے سے باہر ہو گیا۔ عتبہ کو

بہت برا بھلا کہا اور کہا کہ لات و عزیٰ کی قسم ہرگز ہرگز ایسا نہیں ہوگا جبتک کہ ہم یثرب پہنچکر اُن پر ہجوم نہ کریں اور اُن کو قید نہ کرلیں اور مکہ میں اُن کو قیدی کی حیثیت سے لے کر نہ آئیں۔

ادھر اصحابِ رسولؐ کا قریش کے گروہ کی کثرت کی خبر سے مارے ڈر کے برا حال تھا اور کچھ لوگ رو پیٹ رہے تھے، استغاثہ کر رہے تھے۔ ایسے وقت خداوند تعالیٰ نے اپنے رسولؐ پر یہ آیتیں نازل فرمائیں " اذ تستغیثون ربکم فاستجاب لکم انی ممدکم بالف من الملئکۃ مردفین○ وما جعلہ اللہ الا بشریٰ ولتطمئن بہ قلوبکم وما النصر الا من عند اللہ ط ان اللہ عزیز حکیم ○ (سورۂ انفال آیت ۹، ۱۰) (یہ وہ وقت تھا) جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کر رہے تھے تو اُسنے تمہاری فریاد سُن لی اور جواب دیا کہ میں تمہاری لگاتار ہزار فرشتوں سے مدد کروں گا اور (یہ امداد غیبی) خدا نے صرف تمہاری خوشی کے لئے کی تھی تاکہ تمہارے دِل مطمئن ہوجائیں اور (یاد رکھو کہ) مدد خدا کے سوا کسی اور کے یہاں سے کبھی نہیں ہوتی۔ بے شک خدا غالب اور حکمت والا ہے)۔

جب رات خوب ہوگئی اور اصحابِ رسولؐ کو نیند آگئی تو اللہ نے اُن کے مقام پر تو صرف اتنا پانی برسایا کہ ریت میں قدم جم سکیں مگر قریش پر یہ بارش لگاتار ہی یہانتک کہ اُن کی طرف کی زمین دلدل بن گئی۔ وہ لوگ شب خون مارے جانے کے خوف سے شب بھر نہ سو سکے۔ خداوند تعالیٰ نے گروہ قریش کے دلوں میں رعب ڈالدیا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " سالقی فی قلوب الذین کفروا الرعب (عنقریب ہم ڈال دیں گے کافروں کے دلمیں رُعب)۔ (انفال آیت ۱۲)

اصحاب رسولؐ کی حد سے بڑھتی ہوئی پریشانی کو دیکھ کر اُن کی تسلی کیلئے خداوند تعالیٰ نے ایک اور آیت نازل فرمائی " وان جنحوا للسلم فاجنح

لها و توکل علی الله'' (انفال آیت ۶۱) (اگر کفار صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو اور خدا پر بھروسہ رکھو)۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے ایک شخص کو قریش کے پاس یہ کہلا کر بھیجا کہ لے گروہ قریش مجھے عرب میں سب سے زیادہ یہ ناگوار ہے کہ پہلے پہل میری لڑائی تم سے ہو۔ پس تم مجھے اور عرب کو چھوڑ دو۔ اگر میں سچا ہوں تو میرے سبب سے تمہاری عزت بڑھے گی اور اگر میں جھوٹا ہوں تو میرا کام تمام کرنے کو یہ عرب کے بھیڑیے ہی کافی ہوں گے۔ تم اپنی عزت و آبرو کے ساتھ یونہی واپس لوٹ جاؤ۔ عتبہ نے جب یہ سنا تو کہا کہ واللہ جن لوگوں نے ایسی بات رد کی انھوں نے کبھی فلاح نہیں پائی۔ پھر ایک سرخ اونٹ پر سوار ہو کر تمام لشکر میں گھومتا پھرا اور اُن کو لڑائی سے رکنے اور صلح کرنے پر تقریر کی۔ عتبہ کا کلام سن کر ابوجہل کو سخت غصہ آیا اور کافی زبان درازی کے بعد عتبہ سے کہا کہ تو اولادِ مطلب کی تلواریں دیکھ کر ڈر گیا حالانکہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ہم اپنے خون کا بدلہ لے سکتے ہیں۔ عتبہ اپنے اونٹ سے اُترا اور ابوجہل پر جھپٹ پڑا۔ لوگوں نے بمشکل چھڑایا تو عتبہ نے ابوجہل سے کہا کہ تُو مجھ جیسے آدمی پر بزدلی کا الزام لگاتا ہے قریش کو ابھی معلوم ہو جائے گا کہ ہم میں سے بزدل، بخیل اور اپنی قوم کے لئے سب سے زیادہ مفسد کون ہے؟۔ اس کے بعد اپنے بھائی شیبہ اور بیٹے ولید کی طرف نظر ڈالی اور بولا کہ اُٹھو!! خود بھی اُٹھا، زرہ پہنی، تلوار اُٹھائی اور پھر تینوں آگے بڑھے۔ آواز دی کہ اے محمدؐ قریش میں سے جو ہمارے ہمسر ہیں اُن کو ہمارے مقابلہ کیلئے بھیجدو!۔ اِدھر سے انصار کے تین آدمی مقابلہ کے لئے نکلے۔ عتبہ نے اُن کا حسب نسب پوچھا تو انھوں نے بتلایا کہ ہم عفرا کے بیٹے عوذ، معوذ اور عون بن خدا اور رسولؐ کے انصار ہیں۔ عتبہ نے کہا تم لوٹ جاؤ۔ ہم تو قریش میں سے اپنا ہمسر چاہتے ہیں۔ آنحضرتؐ بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ پہلے حملے میں انصار جائیں۔ چنانچہ اُن کو

واپس بلالیا گیا اور حضرت عُبیدہ ابن حارث ابن عبدالمطلب کی طرف نظر کی۔ اُن کا سن ستر سال کا تھا۔ آپؐ نے فرمایا اے عبیدہ تم عتبہ کی خبر لو۔ پھر حمزہ ابن عبدالمطلب کی طرف دیکھ کر کہا کہ اے چچا آپ شیبہ کی طرف بڑھیں۔ اس کے بعد حضرت امیرالمومنینؑ جو سب سے زیادہ کم سن تھے، اُن سے ارشاد فرمایا کہ تم ولید بن عتبہ کی خبر لو اور اپنا وہ حق حاصل کرو جو خدا نے تمہارے لئے مقرر کیا ہے۔

یہ تینوں حضرات جب پکارنے والوں کے مقابل پہنچے اور اُن کی مبارزت پر اپنا حسب نسب بیان کیا تو عتبہ نے کہا کہ "تم لوگ کفوِ کریم ہو۔ خدا اُس پر لعنت کرے جس نے ہم کو اور تم کو اس جگہ لا کھڑا کیا"۔ اُس کی مراد ابوجہل سے تھی۔

تلواریں چلنا شروع ہو گئیں۔ عبیدہ نے عتبہ کے ایک ایسی ضرب لگائی کہ اُس کے سر کے دو ٹکڑے ہو گئے لیکن اُس کی ضربت سے عبیدہ کی بھی پنڈلی کٹ گئی اور دونوں نیچے آن گرے۔ حمزہ اور شیبہ میں تلواریں اتنی دیر چلیں کہ کُند ہو گئیں اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ اِدھر حضرت امیرالمومنینؑ نے ولید ابن عتبہ پر ایک ایسا بھرپور وار لگایا جو کاندھے سے اُتر کر بغل سے نکل گیا۔ ولید نے اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کو جو جسم سے لٹک رہا تھا جھٹکا دے کر علیحدہ کیا اور حضرت امیرالمومنینؑ کے سر پر بہت زور سے پھینک کر مارا اور ساتھ ہی زمین پر گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔

ولید سے فارغ ہو کر حضرت علیؑ، شیبہ کی طرف جھپٹے اور حضرت حمزہؓ سے کہا کہ آپ اپنا سر جھکا لیں، کیونکہ وہ قد میں شیبہ سے اونچے تھے۔ پھر حضرت علیؑ نے ایک ایسی ضربت لگائی جس سے شیبہ کا آدھا سر اڑ گیا۔ اس کے بعد آپؑ عتبہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس میں ابھی جان باقی تھی۔ آپؑ نے اُس کا بھی خاتمہ کیا اور عبیدہ کو حضرت علیؑ اور حضرت حمزہؓ دونوں اٹھا کر آنحضرتؐ کی خدمت میں لائے۔

اَب جنگ عام شروع ہو گئی۔ انصار میں سے دو جوان بھائی معاذ اور معوذ ابو جہل کی تاک میں تھے انھوں نے اُسے پاتے ہی حملہ کر دیا اور وہ زمین پر خون میں تڑپنے لگا۔ اتنے میں عبداللہ ابنِ مسعود اُس کے پاس پہنچے اور کہا کہ "اللہ کا شکر ہے کہ اُس نے تجھے ذلیل کیا"۔ اس پر ابو جہل نے اپنا سر اُٹھایا اور کہا کہ "خدا نے تجھکو ذلیل کیا۔ بتلا کہ آج دین اور میدان کس کے ہاتھ رہا ہے؟" ابنِ مسعود نے فرمایا کہ اللہ اور اُسکے رسولؐ کے ہاتھ۔ اور میں تجھے قتل کرنے والا ہوں۔ یہ کہہ کر اُس کی گردن پر ایک پاؤں رکھا تو وہ ملعون بولا "آج کے دن مجھے اس سے زیادہ ناگوار اور کوئی بات نہیں کہ ایک چرواہا مجھے قتل کرے"۔ غرض ابنِ مسعود نے اُس کا سر تن سے جُدا کیا اور آنحضرتؐ کی خدمت اقدس میں لا کر پیش کیا۔ آپ سجدۂ شکر بجالائے۔ قریش کے بیشتر سردار اور بہادر قتل ہو چکے تھے یا بھاگ پڑے تھے۔ جنھوں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے انہیں اصحابِ رسولؐ گرفتار کر رہے تھے۔ قریش میں سے کل ستر قیدی بنے اور ستر ہی قتل ہوئے جن میں سے نصف تعداد امیر المومنین حضرت علیؑ کی تلوار سے واصلِ جہنم ہوئی۔ اصحابِ رسولؐ میں سے صرف چودہ شہید ہوئے (اس جنگ کے اکثر اقتباسات مولانا شبلی کی سیرت النبیؐ سے لیے گئے ہیں)۔

بہت سے متعصب یورپین مورخین نے اس جنگ کا حال لکھنے کے بعد حیرت اور تعجب کا اظہار کیا ہے کہ اتنے بڑے لشکر کو تین سو تیرہ (۳۱۳) غیر مسلّح افراد نے کیسے شکست دے دی اور اس کے لئے اُنہوں نے بہت سی فضول تاویلیں پیش کی ہیں۔ پھر یہ بھی خیال ظاہر کیا ہے کہ مکّہ تک تو اسلام کو ایک مذہب سمجھا جا سکتا ہے مگر مدینہ پہنچکر تو وہ سلطنت اور تنظیمِ عسکری ہی رہ گیا۔

بہت سے متشکّکین کو وساوس پیدا ہوتے ہیں کہ رسولؐ کی بعثت کا مقصد تزکیۂ نفوس ہے نہ کہ سلطنت اور تنظیمِ عسکری کا قیام۔

(۱) غور و فکر کرنے والوں کے نزدیک تو ان وساوس کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں۔ وہ تو سمجھ سکتے ہیں کہ حصولِ مقصد کے لئے جو ذرائع اختیار کئے جائیں وہ تکمیلِ مقصد کا ایک جزو ہی ہوتے ہیں۔ اس میں بہت سے راز پوشیدہ ہیں۔ محبوبِ خدا رحمت اللعالمین ہیں تو تمام اقوامِ عالم کو ہدایت کرنا اُن کے ذمّہ ہے لہٰذا تنظیمِ عسکری قائم کر کے اقوامِ عالم کو یہ سبق بھی دیدیا کہ قوم کی زندگی اور بقا کا انحصار تنظیمِ عسکری پر ہے۔ جو قوم تنظیم قائم کرے گی وہ دوسروں پر غالب آئے گی۔

(۲) دوسرا امر یہ ہے کہ تزکیہ کے حصول کی وہی کوشش کر سکتے ہیں جن میں اہلیت ہو۔ دیگر تمام افراد اس نعمت سے محروم ہی رہیں گے۔ رسول رحمت اللعالمین ہیں۔ اُن سے ہر ایک کو فیض پہنچنا ضروری ہے لہٰذا جو لوگ مدارجِ اُخروی کے حصول کے اہل نہیں ہیں اُن کو اتنا ہی فائدہ پہنچ جائے کہ وہ دُنیا میں مادی ترقی ہی کر سکیں جس کے لئے حُریتِ فکر لازمی ہے۔ اور قانونِ فطرت یہ ہے کہ جب نفسِ انسان کسی سے مرعوب ہو جاتا ہے تو قوتِ تنقید زائل ہو جاتی ہے۔ اور جس سے وہ مرعوب ہوتا ہے اُس کا ہر قول و فعل اس کو محبوب ہو جاتا ہے۔ اُسی کی نقل کرنا وہ اپنا فخر سمجھتا ہے۔ ایسی حالت میں حُریتِ فکر کا رہنا ممکن نہیں بلکہ وہ تو ذہنی غلامی کی لعنت میں گرفتار رہتا ہے اور جب تک وہ اُس کے سامنے موجود ہے جس سے کہ وہ مرعوب ہے اُس وقت تک ذہنی غلامی سے آزادی ناممکن ہے۔ تمام دُنیا کا اُس وقت عالم یہ تھا کہ چند خاندانوں نے تمام دُنیا کو غلام بنا رکھا تھا اور حُریتِ فکر مفقود تھی۔ لہٰذا ضروری تھا کہ ایسے بولتے بُتوں کو جنھوں نے اپنے رُعب سے دُنیا کو غلامی میں مبتلا کر رکھا تھا نیست و نابود کر دیا جائے تو مخلوقِ خدا پر یہ بڑا احسان ہوگا۔ پس اس کام کے لئے تنظیمِ عسکری کا قائم ہونا ایک لازمی امر تھا۔ محبوبِ خدا کا اہلِ عالم پر یہ ایک عظیم احسان ہے کہ آپ نے تنظیمِ عسکری کے ذریعے ذہنی غلامی سے آزاد کر کے اُن کو حُریتِ فکر کی نعمت عطا فرمائی۔

(۳) قانونِ فطرت ہے کہ جب کوئی قوم اپنی غلط کاریوں کے باعث تعیّش میں پڑ کر آزادی کی اہمیت کھو دیتی ہے تو اُس پر ایسی قوم کو مسلّط کر دیا جاتا ہے جو نہایت سخت جان اور جفاکش ہو۔ عیش پرستی اور راحت و آرام میں زندگی گزارنے کی یہ سزا ملتی ہے کہ وہ غیر قوموں کی غلامی میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ ایسی اقوام کو خلافِ فطرت اعمال کی سزا دینے کے لیے بھی تنظیمِ عسکری کی ضرورت ہے۔

(۴) قانونِ فطرت یہ بھی ہے کہ جب موت سامنے ہے یہاں تک کہ خوف کے بجائے شوق پیدا ہو جائے تو قوتِ ادراک میں ترقی ہوتی ہے اور عالمِ غیب یا عالمِ نور کا مشاہدہ ہو جاتا ہے اور اس طرح کچھ تزکیہ حاصل ہو جاتا ہے اور ایسے ہی شخص کو شہید کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ عالمِ غیب کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔ یعنی شوقِ شہادت میں نکلنے والوں کے لئے تنظیمِ عسکری تزکیۂ نفس کا ذریعہ ہے۔

(۵) اصل اور عظیم تر مقصد یہ ہے کہ احباب کو تڑپانے کے لئے ذبحِ عظیم پیش کی جائے جو کسی ایک قصبہ یا شہر میں پیش نہیں کی جا سکتی کیونکہ وہ بے فائدہ ہوگی۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ علاقہ اس قدر وسیع ہو جائے جہاں اس پُر درد منظاہرہ کا اثر پھیل سکے لہٰذا اسلامی سلطنت اور اس کی توسیع کی ضرورت تھی۔

رسولؐ و آلِ رسولؐ کو اہلِ عالم کو اپنی محبت کی طرف بُلانا تھا مگر وہ فاتح کی حیثیت سے ملک کی توسیع میں حصّہ نہیں لے سکتے تھے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ فاتح اقوام سے مفتوح کو محبّت نہیں بلکہ نفرت ہوتی ہے۔ پس اس کے لئے تنظیمِ عسکری کا قائم کرنا ضروری تھا جس کے سربراہ اغیار ہوں۔

(۶) آلِ رسولؐ کی قربانیوں کا ذریعہ ایسے عساکر ہو سکتے ہیں جن کے سربراہ رسولؐ و آلِ رسولؐ کے بدترین دشمن ہوں۔ اگر یہ سربراہ غیر مسلم ہوتے تو وہ اہلِ اسلام کو طعن و تشنیع کرتے رہتے کہ دیکھو ہم نے تمہارے پیشوایانِ دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور تمہارا

خدا اُن کی مدد نہ کر سکا۔ اس لیے ضروری تھا کہ وہ تمام عساکر اور اُن کے سربراہ مسلمان ہی ہوں تاکہ اس طرح کی طعن و تشنیع کی کبھی نوبت نہ آسکے۔

(۷) اہلبیتؑ کو تو ہدایت خلق کے لیے بحکم خدا عظیم قربانی پیش کرنا ہی تھی اور اسی کے واسطے بنو امیہ کے لیے حکومت کے ایک ہزار مہینے مقدر کیے گئے۔

بنو امیہ اور بنی ہاشم میں خاندانی دشمنی تو پہلے ہی سے تھی۔ جنگِ بدر میں عتبہ بن ربیعہ (معاویہ کا نانا)، شیبہ بن ربیعہ (معاویہ کے نانا کا بھائی اور ان کی ماں ہندہ جس نے حضرت حمزہ کا کلیجہ چبایا، کا چچا) اور عتبہ کا بیٹا ولید حضرت امیر المومنینؑ، حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہ کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ معاویہ کا ایک بھائی بھی بدر میں مارا گیا۔ لہذا ان میں جو آتشِ انتقام بھڑک رہی تھی وہ اور زیادہ مشتعل ہو گئی جس کا اظہار یزید ملعون نے اس وقت کیا جب سرِ امامِ مظلومؑ اس کے سامنے رکھا تھا اور اہلِ حرم رسن بستہ سر برہنہ دربار میں کھڑے تھے۔ وہ کہنے لگا "کاش میرے وہ آباؤ اجداد جو بدر و اُحد میں قتل ہوئے آج ہوتے اور دیکھتے تو کہتے کہ یزید تیرے ہاتھ کبھی شل نہ ہوں تو نے خوب انتقام لیا"۔

یہ کہنا تھا کہ ایک معظمہ جس نے فاطمہؑ کا دودھ پیا تھا، علیؑ کی گود میں پرورش پائی تھی اور جنابِ رسولؐ خدا کی زبان چوسی تھی، ان کلماتِ ناحق کی تاب نہ لا سکی اور حق کی طاقت کے زور پر اور ہر حالت میں غالب رہنے والی جرأت کے ساتھ گویا ہوئی "حمد ہے واسطے رب العالمین کے۔ صلوٰۃ و درود ہے اس کے رسولؐ پر اور ان کی آلؑ پر۔ خداوند تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے:۔ "پھر بُرا ہوا انجام اُن لوگوں کا جو بُرائی کرتے تھے، خدا کی نشانیوں کو جھٹلاتے تھے اور اُن کا مذاق اُڑاتے تھے"۔ اے یزید! تو نے ہم پر ناکہ بند کر دیا۔ آسمان کی فضا تنگ کر دی یہانتک کہ اہلبیتؑ کی مخدراتِ عصمت کو قید کر کے دیار بہ دیار پھرایا۔ اس وجہ سے کیا تجھے یہ گمان ہو گیا ہے کہ ہم خدا کے

نزدیک ذلیل و خوار ہیں اور تو اُس کی نظر میں مکرّم ہے اور تیرا یہ ظلم جو ہم پر گزرا ہے تو کیا یہ خیال کرتا ہے کہ تجھے اُس کی بارگاہ میں شان و منزلت حاصل ہو گئی ہے اور تو اس گمانِ بد کے سبب متکبّرانہ انداز سے دائیں بائیں دیکھ رہا ہے۔ خوشی سے اپنے شانوں کو حرکت دے رہا ہے اور اترا اترا کر خوش ہو رہا ہے اور اس پر خوش ہے کہ تو نے دُنیا کو اپنے لئے ہموار پایا ہے اور اپنے کام دُرست کر لئے ہیں اور دُنیا کی مملکت و سلطنت تجھ کو بے خار و خلش مل گئی ہے۔ جلدی نہ کر ذرا دم لے۔ کیا تو نے یہ بات فراموش کر دی ہے کہ خدا قرآن میں فرماتا ہے "زنہار یہ گمان نہ کریں کہ ہم نے کفّار کو مہلت دی ہے، اور جو کچھ اُن کو یہ ڈھیل ہے یہ خیر ہے۔ بلکہ ہم اس جماعت کو زمانہ دراز تک چھوڑ رکھتے ہیں تاکہ ان کا گناہ اور بڑھے اور ان کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب موجود ہے"۔ اے طلقا کے بیٹے! فتح مکہ کے دن رسول خدا نے ابوسفیان وغیرہ کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا تھا کہ اذھبوا فانتم الطلقاء۔ (جاؤ تم آزاد غلام ہو) کیا یہ تیرا عدل و انصاف ہے کہ تو نے اپنی عورتوں اور کنیزوں کو پردے میں رکھا ہے اور دخترانِ پیغمبر کو اسیر کر کے تشہیر کرایا ہے اُنکی عزت ضائع کر دی ہے، اُن کو سر برہنہ کر دیا ہے۔ دشمنوں نے ایک شہر سے دوسرے شہر میں اُنھیں پھرایا ہے۔ لوگ اُن کے دامن پر نظر کرتے ہیں اور دور و نزدیک کے لوگ، شریف اور کمینے اُن کے چہروں کو گھور گھور کے دیکھتے ہیں۔ اس پر مصیبت یہ ہے کہ ان بیچاروں کے ساتھ کوئی ان کی حمایت کرنے والا مسلمان نظر نہیں آتا۔ ہاں! اُس شخص سے کیونکر رحم دلی کی اُمید کی جائے جسکے بزرگوں (یزید کی دادی) کے منہ نے پاکیزہ لوگوں کا جگر چبا کر تھوکا ہو اور جس کا گوشت پوست شہیدوں کے خون سے پرورش یافتہ ہو۔ کیوں یہ حالت نہ ہو جو ہمیں بغض و عناد کی اور کینہ کی نظر سے دیکھتا ہے، وہ دشمنی کرنے میں کیا کمی کرے گا اے یزید!

پھر تو بغیر گناہ اور امرِ عظیم کا خیال کئے ہوئے اپنے بزرگوں کو یاد کر کے کہتا ہے کہ تیرے نزدیک یہ منظر دیکھ کر خوشی سے اُچھل پڑتے اور کہہ اُٹھتے کہ اے یزید تیرا ہاتھ شل نہ ہو۔ حالانکہ سردارِ جوانانِ جنت ابو عبداللہ الحسینؑ کے دانتوں سے تو بے ادبی کر رہا ہے۔ اے یزید! تو کیوں نہ خوش ہو، ایسے کلام زبان پر کیوں نہ لائے۔ اس لئے کہ تو نے زخم کو گہرا کر دیا ہے اور شجرۂ طیبہ کو اسکی جڑ سے کاٹ کر پھینک دینے کی کوشش موہوم کی ہے یعنی ذریتِ محمدؐ کا خون بہایا ہے اور آلِ محمدؐ اور اولادِ مطلبؑ کے اُن افراد کو جو مثل ستارہ ہائے زمین تھے قتل کر ڈالا ہے۔ اور اپنے اسلاف کو اپنی کامیابی پر صدا دے رہا ہے۔ پس تو عنقریب اُن سے ملحق ہوگا اور اُس وقت آرزو کرے گا کہ کاش دُنیا میں نہ تیرے ہاتھ ہوتے اور نہ تیری زبان ہوتی۔ تاکہ تو نے جو کچھ کیا وہ نہ کرتا، اور جو کچھ تو نے کہا وہ نہ کہتا۔

اے یزید! قسم بخدا جو کچھ ظلم تو نے کیا ہے وہ اپنے ساتھ کیا ہے۔ تو نے اپنی ہی کھال چاک کی ہے اور اپنا ہی گوشت کاٹا ہے۔ تو رسولؐ خدا کے حضور میں بصورتِ مجرم لایا جائے گا کہ تو نے اُن کی ذریت کا خون بہایا ہے اور اُن کی عترت اور پارہ ہائے جگر کے ناموس کی ہتک حرمت کی ہے۔ اُس وقت خداوندِ عالم اُنکی پریشانی کو دُور کر دے گا، اُن کی پراگندگی کو مبدّل بہ سکون کرے گا اور ستمگاروں سے اُن کا حق لے گا۔ تو ہرگز گمان نہ کر کہ کشتگانِ راہِ خدا مُردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے یہاں طرح طرح کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہیں۔ اور خدا کا انصاف کرنا، پیغمبرِ خدا کا تجھ سے دعویدار ہونا اور جبرئیل کا اُن کی ذریت کی مدد کے لئے مستعد ہونا تیری سزا کے لئے کافی ہے۔ عنقریب وہ شخص جس نے تیرے لئے بساطِ سلطنت بچھائی تھی اور تجھے مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط کیا تھا معلوم کرلے گا کہ ظالموں کا بدلہ بُرا ہوتا ہے اور جائے قیام کے اعتبار سے تم میں

ہے کون بدتر ہے اور کس کے اخوان و مددگار ضعیف تر ہیں۔ اگرچہ گردش زمانہ اور حوادث روزگار نے مجھے تجھ سے ہمکلام کر دیا ہے اور اگر تجھ سے اس دلیری سے ہمکلام ہونا مجھ پر ستم ڈھائے پھر بھی میں تجھ کو حقیر ہی سمجھتی ہوں اور سمجھتی رہوں گی۔ اور میں اپنی سرزنش اور شماتت کو جو تو ہمارے ساتھ عمل میں لا رہا ہے بہت عظیم جانتی ہوں اور جانتی رہوں گی۔ افسوس ہے کہ آنکھیں گریاں ہیں اور سینے آتش غم سے جل رہے ہیں۔ بظاہر تو یہی ہے کہ رحمان کا لشکر شیطان کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ ہمارا خون ہمارے دشمنوں کے ہاتھوں سے ابھی ٹپک رہا ہے اور اُن کے دہنوں سے ہمارے گوشت کی رطوبت جاری ہے اور صحرا کے بھیڑیئے اُن پاکیزہ اجساد کا طواف کر رہے ہیں۔

اے یزید! اگر تُو نے ہم کو آج تباہ کر کے غنیمت پائی ہے تو کل قیامت کے دن خسارے میں پڑے گا جبکہ تُو سوائے اپنے اعمالِ بد کے اور کوئی چیز وہاں نہ پائے گا۔ حق تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ خدا ہی سے شکایت ہے اور اُسی پر اعتماد ہے۔ اے یزید! جتنا کید و مکر چاہے کئے جا اور اپنی کوشش سے باز نہ آ۔ اور ستم کو اپنا نصب العین بنا لے لیکن خدا کی قسم تو ہمارا ذکر صفحۂ جہان سے محو نہیں کر سکتا اور اس واقعہ کا ننگ و عار تجھ سے دُھل نہیں سکتا۔ تیری رائے سُست ہے اور تیری زندگی صرف گنے ہوئے دن ہیں۔ اور تیرا ذخیرہ اُس دن صرف پریشانی ہو گی جس دن منادی ندا کرے گا کہ ظالموں پر خدا کی لعنت۔"

عزادارو! شیرِ خدا کی بیٹی نے یہ خطبہ یزید ملعون کے دربار میں دیا۔ وہ دربار جو تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جہاں امراء و سفراء کا اژدہام تھا اور سات سو کرسی نشینوں کے درمیان اسیرانِ کربلا اس طرح سے لائے گئے تھے کہ بی بیوں کے ہاتھ پس گردن سے بندھے ہوئے تھے اور وہ اپنے چہروں کو بالوں سے چھپائے ہوئے شرم سے سر جھکائے کھڑی تھیں۔ یزید ملعون تخت پر بیٹھا شراب

پی رہا تھا اور تخت کے نیچے طشت میں سر امامؑ مظلوم رکھا تھا۔ یزید نے شمر سے کہا کہ عورتوں کو زینبؑ کے گرد سے ہٹا دے۔ شمر آیا تو ایک بوڑھی کنیز اپنی شاہزادی سے اور نزدیک ہو کر بیٹھ گئی۔ شمر نے تازیانہ اٹھایا اور چاہا کہ فضہ کو مارے کہ فضہ کی نگاہ یزید کی پشت پر پڑی جہاں بہت سے حبشی تلواریں حمائل کئے کھڑے تھے۔ فضہ نے انھیں مخاطب کر کے کہا، "حبشیو! تمہاری عزت و حمیت کیا ہوئی۔ میں تمہاری قوم کی ہوں اور یہ شمر مجھ کو تازیانہ مارتا ہے۔" بس اتنا کہنا تھا کہ سارے حبشی تلواریں سونت کر سامنے آگئے اور یزید سے کہنے لگے کہ شمر کو منع کرے ورنہ اسی وقت دربار میں خون کا دریا بہنے لگے گا۔ حسینؑ کے عزادارو! فضہ تو بچ گئی مگر ثانیٔ زہرا کا دل ٹوٹ گیا۔ نجف کی طرف مونہہ کر کے کہنے لگیں "بابا فضہ کو بچانے کے لئے اتنی تلواریں کھنچ گئیں لیکن آپ کی بیٹیوں نے کربلا سے شام تک نہ جانے کتنے تازیانے کھائے مگر کسی نے نہ کہا کہ یہ علیؑ کی بیٹیاں محمدؐ کی نواسیاں ہیں۔" آپ کا یہ کلام سُن کر دربار کا نقشہ درہم برہم ہونے لگا۔ یزید نے جب دیکھا کہ دربار کا رنگ بگڑ رہا ہے اور لوگ برہم ہیں تو فوراً اہلِ حرم کو قید کرنے کا حکم دیا چنانچہ ایک نہایت بوسیدہ اور تنگ و تاریک قید خانے میں اسیروں کو قید کر دیا گیا۔

جب زندان میں جنابِ سکینہ انتقال کر گئیں تو شام کے کچھ لوگ یزید کے پاس آئے اور کہا کہ اے یزید تو نے فاطمہ زہرا کا باغ اجاڑا اور خاندانِ رسولؐ کو برباد کیا پھر بھی تیرے دل کی آگ نہ بجھی۔ اب ان بے کسوں بے وارثوں کو رہا کر دے ورنہ تیرے اور ہمارے درمیان تلوار چلے گی۔ یہ سُن کر یزید گھبرایا کہ ایسا نہ ہو کہ شامی اس کے خلاف ہو جائیں چنانچہ اس نے حضرت سجادؑ کو بلایا۔ جب آپؑ تشریف لائے تو کھڑا ہو گیا اور تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ امام کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ آپؑ نے فرمایا "اے یزید کل اسی تخت کے نیچے طشت میں میرے مظلوم باپ کا سر رکھا تھا

کیونکر ممکن ہے کہ آج میں اس تخت پر بیٹھوں۔" یزید کہنے لگا "میں نے آپ کو اس لیئے بلایا ہے کہ آج آپ کو رہائی کا حکم دوں۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ میں چاہتا ہوں کہ حسینؑ کا خوں بہا بھی ادا کروں۔ میرے خزانے آپ کے لیئے کھلے ہوئے ہیں جتنا مال درکار ہوے لیجیے۔" یہ سنکر عابد بیمارؑ رونے لگے اور فرمایا "اے یزید حسینؑ کا خوں بہا لینے والا میں کون ہوں۔ یہ خوں بہا روز محشر حضرت رسولؐ خدا کو دینا، جنھوں نے اپنی زبان چسا چسا کر حسینؑ کو پالا تھا اور یہ خوں بہا فاطمہؑ زہرا کو دینا جنھوں نے چکیاں پیس کر حسینؑ کی پرورش کی تھی۔" غرض یزید نے رہائی کا حکم دیا اور عابدؑ بیمار کا وہ آہنی زیور ہتھکڑیاں، بیڑیاں اور طوق خار دار اتار اگیا جس سے آپ کا سینہ شگافتہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد یزید نے کہا اب آپ کو اختیار ہے چاہے یہاں رہیں چاہے مدینہ جائیں۔ بیمار امام زندان میں آئے فرمایا "پھپھی اماں آج یزید نے ہم کو رہا کر دیا ہے بتلایئے آپ یہاں رہنا چاہتی ہیں یا مدینہ جانا چاہتی ہیں۔" فرمایا "بیٹا سید سجادؑ مدینہ جانا چاہتی ہوں وہاں میری ایک بیمار بھتیجی ہے جو میرا انتظار کر رہی ہوگی مگر بیٹا ہم ابھی تک اپنے شہیدوں کو جی بھر کر نہیں رو پائے کیونکہ رونے کی اجازت نہ تھی۔ اگر روتے تھے تو تازیانے مارے جاتے تھے اور نیزوں سے ہمارے سروں کو زخمی کیا جاتا تھا۔ بیٹا یزید سے کہو کہ ہمارے لیئے ایک مکان خالی کرا دے تا کہ ہم حسینؑ کی صف ماتم بچھائیں۔" الغرض ایک مکان خالی کرایا گیا اور بی بیاں زندان سے اس مکان میں منتقل ہوئیں۔ زنان شام پرسے کے لیئے آئیں۔ یزید نے لوٹ کا سامان اور شہیدوں کے سر بھیجے۔ عزاداری امام مظلوم کی یہ پہلی مجلس عزا تھی جو بی بی زینبؑ نے برپا کی۔

ساتویں مجلس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام
علیٰ سید الانبیاء والمرسلین محمد المصطفیٰ والہ الطیبین الطاہرین المعصومین
اما بعد فقد قال اللہ تبارک وتعالیٰ فی کتابہ المجید وفرقانہ الحمید وقولہ
الحق ہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ یا ایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وکونوا
مع الصادقین ہ

(جناب باری تعالیٰ ایمان لانے والوں سے ارشاد فرماتا ہے کہ "اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ")۔

چنانچہ پچھلی چھ مجالس میں ہم نے کلام اللہ کی روشنی میں صادقین کی تلاش کی اور نتیجہ میں مندرجہ ذیل نکات پر پہنچے۔

(۱) حقیقت کے مطابق اظہار کرنا بشرطیکہ احقاق حق کے لئے ہو صدق ہے، بدنیتی سے ہو تو جھوٹ ہے۔

(۲) خلافِ حقیقت بیان جبکہ ہدایت خلق کے لئے ضروری ہو، جھوٹ نہیں بلکہ مکر و تقیہ ہے۔

(۳) ہادیان دین کا ہر حرکت و سکون نفسِ انسان پر گہرے نقوش بٹھانے کیلئے مظاہرہ ہوتا ہے جو حقیقت نہیں ہوتا۔

(۴) لا الٰہ الا اللہ کہنے والوں کو قرآن میں "یا ایھا الذین اٰمنوا" یعنی اے ایمان لانے والو ہی کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے لیکن اکثر کی کیفیات جو بیان کی ہیں وہ قابلِ مذمت ہیں۔

(۵) قرآن یہودیوں کے ایسے گروہ کی نشاندہی کرتا ہے جو تخریبِ اسلام کے لئے مسلمان ہوا اور اس نے بے شمار خلافِ عقل و فطرت باتیں مسلمان علماء تک پہنچائیں جو حماقت پر مبنی ہونے کے باوجود اب بھی علمِ دین میں شامل ہیں اور اکثر علماء ان پر ایمان رکھتے ہیں۔

(۶) قرآن کی رُو سے ایمانِ حقیقی کی پہچان حُبِّ شدید ہے اور حُبِّ شدید کی علامت " وجلت قلوبهم " ہے یعنی نام سُنتے ہی دِل لرز جائے۔

(۷) قرآن میں ایسے مومنین کا ذکر ہے جو رسولؐ کے ساتھ ایمان میں شریک ہیں حضرت ابوطالبؑ ان میں شامل ہیں اور ان کے ایمان کی قسم قرآن نے اس طرح کھائی ہے " لا اقسم بهٰذا البلد وانت حِلّ بهٰذا البلد ووالد وّما ولد "۔ (ترجمہ: قسم ہے اس شہر کی اور تم اس میں رہتے ہو اور ایک باپ اور بیٹے)

(۸) صنم پرستی کیا ہے؟ صنم کیا ہے؟۔ سب سے بڑا صنم ہوائے نفس ہے اور اس کی پرستش شرک ہے اور شرک ظلم عظیم ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹوں کیلئے ہر طرح کے شرکِ خفی و جلی سے محفوظ رہنے کی دُعا کی ہے اور ایسے حضرات پیدائش ہی سے معصوم و مومن ہیں۔ اسلئے کہ ان کو ایمان کی طرف بُلانے والا بجز ان کے رَبّ اور ان کے ضمیر کے کوئی دوسرا نہیں۔ وہ اپنے ایمان کے خود داعی ہیں اور ان کی ایک صفت یہ ہے کہ ان کے بعض بعض میں سے ہیں۔

(۹) تمام مذاہب میں صرف اسلامی نماز ہی ایسی ہے جو تقسیم توجہ کے ساتھ ذکرِ الٰہی کی تعلیم دیتی ہے اور ہماری اس نماز نے " ہتھ کار وَل مَن یار وَل " کا عجیب نسخۂ کیمیا فراہم کیا ہے۔

(۱۰) سورۂ بقرہ رکوع ۲۲ کی پہلی آیت " لیس البر ان تولوا..... هم المتقون "، کے آخری جزو " والصّٰبرین فی البأساء والضرّاء وحین البأس "

(اور صبر کرنے والے تنگی میں، بیماری و پریشانی میں اور لڑائی کی سختی میں) کی اس صفت کو ہم نے شب ہجرت تلواروں کے سائے میں سوتے ہوئے امیرالمومنین میں دیکھ لیا ہے۔

(۱۱) یہ سوال کہ رسولؐ کی بعثت کا مقصد تزکیۂ نفوس ہے نہ کہ سلطنت اور تنظیم عسکری کا قیام، تو غور و فکر کرنے والوں کے نزدیک تو ایسے وسوسے کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ تو سمجھ سکتے ہیں کہ حصولِ مقصد کے لیے جو ذرائع اختیار کیے جائیں وہ تکمیلِ مقصد کا ایک جزو ہی ہوتے ہیں۔ اس میں بہت سے راز پوشیدہ ہیں۔ محبوبِ خدا رحمت اللعالمین ہیں اور اُن کو تو تمام اقوام عالم کو ہدایت کرنا ہے لہٰذا تنظیم عسکری قائم کر کے دُنیا کو یہ سبق بھی دینا تھا کہ کسی قوم کی زندگی اور بقا کا انحصار تنظیم عسکری پر ہے۔ جو قوم منظم ہو جائے گی وہ دوسروں پر غالب آئے گی۔

(۱۲) تزکیۂ نفس کی وہی کوشش کر سکتے ہیں جن میں اہلیت ہو۔ مگر رحمت اللعالمین سے ہر ایک کو فیض پہنچنا ضروری ہے اس لیے جو لوگ مدارجِ اُخروی کے حصول کے اہل نہیں ان کو اتنا ہی فائدہ پہنچ جائے کہ وہ دُنیا میں مادّی ترقی ہی کر سکیں جس کے لیے حُریتِ فکر لازمی ہے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ ایسے بولتے ہوئے بُتوں کو جنھوں نے اپنے رُعب، دبدبہ اور دولت سے باقی دُنیا کو ذہنی غلامی میں جکڑ رکھا تھا، نیست و نابود کر دیا جائے اور اس کام کے لیے تنظیم عسکری کا قیام ایک لازمی امر تھا اور یہ عالمِ انسانیت پر محبوبِ خدا کا احسانِ عظیم ہے۔

(۱۳) قانونِ فطرت کے مطابق جب کوئی قوم تعیش میں پڑ کر آزادی کی اہمیت کھو دیتی ہے تو اس پر ایسی قوم کو مسلط کر دیا جاتا ہے جو سخت جان اور جفاکش ہو

اور اس طرح بدکردار اقوام کو خلاف فطرت اعمال کی سزا دینے کے لئے تنظیم عسکری کی ضرورت ہے۔

(۱۴) قانونِ فطرت ہے کہ جب موت سامنے رہے حتّٰی کہ خوف کی جگہ شوق لے لے تو قوّت ادراک میں ترقّی ہوتی ہے اور عالم غیب یا عالم نُور کا مشاہدہ ہو جاتا ہے اور اس طرح کچھ تزکیۂ نفس حاصل ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی اشخاص کو شہید کہا جاتا ہے۔ یعنی شوقِ شہادت میں نکلنے والوں کے لئے تنظیم عسکری تزکیے کے حصول کا ذریعہ ہے۔

(۱۵) اصل اور عظیم تر مقصد یہ تھا کہ احباب کو تڑپانے کے لئے ذبحِ عظیم پیش کرنا تھی جو کسی محدود علاقہ میں ہوتی تو بے فائدہ ہوتی۔ اس لئے ضرورت تھی کہ اس پُر درد مظاہرہ کے لئے اسلامی سلطنت کا علاقہ وسیع تر ہو جہاں گوشہ گوشہ تک اس قربانی کا اثر پھیل سکے۔

رسُولؐ و آلِ رسُولؐ کو اہلِ عالم کو اپنی محبّت کی طرف بلانا تھا مگر وہ فاتح کی حیثیت سے ملک کی توسیع میں حصّہ نہیں لے سکتے تھے اس لئے کہ مفتوح کو فاتح سے محبّت نہیں بلکہ نفرت ہوتی ہے۔ پس ضروری ہُوا کہ تنظیمِ عسکری قائم ہو اور اُس کے سربراہ اغیار ہوں۔

(۱۶) آلِ رسُولؐ کی قربانیوں کا ذریعہ ایسے عساکر ہی ہو سکتے تھے جن کے سربراہ رسُولؐ و آلِ رسُولؐ کے بدترین دشمن ہوں۔ اگر یہ سربراہ غیر مسلم ہوتے تو وہ اسلام کو طعن و تشنیع کا ہدف بناتے اور کہتے کہ دیکھو ہم نے تمہارے پیشوایانِ دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور تمہارا خدا اُن کی مدد نہ کر سکا۔ پس ایسے عساکر کے سربراہوں کا ظاہراً مسلمان ہونا ضروری تھا۔

(۱۷) اہلبیتؑ کو تو بحکم خدا یہ عظیم قربانی پیش کرنا ہی تھی اور اس کے لئے بنی ہاشم

کے بدترین دشمن بنو امیّہ کے گروہ کو منتخب کیا گیا اور ان کی حکومت کے لئے ایکہزار مہینے مقدر کر دیئے گئے۔

اب آیئے اسی سلسلے میں اور آگے بڑھتے ہیں تاکہ صادقین روشن مینار کی شکل سامنے نظر آتے جائیں۔ آج ہم جنگِ اُحد کا جائزہ لیتے ہیں۔ تفسیر قمّی میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ غزوہ اُحد کا اصلی سبب یہ ہے کہ کفارِ قریش جب بدر کی لڑائی سے پلٹ کر مکہ میں آئے! اس ذلت پر خیال کرنے لگے جو بدر کی لڑائی میں قتل و قید سے ان کو پہنچی تھی تو ابوسفیان نے کہا کہ اے گروہِ قریش! تم اپنی عورتوں کو اپنے مقتولوں پر مت رونے دو ورنہ اگر آنسو نکل گئے تو وہ رنج کو اور محمدؐ کی عداوت کو دُور کر دیں گے چنانچہ اُحد کی لڑائی میں جب یہ لوگ آنحضرتؐ سے لڑنے آئے تو اس روز انھوں نے اپنی عورتوں کو رونے پیٹنے کی اجازت نہیں دی۔ تاکہ غصہ کی آگ بھڑک جائے اور جوشِ انتقام بڑھ جائے۔ اس طرح ابوسفیان تین ہزار سوار اور دو ہزار پیدل فوج لے کر مع اپنی عورتوں کے مکہ معظمہ سے نکلا۔ ان عورتوں میں ہندہ (معاویہ کی ماں اور عتبہ کی بیٹی) اور کئی دوسری عورتیں تھیں۔ ہندہ نے ایک وحشی غلام کو اس پر تیار کیا کہ اگر وہ جنگ میں آنحضرتؐ، حضرت علیؑ یا حضرت حمزہ کو قتل کر دے تو اس کارگزاری کا اُسے ایسا صلہ دیا جائے گا جس سے وہ تمام زندگی کے لئے مطمئن ہو جائے گا۔ حضرت عبّاس نے، جو اسلام لا چکے تھے اور ابھی تک مکہ ہی میں مقیم تھے، ایک تیز رَو قاصد کے ذریعہ رسولؐ اللہ کو تمام حالات سے قبل از وقت آگاہی دی۔ آنحضرتؐ نے ۵ شوال ۳ھ کو انس اور مونس کو حالات کی خبر لانے کے لئے روانہ کیا۔ ان لوگوں نے واپسی پر اطلاع دی کہ قریش کا لشکر مدینہ کے قریب آ گیا ہے اور مدینہ کی چراگاہ کو اُن کے گھوڑوں نے صاف کر دیا ہے۔ پھر آپ نے جناب بن منذر کو فوج کی تعداد معلوم کرنے کے

نے بھیجا، اور ساتھ ہی شہر پر یکایک حملہ کے پیشِ نظر چہار طرف پہرے بٹھا دیئے۔ صبح ہوتے ہی آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا اور جہاد کی ترغیب دی۔ عبداللہ بن اُبَی جو ایک مشہور منافق تھا بولا "یارسولُ اللہ! مدینہ سے نہ نکلیے تاکہ ہم اُن سے گلی کوچوں میں لڑ سکیں اور اب تک کا تجربہ بھی یہی ہے کہ جب کوئی قوم ہم پر چڑھ کر آئی اور ہم اپنے قلعوں اور گھروں میں بیٹھے رہے تو وہ ہم پر کبھی غالب نہیں ہوئی۔ اور جب کبھی ہم مقابلے کے لیے نکلے تو ہمیشہ اُن ہی کو ہم پر غلبہ رہا۔" اس پر سعد ابن معاذ انصاری نے عرض کی کہ یارسولُ اللہ جس حال میں کہ ہم مشرک اور بُت پرست تھے، تب تو کسی عرب کی ہمارے برخلاف چلی نہیں اور جبکہ حضورؐ ہم میں موجود ہیں تو کوئی ہم پر کیا غالب آئے گا؟ - ایسا نہیں ہو سکتا! ہم تو اُن سے نکل کر لڑیں گے اور جو ہم میں سے قتل ہوگا شہادت پائیگا اور جو باقی رہے گا وہ راہِ خدا میں جہاد کرنے والا شمار ہوگا۔"

پس آنحضرتؐ نے اُن سے اتفاق کیا اور سات سو اصحاب کو جنگ کے لیے تیار کرکے شب کے وقت لڑائی کی جگہ پر آ گئے۔ آپؐ نے اُحد کو پشت پر رکھتے ہوئے صف آرائی کی اور گھاٹی کے ایک راستے پر عبداللہ بن جبیر کی کمان میں پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ متعین کیا اور تاکید کی کہ خواہ فتح حاصل ہو جائے پر کبھی وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔ ادھر قریش کو جو بدر میں لڑائی کا تجربہ ہو چکا تھا اور مسلمانوں کی قوت کا اندازہ تھا انہوں نے نہایت ترتیب سے لشکر کو منظم کیا۔ میمنہ پر خالد بن ولید کو مقرر کیا۔ میسرہ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ کو دیا۔ سواروں کا دستہ صفوان بن امیہ کے تحت تھا۔ تیر اندازوں کے دستے الگ تھے جو عبداللہ بن ابی ربیعہ کے تحت تھے۔ طلحہ کے پاس علم تھا اور دو سو گھوڑے وقتِ ضرورت کام آنے کے لیے علیحدہ تھے۔

پس طبلِ جنگ بجا اور قریش کی عورتیں بدر کے انتقامِ خون کے اشعار
پڑھتی پڑھتیں۔ طلحہ علمبردارِ قریش صف سے نکلا اور مسلمانوں کو للکارا۔ ادھر سے حضرت
علی شیرِ خدا آگے آئے اور ایک تلوار میں اُس کا کام تمام کیا۔ اس کے بعد اُس کا بھائی
عثمان سامنے آیا اور حضرت حمزہ کے مقابل ہوا۔ آپ نے ایک ایسا وار کیا کہ تلوار
شانہ سے ہوتی ہوئی کمر سے نکل گئی۔ اور جنگ عام ہو گئی۔ حضرت حمزہ، امیر المومنین
اور ابو دجانہ قریش کے لشکر میں گھس گئے اور صفوں کی صفیں صاف کر ڈالیں۔
حضرت حمزہ دو دستی تلوار چلا رہے تھے جس طرف بڑھتے لاش پر لاش گرتی نظر آتی۔
ایک زنگی وحشی غلام جسے ہندہ نے وعدے کئے تھے۔ حضرت حمزہ کی تاک
میں ایک مقام پر چھپا بیٹھا تھا جونہی حضرت حمزہ کا ادھر سے گزر ہوا تو اُس ملعون نے
ایک چھوٹا نیزہ پھینک کر مارا جو آپ کی ناف میں لگا اور پار ہو گیا۔ آپ زمین پر
گر پڑے اور جامِ شہادت نوش فرمایا۔ حضرت امیر المومنین اور ابو دجانہ کے بے پناہ
پے در پے شدید حملوں سے کفار کے پاؤں اکھڑ گئے۔ قریش کے علم تھامنے والے قتل
ہوتے جاتے تھے، اُن کی عورتیں گھبرا گھبرا کر بھاگ رہی تھیں۔ فتح کا وقت قریب
تھا کہ ساتھ ہی مسلمانوں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ یہ دیکھ کر وہ تیر انداز جو آنحضرت
نے پشت کی جانب درہ پر مقرر کئے تھے اس لوٹ میں شامل ہونے کے لیے اپنی
جگہ سے دوڑ پڑے اور اپنے سردار عبداللہ بن جبیر کو صرف چند جانبازوں کے ساتھ
تنہا چھوڑ دیا۔ عبداللہ بن جبیر چیخ چیخ کر ان لوٹ مار کے لیے بھاگے ہوئے
لوگوں کو رسول اللہ کا حکم یاد دلاتے تھے مگر وہاں کون سنتا تھا۔ ایسے میں خالد بن
ولید نے اس [illegible] موقع کو تاڑ لیا اور وقت کو غنیمت جان کر عقب سے دو سو
سواروں کے ساتھ حملہ کر دیا۔ عبداللہ بن جبیر مع چند ساتھیوں کے شہید ہو گئے۔ اب
راستہ صاف تھا اور جنگ کا نقشہ بدل چکا تھا۔ ہاتھ آئی ہوئی فتح شکست میں

تبدیل ہوتی ہوئی نظر آنے لگی۔ خالد نے اپنے حملہ کی تیزی میں اور شدت پیدا کر دی۔ ...سلمان جو لوٹ مار میں مصروف تھے کفار کے دو لشکروں کے درمیان آگئے اور ان دونوں ...جوں کے ملتے ہی اُن کو یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ اپنا کون ہے اور دشمن کون۔ وہ اس درجہ بدحواس ...وے کہ عالمِ سراسیمگی میں آپس میں ہی لڑنے مرنے لگے۔ اُن کے پیر اکھڑ چکے تھے اور بھگدڑ ...چ گئی تھی۔ جس کا منھ جدھر کو اُٹھتا وہ اُدھر جان بچا کر بھاگ رہا تھا۔ ایسے میں ...سی نے یہ افواہ بھی اڑا دی کہ رسولؐ اللہ شہید ہو گئے۔ اصحابِ خاص پہاڑ پر ادھر اُدھر ...بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ کفار نے جب یہ نقشہ دیکھا تو وہ جو ابھی تک لڑ رہے تھے ہمت و ...جرأت کے ساتھ جنگ میں مصروف ہو گئے اور جو بھاگ نکلے تھے فوراً واپس آن ملے۔ ...جنگ کا پانسہ پلٹ چکا تھا۔

اِدھر رسولِؐ خدا اپنے سرِ مبارک کے خود اُتارے زور زور سے پکار رہے تھے کہ "اے ...لوگو! میں اللہ کا رسولؐ یہاں موجود ہوں۔ تم خدا کے رسولؐ کو چھوڑ کر کہاں بھاگے جاتے ...ہو؟" مگر کون سنتا تھا اور کون رُکتا تھا۔ نوبت یہاں تک آن پہنچی تھی کہ خدا کے ...رسولؐ کے پاس بجز حضرت امیر المومنینؑ اور ابو دجانہؓ کے اور کوئی باقی نہ رہا تھا۔ جب ...دشمنوں کا کوئی دستہ آنحضرتؐ پر حملہ آور ہوتا تو حضرت علیؑ جنگ کر کے اُن کو دفع کرتے۔ ...یہاں تک کہ آپکی تلوار ٹوٹ گئی تو آنحضرتؐ نے اپنی ذوالفقار عنایت فرمائی جس پر ...جبرئیل امین کو کہتے سُنا گیا "لا سیف الا ذوالفقار و لا فتیٰ الا علی"۔ آپ نے ...اس قدر شدید جنگ کی کہ تمام میدان کفار سے صاف کروالیا۔ اُس وقت تک آپ ...کے سرِ مبارک دونوں ہاتھوں اور پاؤں پر ستر زخم آ چکے تھے۔ جبرئیل امین فرماتے ...تھے "یا رسولؐ اللہ مواخات اس کو کہتے ہیں۔" آنحضرتؐ نے فرمایا "کیوں نہ ہو علیؑ مجھ سے ...اور میں علیؑ سے ہوں۔"

اُدھر مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ حضرت انسؓ کے چچا ابن نضر لڑتے بھڑتے جب

موقعہ سے نکل گئے تو ایک مقام پر حضرت عمرؓ کو مایوسی کے عالم میں بغیر ہتھیار جاتے ہوئے دیکھا۔ آپ نے سوال کیا "اے عمر یہاں کیا کرتے ہو؟" حضرت عمر نے جواب دیا کہ "اب لڑ کر کیا کریں رسول اللہ نے تو شہادت پائی"۔ اس پر ابن نصر نے کہا کہ ان کے بعد زندہ رہ کر کیا کریں گے۔ اور یہ کہتے ہی پلٹے اور پھر دشمنوں پر جا پڑے یہاں تک کہ جان دے دی۔ عبداللہ بن قمیہ کی تلوار سے رسولِ خدا کے چہرہ مبارک پر زخم آ چکا تھا اور خون بہہ رہا تھا امیر المومنینؑ نے لڑتے لڑتے آنحضرتؐ کو ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا تھا آپکی شہادت کی خبر سُن کر جناب فاطمہ زہراؑ بے تابی سے مدینے تشریف لائیں اور زخم کو دھویا۔ ایک چٹائی کے ٹکڑے کو جلا کر زخم میں بھرا جس سے خون کا بہنا ختم گیا۔

اُدھر شہدا کے ناک کان کاٹ کر قریش کی عورتوں نے خوشی سے ہار بنا کر گلوں میں پہنے۔ ہندہ، مادرِ معاویہ نے حضرت حمزہؑ کا پیٹ چاک کیا اور کلیجہ نکال کر چبا گئی لیکن نگل نہ سکی اور ٹکڑوں کو اُگل دیا۔ تاریخ میں ہندہ کو اسی لیے جگر خوارہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

حضرت حمزہؑ کی بہن حضرت صفیہ شکست کی خبر سُن کر جب مدینہ سے مقام شہدا پر آئیں تو آنحضرتؐ نے اُن کے صاحبزادے زبیر کو بُلا کر ارشاد فرمایا۔ کہ صفیہ کو حضرت حمزہؑ کی لاش نہ دکھلانا۔ زبیر نے جب آنحضرتؐ کا پیغام سُنایا تو حضرت صفیہ بولیں کہ میں اپنے بھائی کا ماجرا سُن چکی ہوں لیکن خدا کی راہ میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں۔ اس پر آنحضرتؐ نے اجازت دے دی تو بھائی کی لاش پر گئیں۔ خون نے جوش مارا اور اپنے پیارے بھائی کی لاش کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو دیکھ کر گریہ کیا اور پھر انا للہ وانا الیہ راجعون، کہہ کر خاموش ہو گئیں۔ مسلمانوں کے کل ستر آدمی مارے گئے مگر افلاس کا یہ حال تھا کہ شہدا کی پردہ پوشی بھی پوری طرح نہ ہو سکی

خون میں لتھڑی ہوئی بے غسل وکفن لاشوں کو دو دو کر کے ایک ایک قبر میں دفنایا گیا۔
فوجیں الگ ہو چکی تھیں۔ لشکرِ کفار جا چکا تو آنحضرتؐ مدینہ میں وارد ہوئے۔ دیکھا کہ تمام مدینہ ماتم کدہ بنا ہوا ہے۔ آپ جس طرف سے گزرتے گھروں سے نالہ وشیون کی صدائیں آتی تھیں۔ حضرتؐ کو بہت افسوس ہوا کہ سب کے اعزا و اقارب اپنوں اپنوں کی ماتم داری کا فرض ادا کر رہے ہیں لیکن حمزہ کا کوئی نوحہ خوان نہیں ہے۔ جوشِ گریہ سے آپ کی زبانِ مبارک سے بے اختیار نکلا "لیکن حمزہ کا رونے والا کوئی نہیں!!" انصار نے یہ الفاظ سُنے تو تڑپ اُٹھے اور اپنی اپنی بیویوں کو حکم دیا کہ آنحضرتؐ کے دولت کدہ پر جا کر حضرت حمزہ کا ماتم کریں۔ رسولِ خداؐ نے دیکھا تو دروازہ پر پردہ نشینوں کی بھیڑ تھی اور حضرت حمزہ کا ماتم بلند تھا۔ آپ نے ان سب کے حق میں دعائے خیر کی اور فرمایا کہ "میں تمہاری ہمدردی کا شکر گزار ہوں"۔ (اس جنگ کے لئے بیشتر اقتباسات مولانا شبلی کی سیرت النبی سے لئے گئے ہیں)۔
اس جنگ کے نتائج پر ایک معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں کو شکست کیوں ہوئی اور فرشتے مدد کو کیوں نہ آئے تو ملائکہ کے آنے جانے کا سوال ہی کیا ہے وہ تو ہر وقت موجود ہیں۔ مگر ان کی نصرت کا انحصار رسولؐ کی طلب پر ہے اور نصرت وتائیدِ غیبی کا انحصار ایمانِ سالم پر ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے "تم ہی غالب ہو گے اگر تم ایمان پر ہو"۔ یہاں تیر اندازوں کے دستے میں سے ماسوائے چند کے سب نے ایمان کو ضائع کر دیا اور فرمانِ رسولؐ سے انحراف کر بیٹھے تو اب غیبی امداد کا سوال کیسا؟ ایک متشکک یہ کہہ سکتا ہے کہ جو لوگ شہید ہوئے انہوں نے تو ایمان نہیں چھوڑا تھا تو اس کا جواب اس آیت میں موجود ہے "ولقد کنتم تمنون الموت من قبل ان تلقوہ فقد رایتموہ وانتم تنظرون"۔ (اور تم موت کے سامنے سے پہلے (لڑائی میں) مرنے کی تمنا کرتے تھے پس تم نے اس کو اپنی آنکھوں سے

دیکھ لیا)۔ جنگِ بدر کے بعد بہت سے صحابہ موت کی تمنا کیا کرتے تھے۔ یہ آیت اسی بارے میں ہے۔

ایک بڑا سبق اس جنگ میں سردارِ لشکر کے حکم کی نافرمانی کی سزا اور ذلت و خواری کا عملی طور سے دکھا دینا تھا۔ پھر ایک آیت یہ بھی کہہ رہی ہے کہ نہیں ہیں محمدؐ مگر رسولؐ۔ اگر وہ قتل ہو جائیں یا مر جائیں تو تم اُلٹے پاؤں واپس ہو جاؤ گے (کفر کی طرف)۔ اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی جانچ ضروری تھی کہ وفاتِ رسولؐ کے بعد کتنے ثابت قدم رہنے والے ہیں۔ اور یہ بھی ارشاد ہوتا ہے "تلک الایام نداو لہا بین الناس" (یہ اتفاقاتِ زمانہ ہیں جو ہم لوگوں کے درمیان باری باری الٹ پھیر کیا کرتے ہیں)۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو بھی کوئی ظاہراً شکست ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کہ اگر ہمیشہ غلبہ ہی رہے تو جہاد میں قربانی دینے کے لئے کون جائے گا اور شوقِ شہادت ہی وہ جذبہ ہے جس سے اصلاحِ نفس اور مقصدِ بعثتِ رسولؐ حاصل ہوتا ہے۔ پس اگر مسلمانوں کو کبھی شکست ہی نہ ہو تو یہ مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ دُوسرا اَمر یہ ہے کہ جہاد کا ایک مقصد ایسے کفّار کو جن کی نسلیں فساد کا باعث ہوں، مٹا دینا اہلِ عالم کے لئے مفید ہے۔ اب اگر کفار کو ہمیشہ شکست ہی ہوتی رہے تو وہ میدان میں آنے سے ہی گریز کریں گے۔

مخالفینِ عزا کی طرف سے اکثر پمفلٹ شائع ہوتے رہتے ہیں جن میں خاص نکتہ یہ ہوتا ہے کہ ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے اور گریہ کو مکروہ بلکہ ناجائز قرار دیا جاتا ہے حالانکہ جنگِ اُحد میں تمام تواریخ شہادت دیتی ہیں کہ رسولُ اللہ نے حضرت حمزہؓ پر ماتم کروایا اور زنانِ مدینہ کو جو ماتم میں شریک ہوئیں دُعائیں دیں اور میدانِ قتال میں جب حضرت حمزہؓ کی لاش مطہر پر پہنچے تو فریاد بلند کی "یا عمّاہ۔ یا اسداللہ و رسولہ" (ہائے چچا، ہائے اے اللہ اور اُس کے رسولؐ کے شیر!!)۔ اصل بات

یہ ہے کہ لوگ اس کی حقیقت کو سمجھتے ہی نہیں۔ اظہارِ غم و الم اور ماتم خدا کے لئے اور اُس کی رضا کے لئے ہوتا ہے اور صرف اُسی شخص کے لئے ہونا چاہیئے جو مقبولِ بارگاہِ ایزدی ہو کہ خدا کا ایک محبوب، اُس کا ایک ذکر کرنے والا ہمارے درمیان سے اُٹھ گیا۔ اُس پر رونا اُس کے ایمان کا احترام ہے۔ جتنے مقتول یا متوفّی کے مراتبِ ایمان بلند ہونگے اتنی ہی اُس کی عزا کی منزل بھی بلند ہوگی۔ بازاری کتے بلیاں روز مرتے رہتے ہیں مگر کوئی اُن کی میّت پر نہیں روتا البتہ پالتو کتے، بلی کا غم ہوتا ہے۔ ممکن ہے سامعین میں سے بعض کو اس سے تسکینِ قلب حاصل نہ ہو تو سرِ دست کتاب اہلبیت حصّہ سوم سے مختصر سے اقتباسات پیشِ خدمت ہیں:۔

"اُصولِ کافی میں یہ حدیث موجود ہے کہ امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا جب کوئی مومن مرتا ہے تو ملائکہ اُس کے لئے روتے ہیں اور زمین کے وہ حصّے روتے ہیں جن پر کھڑے ہو کر اُس نے خدا کی عبادت کی تھی اور وہ آسمان کے دروازے جن سے اُس کے اعمال صعود کرتے تھے" (جلد ۱ ص۳۶)۔ علمائے شیعہ نے اس مضمون کی احادیث بکثرت نقل فرمائی ہیں۔ بخوفِ طوالت اُن کو نقل نہیں کیا جا رہا۔ علمائے اہلِ سُنّت نے بھی بہت احادیث اس سلسلے میں بیان کی ہیں۔ چنانچہ کتاب نور الصدور، اردو ترجمہ شرح الصدور مصنّفہ امام جلال الدین سیوطیؒ مترجمہ محمد علیٰ الہ آبادی خلیفہ اجل حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے باب تیرہواں، صفحہ ۸۵ پر ہے "اس بیان میں کہ مومن کے مرنے پر آسمان و زمین روتے ہیں"۔ "روایت ہے انس سے فرمایا رسولؐ اللہ نے۔ ہر انسان کے واسطے آسمان میں دو دروازے ہیں۔ ایک دروازے سے اُس کے نیک اعمال جاتے ہیں اور دوسرے دروازے سے اسکی روزی نازل ہوتی ہے۔ پس جب بندہ مومن مرتا ہے تو یہ دونوں دروازے اُس پر روتے ہیں"۔ "روایت ہے ابنِ عباسؓ سے کسی نے سوال کیا کہ اس آیت کے کیا معنی ہیں۔ فما بکت علیھما السماء والارض (یعنی نہیں روئے اُن پر آسمان و زمین) اور

پوچھا کیا آسمان و زمین کسی پر روتے ہیں۔ فرمایا ہاں روتے ہیں۔ جتنی مخلوق ہے سب کے واسطے آسمان و زمین روتے ہیں۔ ایک دروازے سے اُن کی روزی آتی ہے۔ دوسرے دروازے سے نیک عمل جاتا ہے۔ پس جب مومن مرتا ہے تو اُس کے دونوں دروازے آسمان کے بند ہوجاتے ہیں جس سے روزی آتی تھی اور جس سے نیک عمل جاتا تھا۔ یہ دونوں دروازے اُس پر روتے ہیں۔ اور جس زمین پر وہ نماز پڑھا کرتا تھا وہ زمین اُس کا مُصَلّیٰ نہیں دیکھتی اور اللہ کا ذکر نہیں سُنتی تو اُس پر روتی ہے۔ فرعون کی قوم کے نیک اعمال نہ تھے؟ نہ زمین پر نہ ایسے جو آسمان پر جائیں تو یہ دروازے اُن پر نہ روئے"

... یہ مضمون آیت کا ہے اور ابنِ جریر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے۔ اس کے بعد اسی مضمون کی حدیث شریح حضرمی سے منقول ہے۔ اور اسی مضمون کی پانچ اور احادیث منقول ہیں۔ پھر چھٹی حسبِ ذیل ہے۔

"اور حسنؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی مومن کی رُوح سفر میں قبض کرتا ہے تو اُس کی مُسافرت پر رحم فرما کر عذاب نہیں کرتا اور فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ اس پر کوئی رونے والا نہیں تم ہی اس پر رُوؤ"

اِن احادیث سے ثابت ہوا کہ مومن کی وفات پر گریہ کرنا عبادتِ الٰہی ہے۔ وہ اصل میں احترامِ میت ہے۔ کوئی جنگلی جانور مرتا ہے تو اُس پر کوئی نہیں روتا مگر اہلی جانور پر اُس کے پلنے والے روتے ہیں تو مومن جو خدا کا محبوب ہے اُس کی میت کا تو بہت احترام لازم ہے۔ انبیاء و ائمہ کے رونے اور اظہارِ غم و الم کا ایک سبب احترامِ میتِ مومن ہے۔ اسی جنگِ اُحد کے بیان میں یہ ذکر آچکا ہے کہ حضور سرورِ دو عالمؐ نے فرمایا کہ افسوس حمزہؓ پر رونے والا کوئی نہیں ہے لیکن امام حسینؑ کی ولادت کے وقت ہی یہ سوال سامنے آگیا تھا۔ آنحضرتؐ نے بی بی فاطمہؑ کو خبر دی کہ یہ مولود ظلم و ستم سے زمین کربلا پر شہید ہوگا۔ اور یہ واقعہ اُس وقت ہوگا جب میں

ہوں گا، نہ تم ہوگی اور نہ علیؑ ہوں گے تو جناب سیدہؑ نے پہلا سوال یہی کیا تھا کہ پھر میرے بچے پر رونے والا کون ہوگا؟۔ حضرتؐ نے فرمایا کہ باری تعالیٰ ایک قوم کو پیدا کرے گا جس کے مرد حسینؑ اور ان کے اصحاب، اعزّا پر روئیں گے اور ان کی عورتیں حسینؑ کے ہمراہ مصائب میں شریک محترم مخدرات پر نوحہ کریں گی۔ اور ان کے بچے حسینؑ کے بچوں پر روئیں گے۔ اور جوان، جوانوں کا ماتم کریں گے۔ دوسرا خاص امر جس کا ذکر اس ضمن میں آتا ہے وہ جناب صفیہ ہمشیرہ حضرت حمزہؓ کا اپنے بھائی کی لاش پر جانا ہے۔

جناب حمزہؓ کی شہادت ہوئی تو ان کی بہن جناب صفیہ اپنے بھائی کی لاش پر آئیں اور اپنے بھائی کا زخم دیکھ کر بیتاب ہوگئیں اور گریہ کیا مگر خواہر جناب حمزہؓ اور خواہر جناب امام مظلومؑ میں اپنے اپنے بھائی کی لاش پر میدان میں آنے میں بڑا فرق ہے بی بی صفیہ نے اپنے بھائی کے جسم پر صرف ایک زخم دیکھا تھا مگر بی بی زینبؑ نے اپنے بھائی کو اس حال میں دیکھا کہ سر سے پیر تک زخموں پر زخم لگے ہوئے تھے اور بعد شہادت جب ذوالجناح تبرکات رسالتمآبؐ لے کر در خیمہ پہ آیا تو بی بی زینبؑ خیمہ سے اس طرح نکلیں کہ عالم اضطراب میں چادر کا کونہ زمین پر لٹکتا جاتا تھا اور آپ یا علیؑ یا علیؑ کہتی ہوئی میدان کی طرف جارہی تھیں۔ یہاں تک کہ ایک نشیب میں پہنچیں اور اپنے بھائی کی لاش کو اس حال میں دیکھا کہ سر مبارک جسم اقدس سے جُدا ہو چکا ہے اور نیزوں اور تلواروں سے جسم مطہر پارہ پارہ ہے۔ ثانی زہراؑ بھائی کی لاش کا یہ حال دیکھ کر بے قرار ہوگئیں کبھی نجف کی طرف منھ کر کے فریاد کرتی تھیں "بابا آپ کے حسینؑ کا سر پس گردن سے جدا ہوگیا" اور کبھی مدینہ کا رُخ کر کے کہتی تھیں "نانا آپ کی امت نے اجر رسالت ادا کر دیا۔ یا جداہ زینب کربلا میں بھائی سے بچھڑ گئی۔ نانا آپ کا بیٹا حسینؑ کربلا میں سر کٹائے خون میں نہائے جلتی ریت پر پڑا ہے مگر کوئی یہ نہیں کہتا کہ یہ فاطمہؑ کا لال اور فرزند رسولؐ ہے"۔ جناب صفیہ تو اپنے بھائی کی لاش

پر دل بھر کر رولیں مگر کربلا میں شہزادی زینبؑ کو اپنے بھائی کی لاش پر گریہ کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ جناب صفیہؑ کو تسلّی دلاسا دینے کے لیے جناب رسولِ خداؐ، حضرت علیؑ اور دیگر اعزا موجود تھے، مگر کربلا میں بی بی زینب کو تسلّی دلاسا دینے والا کوئی بھی نہ تھا۔ آپ کی فریاد سُن کر اشقیا ہنستے تھے۔ ادھر فوج یزید میں قتل حسینؑ کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں اور اِدھر اہلِ حرم خاک پر سر جھکائے بیٹھے سسک رہے تھے۔ جو گھر صبح کے وقت بچوں، جوانوں اور بوڑھوں سے بھرا تھا اس گھر میں بعد عصر سوائے عابد بیمار اور چند بی بیوں کے کوئی بھی باقی نہ تھا۔ میدان قتال میں جلتی ریت پر امامِ مظلوم کی لاش خود اپنے خون میں نہائی ہوئی بے کفن پڑی تھی۔ آہ حسینؑ کا جنازہ کون اُٹھاتا۔ ایک ناتواں بیمار بیٹا بچا تھا تو اس کے ہاتھ ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ امام مظلوم کی لاش پر ماتم کون کرتا۔ بہن کے ہاتھ رسیوں میں بندھے ہوئے تھے۔ ہاں صرف اتنا ہوا کہ کچھ اونٹوں پر چند لاوارث بی بیاں اور کچھ یتیم بچے لاشِ بے سر کو سلام کرتے ہوئے گذر گئے۔ اے سر بریدہ شہیدوں کے قبلہ قافلہ سالار ہمارے تڑپتے دلوں کا بھی سلام قبول ہو ؎

اے بارگاہِ حضرت شبیرؑ السلام
جنت نبیؐ کے راج دلارے سلام ہو
اے سُرخیٔ فسانۂ تقدیر السلام
ٹوٹے ہوئے دلوں کے سہارے سلام ہو

دریا پہ تین روز کے پیاسے سلام ہو
پیغمبرؐ خدا کے نواسے سلام ہو

تجھ کو مرا سلام علمدار کے علم
شبیرؑ با وفا کے وفادار کے علم

میں ایک مُشت خاک ذلیل و حقیر ہوں
کچھ بھی صحیح مگر ترے در کا فقیر ہوں

مجھ کو نصیب مدحت آلِ رسولؐ کر
مظلوم کربلا مرے آنسو قبول کر

—— ☆ ——

آٹھویں مجلس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ الحمد للہ الذی خلق السمٰوٰت والارض وھو منزل البرکات وسامع الاصوات غافر الخطئیات والصلوٰۃ والسلام علےٰ حبیبہٖ افضل الکائنات محمدن المصطفےٰ والہٖ الطیبات یصلون علیھم ملائکۃ السمٰوٰت ہ امّا بعد فقد قال اللہ تبارک وتعالیٰ فی کتابہ المجید وفرقانہ الحمید وقولہ الحق ہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ یاایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین ہ

ارشادِ جناب ربّ العزّت ہے کہ اے وہ لوگو جو ایمان لائے۔ اللہ سے ڈرو اور سچّوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ چنانچہ اس جستجو میں کہ تعمیلِ ارشادِ الٰہی ہو جائے اوّل مجلس سے اس منزل تک ہم ارشادِ باری تعالیٰ کے تحت قرآنِ حکیم کی روشنی میں یہ کوشش کرتے چلے آرہے ہیں کہ صادقین کی نشاندہی ہو جائے تاکہ اُن کے ساتھ ہو جانے کا معاملہ منشائے الٰہی کے مطابق ہمیشہ کے لئے طے پاجائے اور ہماری نجاتِ دینوی و اُخروی کا باعث ہو۔ اس ضمن میں ہم سچ پر بحث کر چکے ہیں اور اس پر بھی گفتگو ہو چکی ہے کہ دُنیوی اعتبار سے اور دُنیا والوں کے نظریات کے تحت سچ کی تعریف اور سچّوں کا تعین کرنا مقصود نہیں بلکہ یہ کہ ہم اُن صادقین کا تعین کریں جنھیں قرآن نے صادقین کہا ہو۔ اس سلسلے میں ہم نے گزشتہ مجالس میں سورۃ بقر کے بائیسویں رکوع کی مندرجہ ذیل آیت کی طرف اس لئے رجوع کیا تھا کہ اس آیت میں صادقین اور متقین دونوں کا تعین کر دیا گیا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ خداوند تعالیٰ نے اس آیت میں اُن جملہ صفات کو بیان کر دیا ہے جو صادقین اور متقین کا تعین کرتی ہیں۔ یعنی صفاتِ مندرجہ آیت

جہاں بھی اور جن ذوات میں بھی مل جائیں ہم بلا تامل اُن کو صادقین اور متقین کہہ سکتے ہیں اور سند یہ ہے کہ یہ صفات خود خداوندِ جلیل نے اُن ذوات کی نشاندہی کے لئے بطور کسوٹی عطا فرمائی ہیں۔ آیت یہ ہے :- سورہ بقر۔ آیت ۱۷۷

لیس البرّان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البرّ من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر والملٰئکۃ والکتٰب والنبیین واٰتی المال علٰی حبہٖ ذوالقربٰی والیتٰمٰی والمسٰکین وابن السبیل والسآئلین وفی الرقاب واقام الصلٰوۃ واٰتی الزکوٰۃ والموفون بعھدھم اذا عٰھدوا والصٰبرین فی الباسآء والضرّآء وحین الباس اولٰئک الذین صدقوا واولٰئک ھم المتقون ٥ (یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم اپنے منہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لو۔ بلکہ حقیقی نیکی وہ ہے (یا اُسی کی ہے) جو ایمان لائے اللہ پر اور یوم قیامت پر، ملائکہ پر، کتاب پر اور نبیوں پر اور مال دے اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو، یتیموں کو، مسکینوں کو اور مسافروں کو، سوال کرنے والوں کو اور غلاموں کو آزاد کرانے میں اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور پورا کرنے والے اپنے عہدوں کے جبکہ عہد کر لیں اور صبر کرنے والے تنگی میں، بیماری و پریشانی میں اور لڑائی کی سختی میں۔ وہی لوگ ہیں جو صادقین ہیں اور وہی ہیں جو متقین ہیں)۔

اس آیت میں صادقین اور متقین کی مندرجہ صفات پر ہم ایک ایک کر کے گزشتہ مجالس میں گفتگو کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس مجلس میں آخری صفت پر گفتگو کرنا مقصود ہے۔ یعنی "حین الباس" (صبر کرنے والے لڑائی کی سختی میں) اگر قبل اس کے کہ ہم یہ گفتگو شروع کریں مناسب ہو گا کہ اس مقام پر مجالس گزشتہ کے جملہ نکات کا اعادہ کر دیا جائے تا کہ سامعین جو قبل ازیں موجود تھے اُنکی یادتازہ ہو جائے اور جو موجود نہ تھے اُن کے علم میں وہ تمام نکات آ جائیں اور بحث کا ربط و تسلسل

اُن کے ذہنوں میں بھی قائم ہوجائے۔ وہ نکات یہ ہیں:۔

(۱) حقیقت کے مطابق اظہار کرنا بشرطیکہ اخفاقِ حق کے لئے ہو صدق ہے، بدنیتی سے ہو تو جھوٹ ہے۔

(۲) خلافِ حقیقت بیان جبکہ ہدایتِ خلق کے لئے ضروری ہو جھوٹ نہیں بلکہ مکر و تقیّہ ہے۔

(۳) ہادیانِ دین کا ہر حرکت و سکون نفسِ انسان پر گہرے نقوش بٹھلانے کیلئے مظاہرہ ہوتا ہے جو حقیقت نہیں ہوتا۔

(۴) لاالٰہ الّا اللّٰہ کہنے والوں کو قرآن میں " یا ایّہا الّذین آمنوا"، یعنی اے ایمان لانے والو ہی کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے لیکن اکثر کی کیفیات جو بیان کی ہیں وہ قابلِ مذمت ہیں۔

(۵) قرآن یہودیوں کے ایک ایسے گروہ کی نشاندہی کرتا ہے جو تخریبِ اسلام کیلئے مسلمان ہوا اور اس نے بے شمار خلافِ عقل و فطرت باتیں مسلمان علماء تک پہنچائیں جو حماقت پر مبنی ہونے کے باوجود اب بھی علمِ دین میں شامل ہیں اور اکثر علماء ان پہ ایمان رکھتے ہیں۔

(۶) قرآن کی رُو سے ایمانِ حقیقی کی پہچان حُبِّ شدید ہے۔ اور حُبِّ شدید کی علامت " وجلت قلوبہم " ہے یعنی نام سُنتے ہی دِل لرز جائے۔

(۷) قرآن میں ایسے مومنین کا ذکر ہے جو رسولؐ کے ساتھ ایمان میں شریک ہیں حضرت ابوطالبؑ اُن میں شامل ہیں اور اُن کے ایمان کی قسم قرآن نے اس طرح کھائی ہے " لا اقسم بہٰذا البلد وانت حلٌّ بہٰذا البلد و والدٍ وّما ولد "
(ترجمہ: قسم ہے اُس شہر کی اور تم اُس میں رہتے ہو اور ایک باپ اور بیٹے)

(۸) تمام مذاہب میں صرف اسلامی نماز ہی ایسی ہے جو تقسیمِ توجہ کے ساتھ ذکرِ الٰہی کی تعلیم دیتی ہے اور ہماری اس نماز نے " ہتھ کار ول من یار ول " کا عجیب نسخہ کیمیا

فراہم کیا ہے۔

(۹) یہ سوال کہ رسولؐ کی بعثت کا مقصد تزکیۂ نفوس ہے نہ کہ سلطنت اور تنظیم عسکری کا قیام، تو غور و فکر کرنے والوں کے نزدیک تو ایسے وسوسہ کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ تو سمجھ سکتے ہیں کہ حصولِ مقصد کے لئے جو ذرائع اختیار کئے جائیں وہ تکمیلِ مقصد کا ایک جزو ہی ہوتے ہیں۔ اس میں بہت سے راز پوشیدہ ہیں۔ محبوبِ خدا رحمت اللعالمین ہیں اور اُن کو تمام عالم کو ہدایت کرنا ہے لہٰذا تنظیمِ عسکری قائم کر کے دُنیا کو یہ سبق بھی دینا تھا کہ کسی قوم کی زندگی اور بقا کا انحصار تنظیمِ عسکری پر ہے۔ جو قوم منظم ہو جائے گی وہ دوسروں پر غالب آئے گی۔

(۱۰) قانونِ فطرت کے مطابق جب کوئی قوم تعیش میں پڑ کر آزادی کی اہمیت کھو دیتی ہے تو اُس پر ایسی قوم کو مسلط کر دیا جاتا ہے جو سخت جان اور جفاکش ہو اور اس طرح بدکردار اقوام کو خلافِ فطرت اعمال کی سزا دینے کے لئے تنظیم عسکری کی ضرورت ہے۔

(۱۱) قانونِ فطرت ہے کہ جب موت سامنے رہے حتیٰ کہ خوف کی جگہ شوق لے لے تو قوتِ ادراک میں ترقی ہوتی ہے اور عالمِ غیب یا عالمِ نُور کا مُشاہدہ ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح کچھ تزکیۂ نفس حاصل ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی اشخاص کو شہید کہا جاتا ہے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ شوقِ شہادت میں نکلنے والوں کے لئے تنظیمِ عسکری تزکیہ کے حصُول کا ذریعہ ہے۔

(۱۲) اصل اور عظیم تر مقصد یہ تھا کہ احباب کے قلوب کو تڑپانے کے لئے ذبحِ عظیم پیش کرنا تھی جو کسی محدود علاقہ میں ہوتی تو بے فائدہ ہوتی۔ اس لئے ضرورت تھی کہ اس پُر درد مظاہرہ کے لئے اسلامی سلطنت کا علاقہ وسیع تر ہو

جہاں ہر گوشہ تک اس قربانی کا اثر پھیل سکے۔

(۱۳) رسولؐ اور آلِ رسولؐ کو اہلِ عالم کو اپنی محبت کی طرف بلانا تھا لہٰذا وہ فاتح کی حیثیت سے ملک کی توسیع میں حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ اس لیے کہ مفتوح کو فاتح سے محبت نہیں بلکہ نفرت ہوتی ہے۔ پس ضروری ہوا کہ تنظیمِ عسکری قائم ہو اور اُس کے سربراہ اغیار ہوں۔

(۱۴) آلِ رسولؐ کی قربانیوں کا ذریعہ ایسے عساکر ہی ہو سکتے تھے جن کے سربراہ رسولؐ اور آلِ رسولؐ کے بدترین دشمن ہوں۔ اگر یہ سربراہ غیر مسلم ہوتے تو وہ اسلام کو طعن و تشنیع کا ہدف بناتے اور کہتے کہ دیکھو ہم نے تمہارے پیشوایانِ دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور تمہارا خدا اُن کی مدد نہ کر سکا۔ پس ایسے عساکر کے سربراہوں کا ظاہراً مسلمان ہونا ضروری تھا۔

(۱۵) اہلبیتؑ کو تو بحکم خدا یہ عظیم قربانی پیش کرنا ہی تھی اور اس کے لئے بنی ہاشم کے شقی القلب اور بدترین دشمن بنو اُمیہ کے گروہ کو منتخب کیا گیا اور اُن کی حکومت کے لئے ایک ہزار مہینے مقدر کر دیئے گئے۔

آیئے اب ہم حین الباس " (صبر کرنے والے لڑائی کی سختی میں) کی صفت کے حاملان کو تاریخ اسلام کی ایک مشہور جنگ یعنی خندق کی لڑائی میں ذرا تفصیل سے دیکھیں اور صادقین کا تعین کرتے چلیں۔ یہ ہو گیا تو پھر ان صادقین کے ساتھ ہو جانے کا اُمرِ ربّی اور منشائے الٰہی بھی آسان ہو جائے گا۔ بشرطیکہ ہمارے پاس دیکھنے والی آنکھیں اور غور و فکر کرنے والے دل بھی ہوں ورنہ صفات اور وہ بھی بہ زبانِ قدرت تو آیتیں بیّن اور واضح ہیں کہ ان صفات کے آئینہ میں ان کے حاملان کو دیکھ کر تو زبان سے بے ساختہ یہی نکلتا ہے کہ "بہر رنگے کہ خواہی جامہ پوشی ——— من انداز قدرت را می شناسم"

لیجئے جنگ خندق سماعت فرمایئے:۔

۴ھ میں دو آدمی قتل ہو گئے۔ معاہدہ کی رُو سے قبیلۂ عامر کے جو دو آدمی قتل ہوئے اُن کے خون بہا کا ایک حصّہ بنو نضیر نے ادا کرنا تھا۔ مگر جب رسول ص اس کی ادائگی کے لیے اُن کے پاس گئے تو انہوں نے در پردہ ایک سازش کی اور بالاخانہ پر ایک شخص کو اس کام پر معمور کیا کہ وہ رسولِ خدا پر اُوپر سے ایک پتھر گرا کر اُن کو ہلاک کر دے۔ آنحضرت ص کو اس ارادہ سے آگاہی ہو گئی اور آپ فوراً مدینہ واپس تشریف لے آئے۔ اس کے بعد بھی اُن لوگوں نے آنحضرت ص کے قتل کی سازشیں جاری رکھیں۔ بالآخر اُن کی سازشوں کو ختم کرنے اور اُن کا زور توڑنے کے لیے اُن کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد بنو نضیر نے اس شرط پر جلاوطنی منظور کی کہ جس قدر مال و اسباب وہ اونٹوں پر لے جا سکیں گے لے جائیں گے۔ چنانچہ یہ لوگ اس طرح اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر خیبر کی جانب روانہ ہو گئے جہاں اُن کا فقید المثال استقبال کیا گیا۔ اب قریش اور یہود کی متفقہ سازشوں میں شدّت اور تیزی پیدا ہو گئی۔ مکّہ سے مدینہ تک جتنے قبائل دشمنانِ اسلام میں سے تھے اُن سب کو اکھٹا کیا جانے لگا اور مدینہ پر حملہ کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئیں۔ ان قبائل عرب میں قریش مکّہ کے ساتھ قبیلۂ غطفان، بنو اسد، بنو سلیم اور بنو سعد بھی شامل تھے اور اس طرح جلد ہی ایک لشکر گراں تیار ہو کر مدینہ کی جانب بڑھا۔ یہ فوج کثیر جس کی تعداد دس سے سترہ ہزار تک بتائی جاتی ہے، بہترین ہتھیاروں سے لیس تھی اور اس کو تین حصّوں پر تقسیم کیا گیا تھا۔ غطفان کے فوجی دستے عُیَینہ بن حفصِ فزاری کے تحت دیے گئے یہ شخص عرب کا مشہور سردار تھا۔ بنو اسد کے جوان طلیحہ کی کمان میں تھے اور ابو سفیان بن حرب کو سپہ سالارِ کل بنایا گیا تھا۔

آنحضرت ص کو جب یہ خبریں پہنچیں تو آپ نے اصحاب سے مشورہ کیا۔ لوگوں نے مختلف تدبیریں بیان کیں لیکن آپ ص نے حضرت سلمان فارسی کی رائے کو پسند فرمایا۔ حضرت سلمان

ایرانی طریقۂ جنگِ خندق سے واقف تھے۔ آپ نے عرض کی کہ کھلے میدان میں جنگ کرنے کی بجائے ایک محفوظ مقام میں اپنے لشکر کو جمع کرکے اُن کے اطراف میں ایک خندق کھودی جائے جہاں دُشمنوں کے حملہ کا خطرہ ہوسکتا ہے۔ مدینہ میں تین جانب مکانات اور نخلستان کا سلسلہ تھا جو شہر پناہ کا کام دیتا تھا چُنانچہ شام کے رُخ پر جو فاصلہ کھُلا ہوا تھا اُس کو پُر کرنے کے لیے کوہِ اُحد کی جانب راتج تک فاصلہ ناپ کر بیس بیس اور تیس تیس قدم ہر مہاجر و انصار کو کھدائی کے لیے دیئے گئے۔ گہرائی پانچ گز رکھی گئی۔ آنحضرتؐ خود بھی خندق کی کھُدائی میں مصروف تھے۔ کھدائی کرتے کرتے کچھ لوگ آنحضرتؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ ایک پتّھر اتنا وسیع اور سخت ہے کہ باوجود ایک گروہ کی کوششوں کے قطعاً نہیں ٹوٹتا۔ آپ وہاں پہنچے۔ کدال سے تین ضربیں لگا کر اُس پتّھر کو تودۂ خاک کر دیا۔ ہر ضرب پر ایک روشنی نمودار ہوئی جس میں لوگوں نے ملکِ شام، مدائن اور یمن کے شہر اور محلات دیکھے۔ آپ نے سب کو مطلع کیا کہ عنقریب یہ ممالک تمہارے قبضۂ قدرت میں ہوں گے۔ یہ واقعہ ذوقعدہ ۵ھ کا ہے۔ غرض لشکرِ کفّار کے بالمقابل آنے سے تین روز قبل خندق تیّار ہوگئی۔ آنحضرتؐ نے مستورات کو محفوظ قلعوں میں بھجوا دیا اور سُلع کی پہاڑی کو پُشت پر رکھتے ہوئے صف آرائی کی۔ اور بنو قریظہ کے حملہ کے اندیشے کو مدِّ نظر رکھ کر سلمہ بن اسلم کو دو سو آدمیوں کے ساتھ متعین کیا کہ اُدھر سے کوئی حملہ نہ ہونے پائے۔ جیسا کہ خیال تھا وہی ہُوا اور بنو قریظہ نے بھی رسولؐ سے عہد شکنی کی اور وہ قریش کے بہکائے میں آگئے۔ لیکن مسلمانوں کی جاسوسی اور جوڑ توڑ سے ایسا ہوگیا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کا اعتماد کھو بیٹھے اور جنگ میں کفّار کی طرف سے عملاً حصّہ لینے کی بجائے قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہے۔

اِدھر دشمنانِ اسلام کا کثیر التعداد لشکرِ جرّار دیکھ کر اصحابِ رسولؐ کا دہشت

کے مارے بُرا حال تھا۔ اس حالتِ زار کا نقشہ قرآن نے کچھ اس طرح کھینچا ہے "اذ جاؤکم من فوقکم ومن اسفل منکم واذ زاغت الابصار و بلغت القلوب الحناجر و تظنون باللہ الظنونا ھنالک ابتلی المومنون و زلزلوا زلزالا شدیداہ" احزاب آیت ۱۰-۱۱ ۔ جب کہ دشمن اوپر کی طرف اور نشیب کی طرف سے آپڑے اور جب آنکھیں ڈگنے لگیں اور کلیجے منہ کو آگئے اور تم خدا کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے تب مسلمانوں کی جانچ کا وقت آگیا اور وہ بڑے زور کے زلزلے میں ڈالدیئے گئے)۔

بدحواسی، خوف و سراسیمگی نے رسولؐ کے ساتھیوں کا پردہ چاک کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ منافقین نے آنحضرتؐ سے اپنے اپنے گھروں کو جانے کی اجازت طلب کرنا شروع کردی۔ اس بزدلی کے عالم کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے:۔

"یقولون ان بیوتنا عورۃ وما ھی بعورۃ ان یریدون الا فراراہ (احزاب آیت ۱۳ :۔ کہتے ہیں کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں اور وہ غیر محفوظ نہیں ہیں بلکہ اُن کو بھاگنا مقصود ہے)۔ لیکن کچھ مومنین ایسے بھی تھے جن کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔

"ولما را المومنون الاحزاب قالوا ھذا ما وعدنا اللہ و رسولہ وصدق اللہ ورسولہ وما زادھم الا ایمانا و تسلیما" (احزاب آیت ۲۲ :۔ جب مومنون نے قبائل کی فوجیں دیکھیں تو بول اٹھے کہ یہ وہی ہے جس کا وعدہ خدا نے اور اُسکے رسولؐ نے کیا تھا اور خدا اور اُس کا رسولؐ دونوں سچے تھے۔ اور اس بات نے اُن کے یقین اور اطاعت کو اور بھی بڑھا دیا)۔

مسلمانوں کو محصور ہوئے تقریباً ایک ماہ گزر گیا یہاں تک کہ فاقے ہونے لگے۔ محاصرہ کی سختی دیکھ کر آنحضرتؐ نے خیال کیا کہ کہیں انصار جی نہ چھوڑ بیٹھیں۔ آپؐ نے حضرت سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ، جو رؤسائے انصار تھے، اُن کو بلا کر مشورہ کیا کہ

مدینہ کی پیداوار کا ایک ثلث غطفان کو دے کر اُن سے معاہدہ کر لیا جائے۔ مگر دونوں حضرات نے انتہائی مستقل مزاجی کا ثبوت دیا اور کہا کہ یا رسول اللہ حالت کفر میں تو ہم سے کوئی خراج نہ لے سکا تو اب جبکہ اسلام میں ہماری بلند منزلت ہے ہم سے کوئی ایسا کرنے کی جرأت کیسے کر سکتا ہے؟ آنحضرتؐ یہ سُن کر خوش ہوئے اور جنگ کے لئے ہی کمر بستہ رہنے کی ترغیب دی۔

المختصر، جب مسلسل تیر اور پتھر برسانے سے کچھ نہ بن سکا تو کفار نے تہیہ کر لیا کہ کسی نہ کسی طرح خندق کو پار کیا جائے۔ چنانچہ ایک مقام پر جہاں خندق کا عرض کم پایا دشمن کی فوج کے تین مشہور بہادر، عمر ابن عبدود، ہبیرہ بن وہب اور ضرار بن خطاب اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا کر خندق کے اِس پار آ گئے اور مسلمانوں کے مقابل ہوئے۔ ان میں سب سے زیادہ جری عمر ابن عبدِ وَد تھا جو عرب میں ایک ہزار سواروں کے برابر مانا جاتا تھا۔ یہ جنگجو بدر کی لڑائی میں زخمی ہوا تھا اور اُس روز قسم کھائی تھی کہ جب تک بدر کا بدلہ نہ لے لے گا اپنے بالوں میں تیل نہ ڈالے گا۔ جونہی مسلمانوں نے عمرو کو دیکھا، سب کے سب خوفزدہ ہو کر جناب رسولِ خداؐ کے پیچھے آ گئے۔ مہاجرین میں سے ایک شخص نے اپنے ساتھی سے کہا "دیکھتے ہو تم اِس شیطان عمرو کو۔ خدا کی قسم کوئی بھی اِس کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ چلو محمدؐ کو اس کے سامنے کر دیں کہ وہ ان کو قتل کر دے تاکہ ہم سب کے سب اپنی قوم سے جا ملیں۔"

بس اُسی وقت خدائے عزوجل نے احزاب کی ۱۸، ۱۹ آیات نازل فرمائیں "قد یعلم اللّٰہ المعوقین منکم والقائلین لاخوانہم ھلم الینا ج ولا یاتون الباس الا قلیلا ۝ اشحۃ علیکم ج فاذا جاء الخوف رایتہم ینظرون الیک تدور اعینہم کالذی یغشیٰ علیہ من الموت ج فاذا ذھب الخوف سلقوکم بالسنۃ حداد اشحۃ علی الخیرط اولئک

آٹھویں مجلس

لم یومنوا فاحبط اللہ اعمالھم وکان ذالک علی اللہ یسیرا۰ سورہ احزاب۔ آیت ۱۸-۱۹

(ترجمہ:۔ تم میں سے جو لوگ (دوسروں کو) جہاد سے روکتے ہیں خدا اُن کو خوب جانتا ہے اور اُن کو بھی خوب جانتا ہے جو اپنے بھائی بندوں سے کہتے ہیں کہ ہمارے پاس چلے بھی آؤ اور خود بھی (فقط پھندا چھڑانے کو) لڑائی (کے کھیت) میں بس ایک ذرا سا آکر تم سے اپنی جان چرائی (اور چلدیئے) اور جب (اُن پر) کوئی خوف (کا موقعہ) آپڑا تو تم دیکھتے ہو (یاس سے) تمہاری طرف دیکھتے ہیں (اور) اُن کی آنکھیں اس طرح گھومتی ہیں جیسے کسی شخص پر موت کی بے ہوشی چھا جائے۔ پھر جب خوف (کا موقعہ) جاتا رہا (اور ایمانداروں کی فتح ہوئی تو مال غنیمت پر گرتے پڑتے فوراً تم پر اپنی تیز زبانوں سے طعنہ کرنے لگے۔ یہ لوگ (شروع سے) ایمان ہی نہیں لائے (فقط زبانی جمع خرچ تھا) تو خدا نے بھی اُن کا کیا کرایا سب اکارت کر دیا۔ اور یہ تو خدا کے واسطے ایک نہایت آسان بات تھی)۔

عمرؔ ابنِ عبدوَدّ نے اپنا نیزہ زمین پر گاڑ دیا اور گھوڑے کو گھماتے ہوئے یہ رجز پڑھنے لگا "میں تم سے باآوازِ بلند کہتے کہتے تھک گیا ہوں کہ آیا تم میں کوئی لڑنے والا ہے جو نکلے۔ میں بہادر اور دلیر کی جگہ کھڑا ہوں جہاں کہ شجاع بھی بزدلی کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح ہمیشہ لڑائی اور مصائب کی طرف میں ایسا ہی جھپٹ کر جاتا رہا۔ واقعی بات یہ ہے کہ مرد میں شجاعت اور سخاوت ہی بہترین اخلاق ہیں"۔

جنابِ رسولؐ خدا نے مسلمانوں کو، بالخصوص اپنے اصحاب کو جو دائیں بائیں تھے مخاطب کر کے فرمایا "تم میں سے ہے کوئی ایسا جو اس کتے کے بھونکنے کو بند کر دے؟" کسی نے آنحضرت کی بات کا جواب نہ دیا۔ بلکہ مورخین یہ لکھتے ہیں کہ جب سرکارِ دو عالمؐ نے اصحاب سے پوچھا کہ اس کے مقابلہ کو کون جاتا ہے تو اُس وقت تمام لشکرِ اسلام کا یہ حال تھا جیسے اُن کے سروں پر طائر بیٹھے ہوں۔ اب سروں پر

جانور بیٹھنے کی شرح بھی سُن لیں۔ آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ اکثر گائے و بھینسوں کے کانوں کے اندر اور اُن کے سینگوں کی جڑوں میں اناج کے دانے جمع ہو جاتے ہیں۔ پرندے اُن کے سروں پر آ کر بیٹھتے ہیں اور اُن دانوں کو نکال نکال کر کھاتے ہیں۔ یہ گائیں بھینسیں اس ڈر سے کہ کہیں چڑیاں اُڑ نہ جائیں آنکھیں بند کر کے بالکل ساکت بیٹھی رہتی ہیں۔ بعینہٖ یہی حال اُن اصحاب کا تھا جن سے رسولِ اکرمؐ عمر ابنِ عبدِ وُدّ کے مقابلے کے لئے جانے کو کہہ رہے تھے۔ صرف جناب امیرالمومنین حضرت علیؑ لبیک کہتے اور عرض کی یا رسول اللہ! میں حاضر ہوں۔" تین مرتبہ آنحضرتؐ نے اسی طرح ارشاد فرمایا اور تینوں مرتبہ صرف حضرت علیؑ ہی کی طرف سے ایسا ہی جواب ملا تو آپؐ نے فرمایا۔ "یا علیؑ! یہ عمر بن عبدِ وُدّ، شہسوارِ میدانِ یلیل ہے۔"

حضرت علیؑ نے جواباً عرض کی کہ "یا رسول اللہ! میں بھی تو علیؑ ابن ابی طالب ہوں۔" اس پر آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کو اپنے قریب بلایا اور سر پر اپنے دستِ مبارک سے عمامہ باندھا۔ ذوالفقار عطا فرمائی۔ دُعا کی اور فرمایا کہ جاؤ اور اُس سے لڑو۔ مورخین لکھتے ہیں کہ آپؐ نے یہ بھی باآوازِ بلند فرمایا کہ آج کُل ایمان کُل کفر کے مقابلہ پر جا رہا ہے۔

حضرت علیؑ دوڑتے ہوئے عمر کی طرف چلے اور یہ رجز پڑھتے جاتے تھے "ترجمہ۔ دمقبول ضمیر!۔ کیوں جلدی کرتا ہے؟ تیری دریدہ دہنی کا دندان شکن جواب دینے والا جو کسی طرح عاجز نہیں آ پہنچا۔ جس کا ارادہ پکّا ہے اور جو صاحبِ بصیرت ہے اور سچائی ہی تو کامیاب ہونے والوں کو بلاؤں سے نجات دیتی ہے۔ مجھے خدا کی ذات سے قوی اُمید ہے کہ میری گہری ضربت جس کا شُہرہ دِل ہلا دینے والی لڑائی کے بعد بھی باقی رہے گا تیرے لاشہ پر رونے والی عورتوں کو جمع کر دے گی۔" عمر نے کہا تم کون ہو؟ حضرت نے جواب دیا "میں علیؑ ابن ابی طالب، جناب رسولِ خداؐ کا ابنِ عم اور داماد ہوں۔" عمر نے کہا "خدا کی قسم تمہارے والد میرے بڑے دوست اور ہم صحبت

تھے۔ مجھے بُرا معلوم ہوتا ہے کہ میں تم کو قتل کروں۔ تمہارے چچازاد بھائی نے جب تمہیں میرے مقابلے کے لیے بھیجا تو اس کا اندیشہ بھی نہ کیا کہ میں تم کو اس نیزہ میں پرو کر اُٹھالوں گا اور زمین و آسمان کے مابین تم کو ادھر میں چھوڑ دوں گا کہ نہ تم زندہ ہی رہو گے اور نہ جلد مر ہی جاؤ گے۔"

جناب امیرؑ نے فرمایا "میرے ابنِ عم خوب جانتے ہیں کہ اگر تو مجھے قتل کردے گا تو میں جنت میں ہوں گا اور تو دوزخ میں۔ اور اگر میں تجھ کو مار ڈالوں گا تب بھی تیرا ٹھکانہ دوزخ ہی ہوگا اور میرے لئے بہشت ہی ہوگی۔" عمر نے کہا "اے علیؑ! کیا خوب۔ تمہارے ہی دونو میٹھے!! یہ تو دھاندلی کی تقسیم ہے۔" آپ نے فرمایا "عمر! اِن فضول باتوں کو جانے دے اور معاملہ کی بات کر۔ سُنا ہے لڑائی کے وقت جو شخص تین حاجتیں تیرے سامنے پیش کرے گا ان میں سے تو ایک کو ضرور قبول کرے گا۔" عمر نے جواب دیا "ہاں ٹھیک ہے۔" حضرت علیؑ نے فرمایا "تو سُن! اوّل تو اسلام لے آ۔" اس نے کہا "یہ نہیں ہوسکتا۔" آپؑ نے کہا "تو پھر لڑائی سے واپس چلا جا۔" اس نے کہا "میں قریش کی عورتوں کے طعنے نہیں سُن سکتا۔" آپؑ نے کہا کہ "تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ تو مجھ سے گھوڑے سے اُتر کر جنگ کر اس لئے کہ میں پیادہ ہوں۔" یہ سُنتے ہی وہ فوراً اپنے گھوڑے سے کود پڑا اور اس کے چاروں پاؤں کاٹ ڈالے۔ بولا "مجھے گمان بھی نہ تھا کہ کوئی عرب اس شان سے مجھے اپنی لڑائی کے لئے بلائے گا" اور اس نے تلوار کھینچی۔ ایک وار کیا جو امیرالمومنینؑ کی سپر کو کاٹ کر سرِ مبارک تک پہنچا۔ ادھر ذوالفقار چلی اس ایک ضربتِ حیدری میں بجلی جیسی چمک اور سُرعت تھی کہ پلک جھپکنے میں عمر زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں کٹ چکی تھیں۔ اس کے گرنے سے غبار بلند ہوا تو منافقین کہنے لگے کہ علیؑ مارے گئے۔ مگر جب فضا صاف ہوئی تو انہوں نے

اپنی حیرت زدہ آنکھوں سے حضرت علیؑ کو عمر کے سینہ پر سوار اُس کا سر تن سے جُدا کرتے ہوئے دیکھا۔ تاریخ و احادیث میں یہ بھی ہے کہ سرورِ کائناتؐ نے فرمایا "جنگِ خندق کے دن علیؑ کی ایک ضربت ثقلین کی عبادت سے افضل ہے"۔ ضرار اور ہبیرہ جو قریب تھے، عمر کے قتل ہوتے ہی حضرت علیؑ پر جھپٹے مگر جونہی ذوالفقار کو اپنے اُوپر آتے دیکھا تو دُور ہٹ گئے۔ حضرت علیؑ نے عمر کا سر کاٹا اور آپ شیرِ نیستاں کی مانند جھومتے ہوئے آنحضرتؐ کی جانب چلے۔ یہ شعر آپ کی زبان پر تھا۔

"انا علیؑ و بن عبدالمطلبؑ　　　خیر للفتیٰ الموت من الھرب"

(ترجمہ:۔ میں علیؑ اور عبدالمطلب کا فرزند ہوں۔ جوانمرد کے لئے بھاگنے سے مرنا بہتر ہے)

اسی جنگ کا ذکر ہے کہ ایک روز ایک دو نہیں بلکہ بیک وقت گیارہ آدمی خندق پار کرکے آگئے۔ امیرالمومنینؑ نے اُن کے دفع کرنے کے لئے حملہ کیا۔ اُس وقت حضرت عمارؓ یا ابوذر غفاریؓ ان دونوں میں سے کوئی ایک بزرگ وہاں موجود تھے انھوں نے دیکھا کہ اُن گیارہ خندق کے اِس پار آنے والوں میں سے ہر ایک کے پیچھے علیحدہ علیحدہ گیارہ علیؑ جا رہے ہیں تو وہ بزرگوار بہت حیران ہوئے اور قبل اس کے وہ کچھ کہیں مولاؑ نے خاموش رہنے کا حکم دیا۔

INTERNAL CAPACITIES OF HUMAN MIND (نفس انسانی کے قوائے باطنی) پر دورِ حاضر میں جو تحقیقات ہو رہی ہے اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ نفس انسان اگر کامل تربیت حاصل کرلے تو ایک ہی وقت میں اپنے آپ کو بہت سے مقامات پر ظاہر کرسکتا ہے۔

عمر کے قتل کے بعد ہبیرہ اور ضرار جو اُس کی حمایت میں خندق کے اس پار موجود تھے مگر ذوالفقارِ حیدری سے بھاگ کر دُور ہٹ گئے تھے پھر سامنے آگئے۔ رسولؐ خدا نے اس مرتبہ زبیر کو ہبیرہ کے مقابلے کے لئے بھیجا۔ زبیر نے ہبیرہ کے سر پر ایک ایسی تلوار ماری کہ اُس کا سر دو ٹکڑے ہوگیا۔ اسکے بعد آنحضرتؐ نے حضرت عمرؓ کو

ضرار کے لئے بھیجا۔ آپ دُور سے ہی اُس پر تیر چلانا چاہتے تھے کہ اُس نے ٹوکا اور کہا کہ اے عُمر اگر تُو نے مجھ پر تیر چلایا تو میں قسم کھاتا ہوں کہ بنی عدی کے قبیلہ کا ایک آدمی بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ حضرت عُمر پلٹ پڑے اور ضرار نے پیچھا کرتے ہوئے آپ کے سر پر اپنا نیزہ چھوتے ہوئے کہا "میں تجھ کو چھوڑ رہا ہوں، آج کے دن کا احسان یاد رکھنا!"

اُدھر نوفل نے حملہ کر دیا تو حضرت علیؑ پھر میدان میں تھے اور آپ نے اُس کا پیچھا کیا یہاں تک کہ وہ خندق میں جا گرا۔ آپ نے خندق میں کود کر اُسے قتل کیا۔ یہ دیکھ کر ضرار بھاگ گیا۔

محاصرہ طول پکڑ گیا اور طرفین کے لوگ تنگ آ گئے۔ جنابِ امیرؑ رات بھر لشکر کے گرد چکر لگایا کرتے اور جیسے ہی کوئی دشمن خندق پار کر کے آنکلتا وہ ذوالفقار کا شکار ہو جاتا۔ آپ خندق کو عبور کر کے لشکرِ کفار میں بھی گھس جاتے اور صبح ہوتے ہی اپنے مرکز کی طرف لوٹ آتے۔

مگر اصحابِ رسولؐ اس درجہ دل برداشتہ اور خوف زدہ تھے کہ کسی طرح بھی رسولؐ خدا پر اعتماد نہ کرتے تھے اور ایک ایک کر کے کسی نہ کسی بہانہ بھاگ جانے کی فکر میں لگے رہتے۔ آپ نے اُن کی تسلی کے لئے بارگاہِ ایزدی میں دُعا کی جو مختصراً یہ تھی: "اے پروردگار تو اس قوم کے شر کو اپنی قوت اور طاقت سے ہماری طرف سے پھیر دے اور ہمارے غم والم اور بے چینی کو دُور کر دے" جبرئیلِ امین نے فوراً خبر دی کہ آپ کی دُعا قبول ہوئی اور خداوندتعالیٰ نے ملائکہ اور ہوا کو قریش پر مسلّط کر دیا ہے۔ سردی میں تندی آچکی تھی اُس پر ہوا کے طوفان نے کُفّار کے خیموں کی طنابیں اُکھیڑ دیں، کھانے کی دیگچے چولھوں پر اُلٹ اُلٹ جاتے تھے۔ اسی اثنا میں آنحضرتؐ نے حذیفہ یمانی کو آواز دی مگر جواب نہ آیا۔ دو مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ تیسری بار جا کر حذیفہ نے لبیک کہا۔ آنحضرتؐ

نے استفسار کیا تو حذیفہ نے عرض کی کہ بھوک اور سردی کے سبب بول نہ سکا، اب حاضر ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ دشمن کی خبر لاؤ۔ خداوند تعالیٰ نے ہوا کو اُن پر مسلط کر دیا ہے اور وہ بھاگ رہے ہیں اور دیکھو واپس آنے تک کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا۔ حذیفہ کہتے ہیں کہ گو سردی بہت تھی مگر میں جونہی خندق کے اُس پار پہنچا تو ایسا معلوم ہُوا گویا حمام میں آگیا ہوں۔ ایک بڑے خیمہ کے پاس گیا تو دیکھا کہ آگ کبھی جلتی ہے کبھی بجھ جاتی ہے۔ پاس ہی ایک اور خیمہ تھا اُس میں اُبوسُفیان نیچے آگ لیے بیٹھا تھا۔ پھر بھی وہ سردی کی شدت سے کپکپا رہا تھا۔ وہ بولا، "اے گروہِ قریش! اگر محمدؐ کے خیال کے مطابق ہماری جنگ آسمان والوں سے ہے تو ہم ہرگز اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور اگر ہماری لڑائی زمین والوں سے ہے تو ہم لڑ سکتے ہیں۔" پھر کہا کہ "ہر شخص اپنے پہلو میں غور کر کے دیکھ لے کہ محمدؐ کا کوئی جاسوس تو نہیں آن بیٹھا۔" حذیفہ نے سب سے پہلے اپنی دائیں جانب بیٹھے ہوئے آدمی سے پوچھا "تو کون ہے؟" اُس نے کہا "عمرو بن عاص"۔ پھر بائیں جانب والے سے یہی سوال کیا تو اُس نے جواب دیا "معاویہ بن سُفیان"۔ یہ اس لیے کیا کہ کوئی حذیفہ پر شک میں پہل نہ کرے۔ اُبوسفیان نے پھر خالد بن ولید سے کہا کہ مجھے اور تمہیں لازم ہے کہ کمزوروں کے پیچھے رہیں۔ اور سب کو رات ہی کو کُوچ کرنے کا حکم دیا۔ باہر آکر گھبراہٹ میں ابوسُفیان اپنے بندھے ہوئے اونٹ پر ہی سوار ہو گیا۔ حذیفہ کہتے ہیں کہ اگر رسُولِ خداؐ نے کوئی اور حرکت کرنے سے منع نہ کیا ہوتا تو ابوسُفیان میرے قابو میں تھا میں اُس کو وہیں قتل کر دیتا۔

الغرض موسم کی سختی، آندھیوں کا زور شور، رسد کی قلت اور یہودیوں کا نقضِ عہد کی وجہ سے ساتھ نہ دینا۔ اِن تمام اسباب نے کفار کو محاصرہ اُٹھانے پر مجبور کر دیا۔ طبلِ رحیل بجا اور فوجوں نے واپسی شروع کر دی۔ اس طرح بیس بائیس روز کی غبار آلود فضا مدینے کے اُفق سے صاف ہوئی۔ قرآن نے اس آندھی کو اس طرح

بیان کیا ہے" یا ایہا الذین آمنوا اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جاءتکم جنود فارسلنا علیہم ریحا و جنودا لم تروھا (احزاب ۹)۔ (مسلمانو! خدا کے اس احسان کو یاد کرو جب تم پر فوجیں آپڑیں تو ہم نے اُن پر آندھی بھیجی اور فوجیں بھیجیں جو تم کو دکھائی نہیں دیتی تھیں)۔ (نوٹ:۔ اس جنگ کے بیشتر اقتباسات شبلی کی سیرت النبیؐ جلد اوّل سے لیے گئے ہیں)۔

سامعین اس جنگِ خندق کے ذکر سے ایک اور خندق یاد آگئی۔ نویں محرم کی شام کو عمرِ سعد فوج لے کر خیام امامِ عالی مقام کی طرف بڑھا۔ امامِ مظلوم نے حضرت عباسؑ علمدار کو بھیجا کہ ان اشقیا سے پیش قدمی کا سبب دریافت کریں۔ جناب عباسؑ لشکرِ بدکردار کی طرف بڑھے تو عمرِ سعد ملعون آگے آگے تھا حضرت نے اُس سے پیش قدمی کا سبب پوچھا تو ملعون گویا ہُوا کہ فرزندِ رسولؐ کو بیعتِ یزید منظور ہے تو خیر ورنہ ہم جنگ کے لیے تیار ہو کر آئے ہیں۔ حضرتؑ نے فرمایا "تم لوگ یہیں ٹھہرو۔ میں امامؑ کی خدمت میں جاتا ہوں اور جو کچھ حکم ملے گا وہ تم تک پہنچاؤنگا۔ حضرت عباسؑ خدمتِ امامِ عالی مقام میں حاضر ہوئے اور اُن ملاعنہ کی گفتار کا مفہوم بعنوانِ شائستہ عرض کیا۔ امام مظلومؑ نے فرمایا کہ "اے بھائی ایک مرتبہ اور جا کر اُن اشرار سے کہو کہ اگر وہ لڑائی کے لیے تیار ہو کر آئے ہیں تو ہمیں ایک شب کی مہلت دیں اور لڑائی کل پر موقوف رکھیں" حضرت عباسؑ واپس ہوئے اور عمرِ سعد کے پاس آکر فرزندِ رسولؐ کا پیغام دُہرایا۔ وہ شقی کہنے لگا کہ "یہ نہیں ہوسکتا۔ ہم ابھی اور اسی وقت فیصلہ چاہتے ہیں"۔ اس پر چند سردارانِ لشکر نے عمر سے کہا کہ ؎

کافر ملک تو مہلتِ جنگ و جدال ہے۔ اے ابنِ سعد! یہ تو پیمبرؐ کا لال ہے

عمرِ سعد کو سردارانِ لشکر کے انحراف کا خوف پیدا ہوا تو کہنے لگا کہ اچھا کل صبح ہی سے لڑائی شروع ہوگی۔ اور یہ کہہ کر فوج کو اپنی جگہ واپس لے گیا۔ حضرت عباسؑ

خدمتِ امامؑ میں پھر حاضر ہوئے اور عرض کی کہ وہ ملاعنہ بدقت تمام ایک شب کی مہلت پر رضامند ہو کر واپس ہوئے ہیں۔ غرض کہ بعد غروبِ آفتاب جب تاریکی شب چھا گئی تو مولا نے فرمایا کہ اعدائے دین سے کچھ بعید نہیں کہ رات میں خیموں پر حملہ کر دیں۔ چنانچہ حفاظتِ خیام کے لئے تین طرف خندق تیار کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اس خندق میں آگ روشن کر دی جائے۔ تمام شب عبادت میں گذری۔ کچھ اصحاب رات بھر خیام کی حفاظت کرتے رہے۔ سحر ہوئی تو حضرت علیؑ اکبر نے اذان دی۔ فضا حسرت و غم میں ڈوب گئی۔ صحرا اُداس تھا۔ خیموں کے اندر اور باہر خاموشی اشکبار تھی۔ اِدھر امام مظلوم نے نماز کی امامت کی اُدھر فوجِ اشقیا نے تیروں کی بارش کر دی۔ بہت سے اصحاب صفوں کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے سینہ سپر شہید ہو گئے۔ اس طرح عاشقانِ اہل البیتؑ نے اپنی جانوں کا پہلا نذرانہ بارگاہِ امام میں پیش کیا پھر ایک ایک کر کے رخصت لیتے گئے اور میدانِ جنگ میں شہید ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ اعزا و اقارب کی باری آئی اور وہ بھی بہت جلد ظلم و جور سے شہید کر دئے گئے۔ اور بالآخر جب ششماہا علیؑ اصغر بھی ایک ملعون کے تیر سہ شعبہ کا نشانہ بن چکا تو مولا خیمہ میں تشریف لائے۔ اک بوسیدہ پیراہن زیب تن کیا۔ سیدِ سجادؑ کو ہوش میں لائے اور کچھ وصیتیں فرمائیں۔ کچھ ہدایات اپنی جاں نثار بہن حضرت زینبؑ کو بھی دیں۔ پھر سب کو باری باری گلے لگایا، سر پہ دستِ شفقت پھیرا، دعائیں دیں، سکینہؑ کو پاس بلا کر خوب پیار کیا اور کہا کہ "بیٹی! ہمارے بعد رونا نہیں۔ ہمارے جانے سے تم کو پانی مل جائے گا اور جب مل جائے تو اپنے ننھے بھائی علیؑ اصغر کو نہ بھولنا۔ بیٹی! یہ جدائی عارضی ہے، سب سے پہلے تم ہی ہم سے ملاقات کرو گی۔ جانِ پدر! صبر کئے رہنا کہ اسی میں خوشنودیٔ رب ہے"۔ پھر سب سے رخصت ہو کر مقتل میں تشریف لائے اور جنگ کرتے ہوئے دریا تک جا پہونچے اس موقع پر مولا نے حضرت عباسؑ کو آواز دی، علیؑ اکبر و قاسمؑ و عونؑ و محمدؑ کو پکارا

اصحاب کو یاد کیا کہ کاش! تم لوگ میری بھی جنگ دیکھتے ۔ یہ کہکر گھوڑے کو اشارہ کیا اور دشمن کی صفوں میں گھس کر زبردست قتال کیا ۔ ابھی مصروف کارزار ہی تھے کہ ہاتف کی ندا آئی ۔ آپ نے جنگ سے ہاتھ روک لیا، تلوار کو میان میں ڈالا اور آخری حجت تمام کر کے کفار سے مخاطب ہو کے فرمایا کہ اب جو کچھ میرے ساتھ کرنا ہے کر گذرو ۔ یہ کہنا تھا کہ ہر طرف سے تیر و تبر و نیزہ و تلوار چلنے لگے ۔ جن ظالموں کے پاس ہتھیار نہ تھے وہ دور سے پتھر ہی مار رہے تھے ۔ غرض دیکھتے ہی دیکھتے آپ کا جسمِ اطہر تیروں سے چھلنی ہو گیا ۔ ہر زخم سے خون بہہ بہہ کر ریت میں جذب ہو رہا تھا ۔ ذوالجناح کا بھی یہی حال تھا ۔ اس عالم میں آپ سواری پر ڈگمگاتے ہوئے ایک نشیب کی جانب آئے تو گھوڑے نے دونوں گھٹنے ٹیک کر آپ کو فرشِ خاک پر آنے میں مدد کی ۔ اس وقت آپ نے فرمایا ۔

"ہے عصر کا ہنگام مناسب ہے اترنا
اس خاک پہ ہے شکر کا سجدہ ہمیں کرنا"

لکھتا ہے یہ راوی کہ بپا ہو گیا محشر
بارہ ستم ایجاد بڑھے کھینچ کے خنجر

اک سیدہ نکلی درِ خیمہ سے کھلے سر
برقع تھا نہ مقنع تھا، موزے تھے نہ چادر

اُس بھیڑ میں آکر وہ ضعیفہ یہ پکاری
اے سبطِ نبیؐ، ابنِ علیؑ، عاشقِ باری

گھوڑا تو ہے کوتل، کدھر اتری ہے سواری
بھیا! بہن آئی ہے زیارت کو تمہاری

فرمایا اشارے سے کہ اے شمرِ ستمگر
زینبؑ نکل آئی ہے، ٹھہر جا ابھی دم بھر

پر جائے بہن بھائی تلک آنے نہ پائی
یاں ہو گئی سید کے سر و تن میں جدائی

قاتل کو نہ گردن کو، نہ شمشیر کو دیکھا
پہونچیں تو سناں پر سرِ شبیرؑ کو دیکھا

عزادارو! بہت سے حضرات واقعاتِ کربلا پر حیران رہ جاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ آیا فرزندِ شیرِ خدا دشمنوں کے دفع کرنے پر قادر نہ تھے؟ تو یہ وسوسہ تو اُن ہی ذہنوں میں آتا ہے جو حقیقت سے بے خبر ہیں ۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ؎

یہ دوسروں کو حکومت جو دے کے بیٹھے ہے
خدا کا نام ہی بس گھر میں لے کے بیٹھے ہے

یہ چاہتے تھے دِل سب کے درد سے بھر دیں
کسی طرح سے مٹا دیں گناہ کی فردیں
خدا سے خلق کو نزدیک اِس طرح کر دیں
خدا کی راہ میں اس واسطے لُٹا گھر دیں
کہ دردِ اُمّتِ عاصی کے دل میں پیدا ہو
قیام درد سے نورِ خفی ہویدا ہو"

سامعین کو چاہیئے اس پہ غور کریں ، فطرتِ الہٰیہ کا اصول ہے کہ اعمال و افعالِ ذمیمہ کے صادر ہونے سے قلب سیاہ ہو جاتا ہے اور مزید صدور سے سیاہی اور بڑھتی ہے۔ صرف درد و اَلم ہی ایسی کیفیات ہیں کہ اِن کے طاری ہونے سے قلب کی سیاہی دُور ہوتی ہے اور نُورِ ایمان تاریکیِ قلب کو زائل کر دیتا ہے۔ حسینؑ شہید نے تزکیۂ قلوب کے لیۓ ایسا سامانِ درد مُہیا کر دیا ہے جس کی مثل و نظیر ملنا محال ہے۔ یہ ایسا احسانِ عظیم ہے کہ اگر ہم قیامت تک بھی روتے رہیں تو اِس کا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا۔ ہم پہ لازم ہے کہ کہتے رہیں :۔

سلام ہو ہمارا اُن ہاتھوں پہ جنھوں نے بھوک و پیاس میں حفاظتِ خیام کے لیۓ خندق تیار کی۔

سلام ہو ہمارا اُن زبانوں پہ جنھوں نے پیاس میں خندق کی گرمی برداشت کی۔

سلام ہو ہمارا اُن اطفال پہ جو العطش العطش کی صدائیں بلند کر رہے تھے۔

سلام ہو ہمارا اُس سَرِ مقدّس پہ جو پسِ گردن سے جُدا کیا گیا۔

سلام ہو ہمارا اُن مخدراتِ عصمت و طہارت پہ جنھوں نے سرِ اقدس کو نوکِ نیزہ پر بلند دیکھا۔

سلام ہو ہمارا اُس سَرِ مقدس پہ جو نیزے کی نوک پر بھی تلاوت کرتا رہا۔

سلام ہو ہمارا اُس مقدس فریاد کرنے والی پہ جس کی یہ صدا آج بھی میدانِ کربلا میں گونج رہی ہے کہ "بھیّا حسینؑ میری غریبی پہ رحم کھاؤ کس جا ہو کس طرف ہو ہمیں بھی وہیں بلاؤ"

اے سر بریدہ قاریٔ قرآن السلام　　نوکِ سناں پہ مرکزِ ایمان السلام
خندق کے بیچ بیٹھی ہوئی بی بی ہو سلام　　خندق کے گرد پھرتے ہوئے صاحبو سلام
خندق سے آتی گرم ہواؤ سلام ہو　　بچوں کی العطش کی صداؤ سلام ہو
خندق جنھوں نے کھودی ان اصحاب کو سلام　　اور آگ بھی جلائی ان اصحاب کو سلام
اے چھینے والی چادرِ زینبؑ سلام ہو　　اے بندھنے والے بازوئے زینبؑ سلام ہو
اے کٹنے والے بازوئے عباسؑ السلام　　اے گرنے والے پرچمِ عباسؑ السلام
اے چھدنے والی مشکِ سکینہؑ سلام ہو　　اے بہنے والے آبِ سکینہؑ سلام ہو
صد پارہ جسمِ قاسمؑ ناشاد السلام　　اے مجتبیٰؑ کے خانۂ برباد السلام
اے عونؑ اے محمدؑ بے جان السلام　　بنتِ علیؑ کے خانۂ ویران السلام
اے پھٹنے والے سینۂ اکبرؑ سلام ہو　　اے چھدنے والی گردنِ اصغرؑ سلام ہو
مشکِ بریدہ کے کھلے تسموں کو بھی سلام　　اور مشک پر گرے ہوئے بچوں کو بھی سلام
خیمے کے در پہ ٹوٹی نیاموں کو بھی سلام　　اصحابِ باوفا کے پیاموں کو بھی سلام
اے پنجتنؑ کی خادمہ فضہؑ سلام ہو　　رخصت کے وقت پردہ اٹھایا سلام ہو
جو بعدِ قتل کھو گئے بچے انھیں سلام　　اونٹوں سے گر کے مر گئے بچے انھیں سلام
اے جل کے گرنے والے خیامِ حرم سلام　　اے راکھ ہونے والے خیامِ حرم سلام
اے منھ کے بل گرے ہوئے بیمار السلام　　اے بے کسوں کے قافلہ سالار السلام
پچھلے پہر خیام کے دورے کو بھی سلام　　قربانیوں کا جائزہ لینے کو بھی سلام

مولاؑ یہ سب ہمارے لئے تو نے کر دیا
رحمٰن دیار رحیم و شفیع تجھ پہ ہو سلام

نویں مجلس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ، الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علےٰ سید المرسلین خاتم النبیین وشفیع المذنبین ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین الطاھرین المعصومین من یومنا ھذا الی یوم الدین امابعد فقد قال اللہ سبحانہ تعالیٰ فی کتابہ المجید وفرقانہ الحمید وقول الحق ، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ، یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین ۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

ابتدا مجلس ہی میں سامعین کو یہ یاد دلا دینا بے سود نہ ہوگا کہ سورہ بقرے بائیسویں رکوع کی پہلی آیت " لیس البر ان تولوا وجوھکم " الخ جس کا ذکر ہم گزشتہ مجالس میں کرتے چلے آئے ہیں اس نوعیت سے ایک منفرد آیت ہے کہ اس میں صادقین اور متقین کا ذکر یکجا کیا گیا ہے اور اسلئے بھی کہ اس آیۂ شریفہ میں صادقین کی نشاندہی کے لئے انکی جملہ صفات کی ایک مکمل فہرست باری تعالیٰ نے خود فراہم کر دی ہے اور اس آیت کی روشنی میں ہمارا کام یعنی صادقین کا تعین کر کے انکی مطابعت کرنا یوں آسان ہو گیا ہے کہ جو ذوات بھی ان صفات کی حامل نظر آئیں خداوند جلیل کی نگاہ میں وہی صادقین کے لقب کی مستحق

ہوں گی اور "کونوا مع الصّادقین" میں انہیں کے ساتھ ہو جانے کا حکم رضائے الہیٰ کا موجب ہوگا۔ چنانچہ ان صفات پر مجلس بہ مجلس گفتگو ہوتی آئی ہے۔ سب سے آخری صفت یعنی حین الباس (صبر کرنے والے لڑائی کی سختی میں) کے ضمن میں ہم نے چھٹی مجلس میں جنگِ بدر، ساتویں میں جنگ احد اور آٹھویں میں جنگِ خندق جیسے تاریخ اسلام کے مشہور غزوات کا بہ تفصیل ذکر کیا اور تاریخ کے مستند واقعات کی روشنی میں اس امر کا بخوبی جائزہ لیا کہ لڑائیوں کی سختیوں میں صبر کرنے والے کون تھے جنھوں نے ثابت قدمی اور پامردی کا ثبوت دیا اور وہ کون تھے جو دل چھوڑ بیٹھے اور ہمّت ہار گئے۔

اس منزل پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "صبر" کے صحیح معنیٰ پر بھی توجہ کی جائے۔ نہ صرف اس لئے کہ یہ لفظ اس آیۂ مبارکہ میں موجود ہے بلکہ بالخصوص اس لئے کہ اس لفظ کے معنیٰ غلط العام جیسی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ عموماً اور سطحی طور پر صبر اور صابر کا لفظ سنتے ہی عوام کا ذہن بے چارگی، مجبوری اور کسمپرسی جیسی مایوس کن اور سرد کیفیات کی طرف منتقل ہوتا ہے اور "صابر" سے کسی ایک ایسے شخص کا خاکہ عوام کے اذہان میں اُبھرتا ہے جو مرقع یاس اور بے دست و پا ہو، جس پر حالات نے غلبہ حاصل کر لیا ہو اور جس پر "مرتا کیا نہ کرتا" کی مثل صادق آتی ہو۔ صبر اور صابر کے یہ مفاہیم صحیح نہیں ہیں بلکہ گمراہ کن ہیں۔ حقیقت اسکے برعکس ہے۔ حق یہ ہے کہ صفت صبر شجاعت کا نچوڑ اور اس کی روح ہے۔ صابر اسے کہتے ہیں جو انتہائی نامساعد حالات میں پامردی اور استقلال کا ثبوت دے۔ مضطرب، افسردہ اور سپر انداختہ نہ ہو بلکہ اس کے صبر سے اس کی شجاعت کے سونے پر وہ سہاگہ چڑھے کہ اس کے بعد بھی اس کا ذکر قلوب کو حوصلہ و ہمّت اور خون کو حدّت و حرارت بخشے اور رہتی دُنیا تک جب بھی اور جہاں کہیں بھی ویسے ہی نامساعد حالات سے انسانیت دوچار

فیض ہمیشہ جاری ہی رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ؎

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

جنگ خندق میں بنی قریظہ کا ذکر یہاں پر چند وجوہ کی بنا پر ناگزیر ہے جو اس سے قبل کی مجلس میں پیش نہیں کیا گیا تھا۔ وہ وجوہ اور غلط فہمیاں جو اس واقعہ سے متعلق ہیں ابھی آپکے سامنے پیش کی جاتی ہیں۔ واقعہ یوں ہے:۔

خندق کے تیار ہونے کے تین دن بعد قریش آئے۔ ان کے ہمراہ حی بن اخطب بھی تھا اس شخص کا تعلق بنی نضیر سے تھا۔ بنی نضیر کے متعلق گزشتہ مجلس میں ذکر ہوا تھا کہ سنہ ھ میں قبیلۂ عامر کے دو آدمی قتل ہوئے تھے۔ ان مقتولین کے خون بہا کا ایک حصہ بنی نضیر کو ادا کرنا تھا مگر جب رسول اکرم اس کی ادائیگی کے لئے ان کے پاس گئے تو انھوں نے دَرپردہ ایک سازش کی اور بالاخانہ پر ایک شخص کو اس پر معمور کیا کہ رسول پر اوپر سے ایک پتھر گرا کر آپ کو ہلاک کر دے۔ آنحضرتؐ کو اس ارادہ سے آگاہی ہو گئی اور آپ فوراً مدینہ واپس تشریف لے آئے۔ اسکے بعد بھی ان لوگوں نے آنحضرتؐ کے قتل کی سازشیں جاری رکھیں بالآخر ان کی سازشوں کو ختم کرنے اور ان کا زور توڑنے کے لئے ان کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد بنی نضیر نے اس شرط پر جلاوطنی منظور کی کہ جس قدر مال و اسباب وہ اونٹوں پر لے جاسکیں گے لے جائیں گے۔ چنانچہ یہ لوگ اس طرح اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر خیبر کی جانب روانہ ہو گئے۔ جب بنی نضیر کو مدینہ سے جلا وطن کیا گیا تو یہ شخص بھی ان کے ساتھ جلاوطن ہوا۔ بعد میں اسی شخص نے پروپیگنڈہ کر کے بہت سے قبیلوں کو قریش کا حامی بنایا۔ قریش تو وادی عقیق میں ٹھہر گئے اور حی بن اخطب رات کے وقت بنی قریظہ کے پاس آیا۔ وہ لوگ اپنے قلعہ میں تھے اور جو عہد جناب

رسولِ خدا سے کر چکے تھے اس پر قائم تھے۔ حی نے قلعہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ کعب نے آواز سُنی تو اپنی زوجہ سے کہا کہ "یہ تیرا بھائی ہے جس نے اپنی قوم میں تو نحوست پھیلا دی اب یہاں آیا ہے کہ ہم پر بھی اپنی نحوست کا اثر ڈالے، ہم کو ہلاک کرے اور ہم کو یہ مشورہ دے کہ محمدؐ کے اور ہمارے مابین جو عہد ہے اسے ہم توڑ دیں حالانکہ محمدؐ نے اپنے عہد کو برابر پورا کیا ہے اور پڑوسیوں کے ساتھ جو اچھے سے اچھا سلوک کیا جاتا ہے وہ ہمارے ساتھ کیا ہے"۔ اس نے دروازے پر آکر پوچھا۔ تو کون ہے۔ حی نے کہا۔ میں حی بن اخطب ہوں۔ میں تیرے پاس دائمی عزت لے کر آیا ہوں۔ کعب نے کہا نہیں تو میرے لئے دائمی ذلت کا سامان لے کر آیا ہے۔ وہ بولا: اے کعب قریش مع اپنے سرداروں اور افسروں اور بنی کنانہ کے وادیٔ عقیق میں اُترے ہوئے ہیں اور بنی فزارہ اپنے افسروں سمیت زغابہ میں مورچہ بندی کئے ہوئے ہیں اور بنی سلیم وغیرہ کا لشکر قلعہ بنی ذبیان کے قریب پڑا ہوا ہے۔ اتنی کثیر التعداد فوج سے محمدؐ اور ان کے اصحاب بچ کر کہیں بھی نہیں جا سکتے۔ اے کعب تو دروازہ کھول دے اور جو عہد تو نے محمدؐ سے کیا ہے اسے توڑ دے۔ کعب نے جواب دیا میں تیرے لئے ہرگز دروازہ نہیں کھولوں گا تو جہاں سے آیا ہے وہیں واپس چلا جا۔ حی نے کہا تو اس لئے دروازہ نہیں کھولتا کہ اگر ہم تیرے پاس آئیں گے تو تجھے کھانا کھلانا پڑے گا۔ میں تجھے اس تکلیف کی معافی دیتا ہوں اب تو دروازہ کھول دے۔ کعب نے کہا تجھ پر خدا کی لعنت ہو۔ میرے پاس آنے کی تو نے عجیب ترکیب نکالی۔ غرض دروازہ کھولا گیا تو حی نے اندر آکر کہا اے کعب جو عہد تیرے اور محمدؐ کے مابین ہے اسے توڑ دے اور میری رائے رد نہ کر اس لئے کہ محمدؐ اتنے بڑے گروہ سے ہرگز نہیں بچ سکتے۔ اگر تو نے یہ وقت کھو دیا تو پھر ایسا وقت تیرے ہاتھ کبھی نہیں آئے گا۔ پس کعب نے قلعہ والوں میں سے سرداران یہود مثل غزال بن شمول۔ یاسر بن قیس۔ رفاعہ بن زید۔ زبیر بن باطا کو جمع کر کے کہا کہ

تم لوگوں کی اس معاملے میں کیا رائے ہے؟ سب نے جواب دیا اے کعب تو ہمارا سردار ہے ہم تیرے فرمانبردار اور ہم عہد ہیں اگر تو محمدؐ کا معاہدہ توڑ دے گا تو ہم بھی توڑ دینگے۔ اگر تو باقی رکھے گا تو ہم بھی باقی رکھیں گے۔ اگر تو قلعہ سے لڑنے کے لیئے باہر نکلے گا تو ہم بھی تیرے ساتھ نکل پڑیں گے۔ اس کے بعد زبیر بن باطا جو سب میں بوڑھا اور تجربہ کار آدمی تھا آنکھیں اسکی جاتی رہی تھیں بولا میں نے خدا کی نازل کی ہوئی کتاب توریت میں پڑھا ہے کہ خداوند عالم آخر زمانہ میں ایک رسول مبعوث فرمائے گا۔ جو مکہ میں پیدا ہوگا اور اسی مدینہ میں ہجرت کر کے آئے گا اور بغیر زین کے گدھے پر سوار ہوگا۔ سر پر عمامہ باندھے گا۔ تھوڑے سے چھواروں اور قلیل غذا پر گزارا کرلے گا۔ ہنس مکھ اور بڑا لڑنے والا ہوگا۔ آنکھوں میں اس کے سُرخی ہوگی اور دونوں شانوں کے درمیان مہرِ نبوت ہوگی۔ جب وہ اپنے کندھے پر تلوار رکھے گا تو پھر کسی کی پرواہ نہ کرے گا۔ اسکی سلطنت وہاں تک پہنچ جائے گی جہاں تک سوار و پیدل بھی نہیں جاسکتے ہیں یعنی سمندر تک۔ پس اگر یہ وہی ہے تو یہ جماعت اس کو مغلوب نہیں کرسکتی۔ سنو اگر وہ بڑے بڑے پہاڑوں کا قصد کرے تو ضرور ان پر غالب آجائے گا۔ حی نے جواب دیا کہ یہ وہ نبی نہیں ہے جس کی صفت تم نے بیان کی۔ وہ تو بنی اسرائیل میں سے ہوگا۔ یہ تو عرب کا باشندہ اسمٰعیل کی اولاد سے ہے اور کبھی بنی اسرائیل اس شخص کی اطاعت نہیں کرسکتے جو اسمٰعیل کی اولاد میں سے ہو کیونکہ خدا نے بنی اسرائیل کو تمام آدمیوں پر بزرگی اور فضیلت دی ہے اور نبوت و سلطنت انھیں میں مقرر کی ہے اور حضرت موسیٰؑ نے ہم سے عہد لیا ہے کہ ہم لوگ کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک کہ وہ ہماری موجودگی میں کوئی ایسی قربانی پیش نہ کرے جسے آگ کھا جائے مگر محمدؐ کے پاس کوئی معجزہ نہیں ہے البتہ انھوں نے جادو کر کے ایک جماعت کو اپنے پاس اکٹھا کرلیا ہے اور یہ چاہتے ہیں کہ اسی

جادو کے زور سے ان سب پر غالب آجائیں۔ یہی باتیں کرتے کرتے ان لوگوں کو ان کی رائے سے ہٹا دیا یہاں تک کہ انھوں نے اس کی بات مان لی۔ اب حی نے ان سے کہا لاؤ وہ عہدنامہ نکالو جو تمہارے اور محمدؐ کے مابین ہے۔ پس ان لوگوں نے اس کو وہ عہدنامہ دے دیا اور حی نے اسے پھاڑ ڈالا اور بولا بات پکی ہو چکی۔ اب تم سب کے سب لڑائی کے لئے تیار ہو جاؤ اور سامان جنگ درست کرو۔

جناب رسولؐ خدا کو اس واقعہ کی خبر پہنچی تو آپ رنجیدہ ہوئے اور تمام صحابی خوفزدہ ہو گئے۔ پس آنحضرتؐ نے سعد بن معاذ اور اسید بن حصین سے کہ یہ دونوں قبیلۂ اوس سے تھے اور اس قبیلہ میں اور بنی قریظہ میں قسم ہو چکی تھی فرمایا تم دونوں جاؤ اور بنی قریظہ کو دیکھو کہ وہ کس شغل میں ہیں اور اگر انھوں نے میرا عہد توڑ دیا تو جبتک تم میرے پاس نہ آجاؤ کسی پر اپنا حال ظاہر نہ کرنا اور میرے پاس آکر مجھ سے عضل والقارۃ کہہ دینا۔ پس یہ دونوں دروازہ قلعہ کے پاس پہنچے۔ اوپر سے کعب نے جھانکا اور دونوں کو دیکھ کر سعد کو اور رسولؐ خدا کو ناسزا کہنے لگا۔ سعد نے جواب دیا کہ اے کعب تو لومڑی کے مانند اپنے بھٹ میں بیٹھا ہوا ہے۔ تو قریش کا ساتھی ہو گیا۔ اب جناب رسولؐ خدا تیرے قلعہ کا محاصرہ کریں گے اور تجھے ذلت دیں گے اور تیری گردن ماریں گے۔ یہ کہہ کر وہ دونوں جناب رسولؐ خدا کی خدمت میں پلٹ آئے اور عرض کی عضل والقارۃ، یعنی جن کی خبر ملنا مقصود تھی انھوں نے غدر کیا۔ جناب رسولؐ خدا نے فرمایا کہ یہ تو ہماری ہی مصلحت کے موافق ہے۔ ہم نے ہی ان کو ایسا کرنے کا مشورہ دیا ہے آپ کے اس طرح فرمانے کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرتؐ کے اصحاب میں قریش کے جاسوس لگے ہوئے تھے جو یہاں کی خبریں وہاں پہنچایا کرتے تھے۔

اب حی بن اخطب گروہ قریش اور ابوسفیان کے پاس آیا اور ان کو

یہ خبر دی کہ بنی قریظہ نے وہ عہد جو محمدؐ سے کیا تھا اس کو توڑ دیا۔ یہ خوش خبری پاکر قریش بہت خوش ہوئے۔ جب رات ہوگئی تو نعیم بن مسعود اشجعی جناب رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ قریش کے آنے سے تین دن پہلے اسلام لاچکا تھا۔ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میں خدا پر ایمان لایا ہوں اور آپ کی رسالت کی تصدیق کرچکا ہوں اور مصلحتاً کفار سے میں نے اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھا ہے اگر حضور کا حکم ہو تو میں معرکہ جنگ میں اپنی ذات سے حاضر ہو کر آپؐ کی نصرت کروں یا ارشاد ہو تو جا کر یہود اور قریش میں تفرقہ ڈال دوں تاکہ یہودی اپنے قلعہ سے قریش کی مدد کے لئے قدم باہر نہ نکالیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا ایسی ہی تدبیر کر جس سے ان دونوں میں پھوٹ پڑ جائے یہی میرے نزدیک زیادہ مناسب ہے۔ نعیم نے عرض کی اتنی اور اجازت دید یجئے کہ جو کچھ بھی میرے دل میں آئے وہ میں حضور کی شان میں پس غیبت کہوں۔ فرمایا جو مصلحت سمجھنا وہ کہہ دینا۔ پس نعیم اسی وقت ابوسفیان کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ جو محبت اور خلوص مجھے تم لوگوں سے ہے اسے تم خوب جانتے ہو۔ خدا تم کو تمہارے دشمنوں پر کامیاب کرے۔ مجھے پکی خبر پہنچی ہے کہ محمدؐ بن عبداللہ یہودیوں سے مل گئے ہیں اور ایکا کر لیا ہے اور اس بات پر اتفاق کر لیا ہے کہ یہود تمہارے لشکر میں آملیں اور موقعہ پاکر تمہیں قتل کردیں اور محمدؐ نے لوگوں سے وعدہ کر لیا ہے کہ اگر تم لوگ اس کام کو انجام دے دوگے تو جو نقصان تم کو بنی نضیر اور بنی قینقاع نے پہنچایا ہے اسکی تلافی کر دی جائے گی۔ جو مال تمہارا انھوں نے لے لیا ہے وہ واپس دلوا دیا جائے گا۔ میری رائے تو یہ ہرگز نہیں ہے کہ تم یہود کو اپنے لشکر میں شریک کرو جب تک کہ ان میں سے کسی سردار کو ضامن نہ بنالو اور اسے مکہ نہ بھیجدو کہ اس صورت میں تم لوگ یہود کے مکر و فریب سے محفوظ رہ سکو گے۔ ابوسفیان نے کہا خدا تجھے

توفیق اور جزائے خیر عطا فرمائے کہ تو نے مجھے بڑی نصیحت کی۔ نعیم کا مسلمان ہو جانا اس وقت تک نہ ابو سفیان کو معلوم ہوا تھا اور نہ کسی یہودی کو۔ پس دوسری طرف وہ جلدی سے بنی قریظہ کے پاس آیا اور کہنے لگا اے کعب تجھے معلوم ہے مجھے تجھ سے کتنی دلی محبت ہے۔ مجھے یہی خبر پہنچی ہے کہ ابو سفیان نے اپنے لشکر کو یہ مشورہ دیا ہے کہ لڑائی کے وقت بنی قریظہ کو آگے رکھنا چاہیئے کہ اگر ان کی فتح ہوئی تو ہماری ہی بات بڑھے گی اور ہمارا ہی نام ہو گا اور اگر ہم نے شکست کھائی تو بنی قریظہ ہی قتل ہوں گے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ جب تک تم قریش کے دس سردار بطور ضمانت و رہن اپنے قلعہ میں نظر بند نہ کر لو ہرگز قریش کو شریک جنگ نہ بناؤ۔ دیکھو اگر قریش کامیاب نہ ہو سکے تو تم یہ کہدینا کہ جبتک ہم سے محمدؐ دوبارہ عہد و پیمان نہ کریں ہم تمہارے آدمی واپس نہ دینگے۔ اے کعب یاد رکھ اگر قریش کو شکست ہو گئی اور وہ میدان سے بھاگ گئے تو محمدؐ تم سے ضرور لڑیں گے اور تم کو قتل کر دیں گے۔ کعب نے کہا کہ یہ تو تم نے ہم پر بڑا احسان کیا اور ہمیں بڑی اچھی صلاح دی جب تک ہم قریش سے ان سرداروں کو لیکر اپنے قلعہ میں بطور رہن اوّل نہ رکھ لیں گے ہم سے ایک بھی قلعہ سے باہر نہ نکلے گا۔

اس کے بعد جنگ خندق کا مفصل بیان تو آپ گزشتہ مجلس میں سماعت کر چکے ہیں۔ مختصر یہ کہ جنگ ہوئی اور قریش بھاگ گئے۔ قریش کے بھاگ جانے کے بعد حی بن اخطب قلعہ بنی قریظہ میں داخل ہوا۔ ادھر جناب امیرؑ تشریف لائے اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ کعب قلعہ پر چڑھا اور باہر کو سر نکال کر مسلمانوں کو اور جناب رسول خدا کو ناسزا کہنے لگا۔ اتنے میں آنحضرتؐ بھی تشریف لائے۔ جناب امیرؑ استقبال کے لئے آگے بڑھے اور عرض کی یا رسول اللہ قلعہ کے پاس تشریف نہ لے جایئے گا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا تم اس لئے مجھے روکتے ہو کہ یہود نے مجھے برا کہا

ہے۔ اگر وہ مجھے دیکھ لیں گے تو ہرگز بد کلامی نہ کر سکیں گے اور خدائے تعالیٰ ان کو ذلیل کرے گا چنانچہ آپ قلعہ کے قریب آئے اور قلعہ کے چاروں طرف اپنا لشکر اُتارا اور تین دن تک قلعہ کا محاصرہ رکھا۔ اس اثنار میں قلعہ سے کسی نے سر باہر نہ نکالا۔ تین دن کے بعد غزال بن شمول قلعہ سے اُترا اور جناب رسولؐ خدا کی خدمت میں حاضر ہو کے عرض کرنے لگا کہ جس طرح آپؐ نے ہمارے ہم قوم بنی نضیر پر عنایت فرمائی ان کو امان بخشی ہم کو بھی معاف کر دیجئے کہ ہم اپنی بستیاں آپؐ کے لئے خالی کر دیں گے اور جو کچھ ہمارے قبضہ میں ہے وہ سب کچھ حضور کو دے دیں گے۔ کوئی چیز نہ چھپائیں گے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا یہ نہیں ہو سکتا۔ تم سب کے سب میرے حکم کے موافق قلعہ سے باہر نکل آؤ۔ پس غزال واپس آ گیا۔ وہ لوگ چند روز تک اسی حال میں مبتلا رہے۔ آخر تنگ آ کر ان کی عورتیں اور بچے رونے پیٹنے لگے۔ یہاں تک کہ جب محاصرہ ان پر گراں اور سخت گزرنے لگا تو وہ لوگ قلعہ سے نکل پڑے اور سب نے جناب رسولؐ خدا کے سامنے سر تسلیم جھکا دیا۔ آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ مردوں کی مشکیں باندھ لی جائیں اور عورتیں ان سے جُدا کر دی جائیں۔ پس حسب ارشاد نبوی وہ سب کہ جن کی تعداد سات سو تھی رسیوں میں جکڑ لئے گئے۔ عورتیں علیحدہ کر لی گئیں۔ یہ حال دیکھ کر قبیلۂ اوس اُٹھ کھڑا ہوا اور عرض کرنے لگا یا رسول اللہ یہ لوگ ہمارے دوست ہیں بنی خزرج کے مقابلہ میں انھوں نے ہمیشہ ہماری مدد کی ہے اور حضورؐ نے عبداللہ بن ابی کی سفارش سے سات سو زرہ پوش اور تین سو بے زرہ والوں کا خون بھی بحل فرما دیا تھا۔ ہم لوگ حضورؐ کے نزدیک عبداللہ سے میٹھے نہیں ہیں تو ہماری سفارش سے بنی قریظہ کو بھی معافی دیدیجئے۔ جب انھوں نے کئی مرتبہ یہ التجا کی تو آنحضرتؐ نے فرمایا اچھا میں تمہارے ہی قبیلہ میں سے کسی کو حکم بنائے دیتا ہوں۔ وہ جو فیصلہ کرے

کر دے گا تو کیا تم اس کے فیصلے کو مان لو گے۔ سب نے عرض کی ہم کو منظور ہے اب بتائیے وہ کون ہے۔ فرمایا سعد بن معاذ۔ سب نے عرض کی سعد بن معاذ کا فیصلہ ہم کو بسر و چشم قبول ہے۔ غرض سعد کو لائے اور قبیلہ اوس ان کے گرد جمع ہو گیا اور کہنے لگا اے ابو عمر خدا کا خوف مدِ نظر رکھو اور اپنے ہم عہدوں اور دوستوں پر احسان کرو اور ان واقعات کو یاد کرو انھوں نے خزرج کے مقابلے میں جنگ بعاث اور حدائق میں اور لڑائیوں میں ہماری کیسی مدد کی ہے۔ جب کئی بار انھوں نے یہی کہا تو سعد نے جواب دیا خدا کی قسم سعد بن معاذ آج کے دن خدا کی راہ میں وہ فیصلہ کرے گا کہ اسے کسی ملامت گر کی ملامت کا اندیشہ نہ ہوگا۔ یہ سن کر اوس نے کہا افسوس بنی قریظہ ہمیشہ کے لئے تباہ ہو گئے۔ قبیلۂ اوس پر اس کلمہ نے کچھ ایسا اثر کیا کہ عورتیں اور بچے سعد کے آگے رونے پیٹنے لگے۔ جب ان کا جوش و خروش کم ہوا۔ سعد نے کہا اے قوم یہود تم لوگ مجھے پنچ بناتے ہو۔ جو کچھ میں تمہارے بارے میں حکم دوں اسے تم تسلیم کرو گے۔ سب نے جواب دیا بدل منظور اور ہم کو امید ہے کہ آپ انصاف مدِ نظر رکھ کر ہم پر احسان فرمائیں گے اور اچھا فیصلہ دیں گے۔ سعد نے دوبارہ ان کا اقرار لیا۔ پھر جناب رسولؐ خدا کی طرف متوجہ ہوئے اور نہایت ادب سے عرض کی یا رسولؐ اللہ میرے ماں باپ حضور پر نثار ہو جائیں جناب کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اے سعد تم ان لوگوں کے حق میں حکم دو مجھے تمہارا فیصلہ منظور ہے۔ پس سعد نے عرض کی یا رسولؐ اللہ میرا حکم یہ ہے کہ اس قوم کے مرد قتل کئے جائیں عورتیں اور بچے ان کے قید کئے جائیں۔ مہاجرین اور انصار پر ان کا مال تقسیم کر دیا جائے۔ پس جناب رسولؐ خدا اٹھ کھڑے ہوئے اور ارشاد فرمایا اے سعد تم نے وہ فیصلہ کیا ہے جو خدا نے سات آسمانوں پر حکم دیا ہے۔ اس کے بعد سعد رحمۃ اللہ کے ہاتھ کا زخم پھٹ گیا اور خون اس سے ٹپکنے لگا یہاں تک کہ سعد نے

نویں مجلس

وفات پائی۔ ان کی مُراد بر آئی۔ لشکرِ اسلام تمام قیدیوں کو لے کر مدینہ آیا۔ جناب رسول خدا نے ایک گڑھا کھودنے کا حکم دیا۔ بقیع میں گڑھا کھودا گیا۔ جب شام قریب ہوئی تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ان قیدیوں میں سے ایک ایک آدمی نکالا جائے اور اس کی گردن ماری جائے۔ حی بن اخطب نے کعب بن اسید سے کہا تو دیکھتا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا جا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ پھر تجھے اس کا کیا افسوس کیونکہ جو کوئی کسی مذہب کی طرف دعوت دیتا ہے وہ امر تبلیغ میں کوتاہی نہیں کرتا۔ گیا وقت اور ہاتھ سے نکلا ہوا موقعہ پھر واپس نہیں آتا۔ اب تم صبر کرو اور اپنے دین پر ثابت قدم رہو۔ پھر کعب بن اسید صف سے باہر نکالا گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ گردن میں بندھے ہوئے تھے۔ وہ خوبصورت اور شاندار آدمی تھا۔ آنحضرتؐ نے اس کی طرف نظر کر کے فرمایا اے کعب تجھے اس ہوشیار ذہین عالم کی نصیحت نے جو ملک شام سے تیرے پاس آیا تھا کچھ فائدہ نہ دیا۔ اس نے تم لوگوں سے کہا تھا کہ میں نے سور اور شراب کو چھوڑ دیا ہے اب میں اس نبی اور رسولؐ کی قدمبوسی کے لئے مہیا ہوں جو مبعوث ہوگا اور وہ مکہ میں پیدا ہوگا۔ اسی شہر مدینہ میں وہ ہجرت کر کے آئے گا۔ تھوڑے سے چھواروں پر اور قلیل غذا پر گزارہ کر لیا کرے گا بے زین کے خچر پر سوار ہوگا۔ اس کی آنکھوں میں سُرخی ہوگی اور اس کے دونوں شانوں کے مابین مہر نبوت ہوگی۔ اپنے کندھے پر تلوار رکھے گا۔ اگر تم اس سے لڑو گے تو وہ اس کی کچھ بھی پرواہ نہ کرے گا۔ سلطنت و شاہی اس کی سمندر تک پہنچ جائے گی۔ کعب نے جواب دیا کہ اے محمدؐ ایسا ہی ہوا تھا اور آپ میں یہ سب باتیں موجود ہیں۔ اگر مجھے یہود کے طعنوں اور عیب جوئی کا خوف نہ ہوتا کہ یہ لوگ کہیں گے کہ کعب اپنے قتل سے ڈر گیا تو میں ضرور ایمان لے آتا اور آپ کی تصدیق کرتا لیکن میں تو دین

یہودی پر ہی زندہ رہا اور اسی پر مروں گا۔ آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ اُسے آگے بڑھاؤ اور اس کی گردن اُڑا دو۔ پس وہ قتل کر دیا گیا۔ پھر حی بن اخطب آنحضرتؐ کے سامنے حاضر کیا گیا اسے دیکھ کر آنحضرت نے فرمایا اے فاسق تو نے اپنے بارے میں خدا کی کارروائی کیسی پائی۔ اس نے عرض کی خدا کی قسم مجھے ہرگز اس بات کا افسوس نہیں ہے کہ میں نے آپ سے دشمنی کیوں کی اور نہ میں آپ کی دشمنی پر اپنے نفس کی ملامت کرتا ہوں۔ میں تو دل ہلا دینے والی کوششیں کر گزرا لیکن خدا جس کی مدد نہ کرے وہ تو آخر شکست ہی کھاتا ہے پھر اُس کی بھی گردن اُڑا دی گئی۔ جناب رسولؐ خدا نے تین دن تک ہر صبح و شام ان یہودیوں کو قتل کیا اور برابر فرماتے تھے ایہا الناس ان کو شیریں پانی سے سیراب کرو، اچھے کھانے کھلاؤ اور ان کے قیدیوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرو۔

سامعین یہ ہیں وہ واقعات و حالات جو بنی قریظہ پر گزرے۔ بادی النظر میں خصوصاً ایسے لوگ جو آداب عسکری سے واقف نہیں ہیں گمراہی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور بنی قریظہ کے ساتھ آنحضرت کے سلوک کو نعوذ باللہ بربریت سے تعبیر کرتے ہیں کہ سات سو مردوں کی مشکیں بندھی ہوئی ہیں، عورتیں مردوں سے جُدا کر دی گئی ہیں، بچے فریاد و فغاں کر رہے ہیں اور ایک عمیق گڑھے کے کنارے مسلسل تین دنوں تک ایک دوسرے کی نگاہوں کے سامنے ان کو پے بہ پے قتل کیا جا رہا ہے اور فریاد و فغاں اور الحاح و زاری کا کسی پر کوئی اثر نہیں ہے خصوصاً متعصب عیسائی اور یہودی مورّخین نے اس واقعہ کو بنیاد بنا کر اسلام کے خلاف بڑی زہر افشانی کی ہے اور اس کو بڑی اہمیّت دی ہے حالانکہ دنیوی قانون کی رو سے اس واقعہ کو کوئی اہمیّت نہیں دی جا سکتی۔ غور طلب امر یہ ہے کہ جنگ خندق میں مسلمانوں کے خلاف قریش نہ صرف خود صف آرا ہوتے تھے بلکہ بقول

حی بن اخطب" دل ہلا دینے والی کوششیں" کر کے بنی کنانہ، بنی فزارہ اور بنی سلیم وغیرہ کے دل بادل اکٹھا کر لائے تھے اور ان دشمنان دین کی ایک کثیر التعداد فوج مسلمانوں کو گھیرے ہوئے تھی۔ ایسے نازک وقت میں بنی قریظہ کی غداری اور عہد شکنی واضح طور پر اس امر کے مترادف تھی کہ مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا جائے۔ بنی قریظہ مسلمانوں کے خلاف اس سے بڑے اور کس جرم کا ارتکاب کر سکتے تھے چنانچہ ان دشمنوں کے قتل کا حکم اگر خود رسولؐ بھی دیتے تو لایق اعتراض نہ ہوتا چہ جائیکہ ان کے قتل کا حکم خود بنی قریظہ کے منظور کردہ ثالث نے ہی صادر کیا ایسے میں اسلام اور پیغمبر اسلام پر اس ضمن میں نکتہ چینی کرنا محض تعصب کی بنا پر ہے مگر افسوس یہ ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے اس پروپیگنڈے کا اثر مسلمانوں پر بھی ہوا ہے۔ ایک مولوی صاحب کو میں نے اپنے کانوں سے کہتے سنا ہے کہ" ایک طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بنی قریظہ کی عورتیں اور بچے فریاد کر رہے ہیں اور رسولؐ رحمت اللعالمین ہوتے ہوئے بھی اس کو سن رہے ہیں۔ دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کربلا میں رسولؐ کے نواسے نواسیاں فریاد کر رہے ہیں اور کوئی ان کی فریاد کا سننے والا بھی نہیں ہے"۔ تو ایسے وساوس تو کسی جاہل نادان کے دل میں ہی پیدا ہو سکتے ہیں۔ کیا بنی قریظہ کا ایسے نازک وقت میں معاہدہ توڑ کر دشمنوں سے مل جانا مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے لئے کافی نہ تھا پھر اگر اس کے جواب میں اس قبیلہ کو مٹا دیا گیا تو کونسی ناانصافی ہوئی۔

معاندین کا دوسرا غلط پروپیگنڈہ یہ ہے کہ خاندان رسولؐ کی عورتیں بچے فریاد کر رہے تھے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کربلا اور شام میں اولاد رسولؐ کا تو ذکر ہی کیا ہے امام حسینؑ کے اصحاب کی عورتوں اور بچوں سے بھی اضطراب ظاہر نہیں ہوا بلکہ سب نے

سکون اور اطمینان کا کامل مظاہرہ کیا۔ مثال کے لئے کوفہ ہی کے حالات کا مطالعہ کرلیں؛
تمام انبیاء کے مصائب و آلام کو اگر جمع کر لیا جائے تو بھی کربلا کے مصائب کا
پلہ ان سب سے بھاری رہے گا۔ انبیاء پر مصائب نازل ہوئے مگر ٹھہر ٹھہر کر۔ کوئی ایک بھی
ایسا نبی نہیں ہے جس پر تمام مصائب نے بیک وقت اپنا زور دکھایا ہو سوائے معرکۂ کربلا کے
کوئی ایک مصیبت بھی تو ایسی نہیں ہے جسے انسانی دماغ سوچ سکے اور وہ کربلا میں نظر نہ آئے۔ آوارہ
وطنی۔ اہل وطن کی کج ادائی۔ گرمی کے موسم میں سفر کی تکلیف۔ عورتوں اور بچوں کا
شدائد سفر جھیلنا۔ بندش آب۔ بھوک کی تکلیف۔ بدنوں کا زخموں سے چور ہونا۔
سوکھے گلوں کا خنجروں سے کاٹا جانا۔ لاشوں کا پامال ہونا۔ خیموں کا جلایا جانا۔
ساز و سامان کا لوٹا جانا۔ قید و بند کی تکلیف۔ عورتوں کا شہروں اور بازاروں میں
تشہیر ہونا، زندان میں بند کیا جانا وغیرہ۔ ان میں بہت سی تکالیف ایسی ہیں جو
انبیاء اور اولاد انبیاء کو چھو بھی نہیں گئیں۔ کسی نبی کی ناموس بازاروں میں تشہیر نہیں
ہوئی۔ قید خانوں میں بند نہیں ہوئی۔ سر برہنہ درباروں میں لائی نہیں گئی مگر واہ رے
صابرین فی الباساء۔ والضرا۔ کہ تمہاری زبان کسی منزل پر شکوہ سے آشنا نہیں
ہوئی، تم میں کبھی جذبۂ انتقام نہیں بھڑکا، تم نے کبھی بد دعا کے لئے لب نہیں کھولے
جو بلا آئی صبر و شکر سے جھیلتے ہی چلے گئے۔ تم میں سے ہر ایک تو امام نہ تھا اس کے
باوجود لیسے الام و مصائب میں تمہارا وہ کردار جس کے سامنے آسمانوں کی بلندیاں
پست ہیں اور جو تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہے ہمیں یہ ماننے پر مجبور کرتا ہے کہ
تم میں سے ہر فرد واصل بہ حق تھا اور اللہ کے نور سے اتصال مطلق کی منزل پر فائز تھا۔
آل رسولؐ کا تو ذکر ہی کیا، تمہارے اصحاب اور ان کی عورتیں اور ان کے بچے حتیٰ کہ
تمہاری کنیزیں اور کنیز زادے تک ہوئی و ہوس کے خداؤں کے بت توڑ چکے تھے
اور جذبات پر قدرت و غلبہ حاصل کر چکے تھے اور یہ کرشمہ تھا صرف اس ایک پاک
ذات کا جسے حسینؑ کہتے ہیں جو آیۂ تطہیر کا مخاطب تھا اور ان تمام نفوس کا

تزکیہ وتطہیر کرکے اس منزل پر لے آیا تھا کہ ؎

سبھوں نے ہیں ترے ساتھی بڑے جری مانے
کہ جھوک کے پیاسے گئے نیزہ و تبر کھانے
دکھا دیا تھا انھیں تو نے کیا خدا جانے
گرے ہی پڑتے تھے شمع اجل پہ پروانے

کشودِ رازِ حیات دممات کرڈالا
حسینؑ موت کو تو نے حیات کرڈالا

حسینؑ تو نے ہمارے لئے لُٹایا گھر
ہمارے واسطے قرباں کیا علی اکبرؑ
ہوئی یہ حد کہ تصدق کیا علی اصغرؑ
جب ہاتھ ہو گئے خالی تو تو نے دیا سر

ہمارے واسطے تیروں پہ تیر کھاتے ہیں
اور اپنے اہلِ حرم ننگے سر پھرائے ہیں

عزادارو حرمِ رسولؐ پر تین راتیں بہت گراں گزری ہیں۔ ان میں پہلی شب ہجرت تھی کہ ہر وقت دشمنوں کے گھر میں گھس آنے کا خطرہ تھا۔ دوسری رات کربلا میں بعد شہادت گیارہویں محرم کی رات تھی جب تمام رات بے کس بی بیوں کو یہ کھٹکا لگا رہا کہ دشمن کہیں پھر نہ آجائیں اور انھوں نے ساری رات جاگ کر کاٹی اور تیسری وہ رات تھی جب بارہویں محرم کو قریب شام فوج یزید خوشیاں مناتی کوفہ کے دروازہ پر پہنچی۔ اب رات کا وقت ہو گیا تھا۔ ابنِ زیاد نے حکم بھیجا کہ یہ وقت شب ہے قیدیوں کو اندر نہ لاؤ۔ کل جب میں دربار آراستہ کرلوں اور شہر کی آئینہ بندی ہو جائے اور تمام شہر میں منادی کرادی جائے کہ جسے اسیروں کا تماشہ دیکھنا ہو سرِ راہ آکر کھڑا ہو تب ان سب کو داخل شہر کرنا۔ یہ رات سیدانیوں بالخصوص جناب زینبؑ و امِ کلثومؑ پر بہت بھاری تھی۔ یہ کوفہ وہی کوفہ ہے جس میں چند سال قبل زینبؑ و امِ کلثوم شہزادیاں کہلاتی تھیں اور وہاں کی عورتیں انکی خدمت میں حاضر ہونے کی تمنا کرتی تھیں۔ آج وہی زینبؑ و امِ کلثومؑ یہ سُن رہی ہیں کہ

کل ان کو قیدیوں کی طرح بازار کوفہ میں سر برہنہ تشہیر کیا جائے گا۔ ان بیکسوں کے دل پر کیا گزری ہو گی اس کو کون بیان کر سکتا ہے۔

جناب زینبؑ نے فضہ کو بلا کر کہا تم شمر کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ ہم تیرے نبی کی نواسیاں ہیں ہمیں سر برہنہ تشہیر نہ کر ایک ایک چادر سر ڈھانکنے کے لئے دیدے۔ اگر وہ شقی یہ نہ مانے تو کہنا ایسی طرف سے نکال کرلے چل جہاں لوگوں کا مجمع کم ہو اگر یہ بھی نہ مانے تو کہنا کر شہیدوں کے سر ہم سے آگے رکھے تاکہ لوگ ان کے دیکھنے میں مشغول ہوں اور ہم پر نظر نہ ڈالیں۔ فضہ شمر کے پاس گئیں۔ وہ شقی غرور و تکبر میں بھرا ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ فضہ سامنے آئیں تو اسنے منہ پھیر لیا۔ جناب فضہ نے فرمایا اے شمر وائے ہو تجھ پر تو نے مجھے معمولی عورت سمجھ رکھا ہے۔ میں کنیز ہوں شہزادی عالم جناب فاطمہ زہراؑ کی۔ واللہ اگر میری شہزادی زینبؑ نے مجھے نہ بھیجا ہوتا تو میں تیرے پاس آنے میں اپنی توہین محسوس کرتی اور کبھی نہ آتی۔ اب وہ شقی متوجہ ہوا اور پوچھا کیا کہنا چاہتی ہو۔ جناب فضہ نے کہا نبیؐ کی نواسیاں ننگے سر ہیں وہ چاہتی ہیں کہ ایک ایک چادر منھ چھپانے کو دیدے۔ شمر نے کہا زینبؑ سے کہدو کہ اب وہ کوفہ کی شہزادی نہیں ہیں بلکہ ابن زیاد کی قیدی ہیں جیسے ہم لے جانا چاہیں گے ان کو جانا پڑے گا۔ جناب فضہ نے آخر کی دونوں خواہشیں بیان کیں۔ اس نے غصّہ سے کہا ان میں سے کوئی بات منظور نہیں۔ ابن زیاد کا حکم ہے کہ تم لوگوں کو اہل کوفہ کے سامنے ذلیل کیا جائے۔ چنانچہ دوسرے دن بی بیاں اسی طرح دربار ابن زیاد میں گئیں۔ اس کا دارالامارہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ سرہائے شہداء مع اسیروں کے اس کے سامنے پیش ہوئے۔ عورتیں رسیوں سے جکڑی ہوئی سر برہنہ باحال تباہ کھڑی تھیں۔ سب درباری زرق برق لباس پہنے ہوئے تھے اور شہزادیؑ عالم رسولؐ کی نواسی کا لباس حد درجہ بوسیدہ تھا۔ سر و پا برہنہ، شانوں میں رسّی

بندھی ہوئی۔ نقاہت کا یہ عالم تھا کہ کھڑی نہ ہو سکیں۔ سر جھکایا تو بیٹھ گئیں۔ ابن زیاد بی بی کے سامنے امام مظلوم کے دندان مبارک پر چھڑی مار رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ اس نے کہا اے زینب بنت علیؑ الحمد للہ خدا نے تم کو ذلیل کیا اور تمہاری احادیث کو جھٹلایا اور تم کو قتل کیا۔ یہ سنتے ہی جناب زینبؑ اٹھ کھڑی ہوئیں اور فرمایا خدا کا شکر ہے جس نے جناب محمدؐ مصطفےٰ سے ہم کو صاحب عزت و بزرگی بنایا اور ہر قسم کے رجس سے پاک کیا۔ اس نے کہا اے بنت علیؑ تو نے دیکھا نہیں کہ خدا نے تیرے بھائی اور اس کے اہل بیتؑ سے کیا سلوک کیا۔ بی بی نے فرمایا میں تو اس میں بہتری ہی بہتری دیکھ رہی ہوں کہ خدا نے ان کو درجۂ شہادت عطا فرمایا۔ خدا کل تجھ کو اور ان کو جمع کرے گا۔ اے ابن زیاد بخشش خدا جو ابدی کے لئے تیار ہو جا۔

الغرض اس ملعون نے اہل حرم کو قید کرنے کا حکم دیا۔ کوفہ کا وہ قید خانہ جسمیں اہل حرم کو مقید کیا گیا تھا مسجد کوفہ کے پہلو میں تھا۔ اسی مسجد کے پاس امیر المومنینؑ کا گھر تھا جو آج تک موجود ہے۔ آہ جو بی بیاں اس شہر میں کبھی شہزادیاں بن کر رہی تھیں آج وہ وہاں کے قید خانے میں بند ہیں اور اہل حرم کو اس قید خانے میں جو تکلیفیں اٹھانا پڑیں ان کے تصور سے کلیجہ پھٹتا ہے۔ اس شقی نے حکم دیا تھا کہ بہت تھوڑا کھانا اور بہت کم پانی ان کو دیا جائے اور وہ بھی آب سرد نہ ہو۔ گرمی کا موسم اور یہ تیرہ و تار قید خانہ۔ تمام بچے تڑپتے اور اپنے باپ کو یاد کرتے تھے۔ مائیں طرح طرح سے ان کو سمجھاتی تھیں مگر یتیموں کو نیند کہاں۔ ابن زیاد کا محل قریب تھا۔ رات کو جب شور و غل کی آواز سنی تو دربانوں کو بلا کر کہا ان سے کہدو کہ رونا دھونا بند کریں ورنہ ان کو دربار میں بلا کر سزا دوں گا۔ جب دربانوں نے امام زین العابدینؑ کو یہ پیغام پہنچایا تو آپ نے

فرمایا کہ اس ظالم سے کہو کہ تو نے ہمارے کلیجے کاٹے ہمارا گھر برباد کیا اور اب کہتا ہے کہ روؤ مت۔ کیا یہ یتیم بچے بغیر روئے رہ سکتے ہیں۔ کیا یہ بیکس عورتیں جن کی گودیں بچوں سے خالی ہو گئیں جن کے تمام عزیز گوسفندان قربانی کی طرح ذبح کر دیئے گئے۔ جن کے سروں سے چادریں چھین لی گئیں رونے کا حق بھی نہیں رکھتیں۔ اس سے کہنا کہ ظالم، خدا کے قہر سے ڈر۔

جب جناب زینبؑ کو خبر ہوئی تو کہنے لگیں بی بیو جب نانا جان کا انتقال ہوا تھا تو میری والدۂ گرامی شب و روز ان کی یاد میں رویا کرتی تھیں۔ محلہ والوں نے بابا جان سے شکایت کی کہ بنتِ رسولؐ سے کہیئے کہ ان کے رونے سے ہماری نیند میں خلل پڑتا ہے یا تو وہ دن کو رویا کریں یا رات کو۔ بابا جان نے جب محلّے والوں کی یہ بات اماں جان کو بتائی تو آپؑ بیقراری سے روئیں اور مجھے چھاتی سے لگا کر کہا بیٹی زینبؑ ایک دن تجھے بھی اسی طرح رونے سے منع کیا جائیگا۔ آہ آج وہی دن ہے۔ پھر کربلا کی طرف رُخ کر کے فرمایا اے میرے مظلوم بھیا تیری دُکھیا بہن کو ظالم تیرے ماتم میں رونے بھی نہیں دیتے۔

عزادارو مجلس تو ختم ہوئی مگر تم سے گزارش ہے کہ اپنے ہر فارغ وقت میں حتیٰ کہ رات کو جب سونے کے لئے تکیہ پر سر رکھنا تو حسینؑ کو یاد کرنا، واقعاتِ کربلا کی تصویر اپنے ذہن میں لانا اور قید میں پڑی ہوئی ان بی بیوں کو یاد کرنا تاکہ تمہارے دل درد سے بھریں، تمہارے نفوس اس غم کے نشتر سے بیدار رہوں اور تمہارا تزکیہ ہو اور شہادتِ عظمیٰ کا مقصد یعنی تکمیل کو پہنچے۔ یاد رکھنا کہ ؎

خدا تو ہو چکا شبیرؑ کا اب جس کا دل چاہے
وہ لے لے آ کے ابن فاطمہؑ کے در سے ملتا ہے۔

دسویں مجلس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ الحمد للہ رب العٰلمین والصّلوٰۃ والسّلام علیٰ سید المرسلین وخاتم النّبیین ابی القاسم محمّد وآلہ الطیّبین الطّاھرین المعصومین من یومنا ھٰذا الیٰ یوم الدّین امّا بعد قال اللہ سبحانہ و تعالیٰ فی کتابہ المجید وفرقانہ الحمید وقولہ الحق ہ بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ہ یا ایھا الّذین اٰمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصّادقین ہ

ارشاد ہے کہ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور سچّوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ چنانچہ ہم نے کلامِ الٰہی کی روشنی میں سچّوں کی تلاش کی اور اس سلسلے میں سورۃ بقرکے بائیسویں رکوع کی پہلی آیت "لیس البرّ ان تولّوا وجوھکم ۔ الخ" کی طرف بھی رجوع کیا۔ اس لئے کہ اس آیت میں صادقین اور متقین کی جملہ صفات کا جائزہ قدرت نے خود لیا ہے اور مجلس بہ مجلس ایک ایک صفت کا تفصیلی ذکر کر کے ان ذواتِ مقدسہ کی نشاندہی اور تعارف کراتے ہوئے اب ہم دسویں مجلس تک پہنچے ہیں۔ اصل مقصد کی طرف آنے سے قبل مناسب ہے کہ ہم گزشتہ مجالس کے نکات کو دہراتے چلیں تاکہ یاد تازہ ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تکرار گراں ہو مگر کیا کیا جائے کہ نفسِ انسان پر نقوش کو پختہ کرنے کے لئے اور اُسے بیدار رکھنے کے لئے تکرار سے بہتر اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

جو راز ہائے سربستہ ہم پر منکشف ہو چکے ہیں اُن کا نچوڑ یہ ہے:-

(۱) احقاقِ حق کے لئے حقیقت کے مطابق اظہار کرنا صدق ہے مگر یہی کام

اگر بدنیتی سے کیا جائے تو جھوٹ ہے

(۲) خلافِ حقیقت بیان جبکہ ہدایتِ خلق کے لئے ضروری ہو، جھوٹ نہیں بلکہ مکر و تقیہ ہے۔

(۳) ہادیانِ دین کا ہر حرکت و سکون، نفسِ انسان پر گہرے نقوش بٹھانے کیلئے منظاہرہ ہوتا ہے جو حقیقت نہیں ہوتا۔

(۴) لا الٰہ الا اللہ کہہ لینے والوں کو قرآن میں "یا ایہا الذین آمنوا" یعنی اے ایمان لانے والو ہی کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے مگر ان ایمان لانے والوں میں اکثر کی کیفیات جو بیان کی ہیں وہ قابلِ مذمت ہیں۔

(۵) قرآن یہودیوں کے ایک ایسے گروہ کی نشاندہی کرتا ہے جو تخریبِ اسلام کے لئے مسلمان ہوا اور اس نے بے شمار خلافِ عقل و فطرت باتیں مسلمان علماء تک پہنچائیں جو حماقت پر مبنی ہونے کے باوجود اب بھی علمِ دین میں شامل ہیں اور اکثر علماء ان پر ایمان رکھتے ہیں۔

(۶) قرآن کی رو سے ایمانِ حقیقی کی پہچان حُبّ شدید ہے اور حُبّ شدید کی علامت "وجلت قلوبہم" ہے یعنی محبوب کا نام سنتے ہی دل لرز جائے۔

(۷) قرآن میں ایسے مومنین کا ذکر موجود ہے جو رسولؐ کے ساتھ ایمان میں شریک ہیں، حضرت ابوطالبؑ ان میں شامل ہیں اور اُن کے ایمان کی قسم قرآن نے اس طرح کھائی ہے "لا اقسم بہٰذا البلد و انت حل بہٰذا البلد و والد و ما ولد"۔ (ترجمہ، قسم ہے اس شہر کی اور تم اُس میں رہتے ہو اور ایک باپ اور بیٹے)

(۸) تمام مذاہب میں صرف اسلامی نماز ہی ایسی ہے جو تقسیمِ توجہ کے ساتھ ذکرِ الٰہی کی تعلیم دیتی ہے اور ہماری اس نماز نے "منتھ کا رول ٹن یا رول" کا عجیب نسخہ کیمیا فراہم کیا ہے۔

(۹) رسولؐ کی بعثت کا مقصد تزکیۂ نفوس ہی ہے، قیام سلطنت و تنظیم عسکری نہیں۔ مگر چونکہ آپؐ رحمت اللعالمین ہیں لہٰذا تنظیم عسکری کے ذریعہ آپ کو اقوام عالم کو یہ سبق دینا تھا کہ جو قوم منظم ہو جائے گی وہ دوسروں پر غالب آ جائے گی۔

(۱۰) تزکیۂ نفس کی تو صرف وہی کوشش کر سکتے ہیں جن میں اہلیت ہو مگر رحمت اللعالمین سے ہر ایک کو فیض پہنچنا ضروری ہے۔ تو جو مدارج اُخروی کے حصول کے اہل نہیں اُن کو کم از کم اتنا ہی فائدہ پہنچ جائے کہ وہ دُنیا میں مادی ترقی ہی کر سکیں۔ مادی ترقی کے لئے حریتِ فکر لازمی ہے اور حریتِ فکر کے لئے اُن بولتے ہوئے بتوں کو نیست و نابود کرنا ضروری ہے جنھوں نے انسانیت کو ذہنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہو، بس اس کام کے لئے تنظیم عسکری کا قیام ایک لازمی امر تھا۔

(۱۱) قانونِ فطرت کے مطابق جب کوئی قوم تعیش میں پڑ کر آزادی کی اہلیت کھو دیتی ہے تو اُس پر ایسی قوم کو مسلط کر دیا جاتا ہے جو سخت جان اور جفاکش ہو لہٰذا بدکردار اقوام کو خلاف فطرت اعمال کی سزا دینے کے لئے تنظیم عسکری کی ضرورت ہے۔

(۱۲) قانونِ فطرت ہے کہ جب موت سامنے رہے حتیٰ کہ موت کا خوف مٹ جائے اور خوف کی جگہ شوق لے لے تو قوتِ ادراک میں ترقی ہوتی ہے اور عالم غیب یا عالم نور کا مشاہدہ ہو جاتا ہے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ شوقِ شہادت میں نکلنے والوں کے لئے تنظیم عسکری تزکیۂ نفس کے حصول کا ذریعہ ہے۔

(۱۳) اصل اور عظیم مقصد تو یہی تھا کہ احباب کے قلوب کو تڑپانے کے لئے ذبح عظیم پیش کی جائے جو کسی محدود علاقہ میں ہوتی تو بے فائدہ ہوتی۔ اسلئے ضرورت تھی کہ اس پُردرد مظاہرہ کے لئے اسلامی سلطنت کا علاقہ تنظیم عسکری کے ذریعہ وسیع تر ہو جہاں ہر گوشے تک اس قربانی کا اثر پھیل سکے۔

(۱۴) رسولؐ اور آلِ رسولؐ کو اہلِ عالم کو اپنی محبت کی طرف بلانا تھا لہٰذا وہ فاتح کی حیثیت سے ملک کی توسیع میں حصہ نہیں لے سکتے تھے اس لئے کہ مفتوح کو فاتح سے محبت نہیں بلکہ نفرت ہوتی ہے۔ پس ضروری تھا کہ تنظیم عسکری قائم ہو اور اُن کے سربراہ اغیار ہوں۔

(۱۵) آلِ رسولؐ کی قربانیوں کا ذریعہ ایسے عساکر ہی ہو سکتے تھے جن کے سربراہ رسولؐ و آلِ رسولؐ کے بدترین دشمن ہوں اسلئے کہ اگر یہ سربراہ غیر مسلم ہوتے تو وہ مسلمانوں سے کہتے کہ دیکھو ہم نے تمہارے پیشوایانِ دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور تمہارا خدا اُن کی مدد نہ کر سکا۔ لہٰذا ایسے عساکر کے سربراہوں کا ظاہرًا مسلمان ہونا ضروری تھا۔

(۱۶) اہلبیتؑ کو بحکمِ خدا یہ قربانیٔ عظیم پیش کرنا تھی اس لئے بنی ہاشم کے بدترین دشمن بنو اُمیہ کے گروہ کو منتخب کیا گیا اور اُن کی حکومت کے لئے ایک ہزار مہینے مقدر کر دیے گئے (الفِ شہر۔ سورۂ اِنّا انزلنا)

(۱۷) صبر کے معنی بے چارگی، مجبوری اور کس مپرسی نہیں ہیں۔ صبر کے معنی ہیں انتہائی نامساعد حالات میں پامردی اور استقلال کا ثبوت دینا۔ صابر وہ نہیں جس پر حالات غالب آگئے ہوں بلکہ وہ ہے جو حالات پر غالب آئے اور تاریخ کا رُخ موڑ دے۔

مذکورہ بالا نکات کے دہرانے کے بعد ہم پھر اصل مقصد کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ صادقین کو اُن کی صفات کے ذریعہ متعارف کرانے کے لئے کلام اللہ میں روشن اور بیّن اشارات موجود ہیں لیکن باوجود اسکے اُن کا تعارف کوئی آسان کام نہیں تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرنِ اوّل میں جو ایمان لانے والے نظر آتے ہیں اُن کے دلوں میں صادقین کے متعلق شکوک و وساوس پیدا ہوتے رہے ہیں۔ دیکھئے صلحِ حدیبیہ میں جو کچھ ہُوا وہ تمام دنیا پر واضح ہے۔ آپکی یاد دہانی کے لئے اس کی تفصیل تاریخ سے پیش کی جاتی ہے۔

یہ واقعہ ذوقعدہ ۶ھ کا ہے۔ مکہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر ایک کنواں ہے جس کو حدیبیہ کہتے ہیں اور اس کی نسبت سے اس کے قریب کا گاؤں بھی حدیبیہ کہلاتا ہے۔ اس مقام پر جو صلح رسولِ خدا اور قریش کے درمیان ہوئی تاریخ میں اس کی بڑی اہمیت ہے اور آئندہ کی تمام کامیابیوں کا یہ دیباچہ ہے۔ گو بظاہر یہ صلح تھی لیکن اس میں اسلام کی فتح اور کامرانی کا راز مضمر تھا اور قرآن میں اسی لئے اسکو "فتح مبین" کا لقب دیا گیا ہے۔

کعبہ جو ابراہیمؑ یادگار ہے تمام عرب کا قبلہ گاہ تھا اور وہ سب اس کو اپنا مشترک ورثۂ آبائی سمجھتے تھے۔ قبائل عرب سال بھر آپس میں لڑتے بھڑتے رہتے لیکن چار ماہ تک جو اشہرِ حرم کہلاتے تھے تمام لڑائیاں بند ہو جاتیں اور وہ دور دور سے سفر کر کے آتے اور اس قبلہ گاہِ عام میں اپنے اپنے عقائد کے مطابق عبادات و رسوم بجا لاتے۔

جب اسلام نے مدینہ اور اطراف میں پھیلنا شروع کیا تو پیروانِ رسولِ خدا کو بھی کعبہ کی زیارت کا شوق بڑھا بالخصوص وہ لوگ جو مکہ سے بالجبر نکالے گئے تھے اور اپنے اہل و عیال بھی چھوڑ آئے تھے، اُن کے دلوں سے کعبہ اور اپنے محبوب وطن کی یاد کس طرح نکل سکتی تھی؟ پھر اسلام کے فرائض میں حج کعبہ ایک رکنِ اعظم کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک روز آنحضرتؐ نے اصحاب کو جمع کیا اور ارشاد فرمایا کہ آپؐ نے خواب میں دیکھا ہے کہ بال کٹائے ہوئے طوافِ کعبہ کر رہے ہیں۔ اس پر تمام لوگ مسرور اور پر امید نظر آنے لگے۔

غرض ان تمام اسباب کی بناء پر آنحضرتؐ نے مکہ معظمہ کا ارادہ کیا اور اس غرض سے کہ قریش کو کوئی اور شک نہ ہو عمرہ کا احرام باندھا۔ قربانی کے اونٹ ساتھ لئے اور یہ حکم دیا کہ کوئی شخص ہتھیار باندھ کر نہ آئے صرف تلوار، جو عرب میں ہر وقت ضروری سمجھی جاتی تھی، نیام میں ساتھ رکھ لی جائے۔ چنانچہ تقریباً چودہ سو کی تعداد میں مہاجرین اور انصار جمع ہو کر عازمِ سفر ہوئے۔

ذوالحلیفہ میں پہنچکر قربانی کی ابتدائی رسمیں ادا ہوئیں یعنی اونٹوں کی گردنوں میں قربانی کی علامت کے طور پر لوہے کے نعل لگا دیئے گئے۔ احتیاط کے طور پر قبیلۂ خزاعہ کا ایک شخص، جس کے اسلام لانے کا حال قریش کو معلوم نہ تھا، قریش کے ارادہ کی خبر لانے کے لئے پہلے سے بھیجدیا گیا۔ جب قافلۂ اسلام عسفان کے قریب پہنچا تو اُس شخص نے آکر خبر دی کہ قریش کے تمام قبائل کو یکجا کرکے یہ عہد کیا گیا ہے کہ محمدؐ اور مسلمان مکہ میں کبھی داخل نہیں ہوسکتے اور یہ کہ اُن لوگوں نے بڑے زور شور سے مقابلہ کی تیاریاں شروع کردی ہیں۔

غرض قریش نے تمام قبائل سے ایک بڑا لشکر جمع کرکے مکہ سے باہر بلدح کے مقام پر پڑاؤ ڈالدیا۔ اور خالد بن ولید کو دو سو سواروں کے ساتھ مع عکرمہ بن ابوجہل پیش رو کے طور پر آگے بھیجا۔ خالد مقام عمیم پر، جو رابغ اور جحفہ کے درمیان واقع ہے، اُترا۔

آنحضرتؐ کو جب یہ خبر ملی تو آپ وہ راستہ چھوڑ کر داہنی جانب سے آگے بڑھے اور حدیبیہ پہنچکر قیام کیا۔ قبیلۂ خزاعہ نے ابتک اسلام قبول نہیں کیا تھا لیکن وہ اسلام کے حلیف اور رازدار تھے۔ اس قبیلہ کے سردار بدیل بن ورقاء کو جب آنحضرتؐ کا تشریف لانا معلوم ہوا تو وہ آپکی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ قریش کی فوجوں کا سیلاب آرہا ہے اور وہ آپ کو کعبہ میں نہ جانے دینگے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ قریش سے جاکر کہدو کہ ہم عمرہ کی غرض سے آئے ہیں اور لڑنا مقصود نہیں ہے۔ جنگ نے قریش کی حالت ابتر کردی ہے اور اُن کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ ایک مدت کے لئے معاہدۂ صلح کرلیں اور مجھے عربوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیں۔ اس پر بھی اگر وہ راضی نہ ہوں تو اُس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں یہاں تک لڑوں گا کہ میری گردن الگ ہوجائے اور خدا کو جو فیصلہ کرنا ہو وہ کردے۔

بدیل نے قریش سے جاکر کہا کہ میں محمدؐ کے پاس سے ایک پیغام لے کر آیا ہوں۔ اجازت دو تو کہوں!" چند شریر لوگوں نے کہا کہ ہم کو اُن کے پیغام کی ضرورت نہیں ہے لیکن سنجیدہ اشخاص نے اجازت دیدی۔ بُدیل نے آنحضرتؐ کی شرائط کو پیش کیا۔ اس پر عروۃ بن مسعود ثقفی اُٹھا اور کہا "کیوں قریش! کیا میں تمہارا باپ اور تم میرے بچے نہیں ہو؟" سب بولے کہ ہاں!! ۔ اس پر عروۃ نے کہا "کیا میری نسبت تم کو کوئی بدگمانی تو نہیں؟" لوگوں نے کہا کہ نہیں!! عروۃ نے کہا تو پھر مجھے اجازت دو کہ میں خود جاکر معاملہ طے کروں۔ محمدؐ نے معقول شرائط پیش کی ہیں۔ غرض وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں آیا اور قریش کا پیغام سُنایا اور کہا کہ "فرض کرو اگر تم نے قریش کو ختم کر دیا تو کیا اس سے بُری اور بھی کوئی مثال ہو سکتی ہے کہ تم نے اپنی ہی قوم کو برباد کیا۔ اور اگر لڑائی کا رُخ بدل گیا تو تمہارے گرد یہ بھیڑ گَرد کی مانند چھٹ جائے گی۔" اس پر حضرت ابوبکر کو غصہ آیا اور گالی دے کر کہا کہ "کیا ہم رسولؐ خدا کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے؟" عروۃ نے آنحضرتؐ سے پوچھا کہ یہ بدکلام شخص کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا "یہ ابوبکر ہیں"۔ عروۃ جیسا کہ عرب کا طریقہ تھا آنحضرتؐ سے بے تکلفانہ طور پر گفتگو کر رہا تھا اور دورانِ گفتگو میں آپ کی ریشِ مبارک کی طرف ہاتھ بھی بڑھا دیتا تھا۔ اس پر مغیرہ بن شعبہ، جو ہتھیار لگائے آنحضرتؐ کی پشت کی جانب کھڑے ہوئے تھے، غصہ میں آکر بولے، "عروۃ اپنا ہاتھ دور رکھو ورنہ یہ ہاتھ پھر واپس نہ جا سکے گا۔" عروۃ نے مغیرہ کو پہچانا اور کہا، "او دغاباز! کیا میں تیری دغابازی کے معاملہ میں تیرا کام نہیں کر رہا ہوں؟" مغیرہ نے چند آدمی قتل کر دیئے تھے جن کا خون بہا عروۃ نے اپنے پاس سے ادا کیا تھا۔ الغرض، عروۃ نے واپس ہو کر قریش سے جاکر کہا کہ میں نے قیصر و کسریٰ اور

نجاشی کے دربار دیکھے ہیں لیکن یہ عقیدت اور وارفتگی کہیں نہیں دیکھی محمدؐ بات کرتے ہیں تو سناٹا چھا جاتا ہے کوئی شخص نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا ان کے منھ کے پانی کو بلکہ تھوک کو لوگ ہاتھوں میں اٹھا لیتے ہیں اور چہرہ پر مل لیتے ہیں۔

چونکہ معاملہ ناتمام رہ گیا تھا اس لئے آنحضرتؐ نے خراش بن امیہ کو قریش کے پاس بھیجا لیکن قریش نے اُن کی سواری کو مار ڈالا اور وہ خود بہ مشکل جان بچا کر واپس آئے۔ اب قریش نے ایک دستہ کو مسلمانوں پر حملہ کرنے کیلئے بھیجا جو گرفتار کر لیا گیا مگر آنحضرتؐ نے سب کو معاف کر کے چھوڑ دیا۔ سورہ فتح آیت ۲۴ "وھو الذی کف ایدیھم عنکم وایدیکم عنھم ببطن مکۃ من بعد ان اظفرکم علیھم" (ترجمہ شبلی: اور وہی خدا ہے جس نے مکہ میں اُن لوگوں کا ہاتھ تم سے اور تمہارا اُن سے روک دیا بعد اس کے کہ تم کو اُن پر قابو دیدیا گیا تھا)۔

بالآخر آنحضرتؐ نے گفت گوئے صلح کے لئے حضرت عمرؓ کو منتخب کیا لیکن انھوں نے یہ کہہ کر جانے سے عذر کیا کہ قریش اُن کے سخت دشمن ہیں، وہ اُن کو مار ڈالیں گے اور کوئی بچانے والا نہ ہوگا۔ پھر آپؐ نے حضرت عثمان کو بھیجا۔ سننے میں آیا کہ وہ حضرت یا تو وہاں نظر بند کر لئے گئے یا قتل کر ڈالے گئے۔

اب چونکہ صلح کی بات کسی فیصلہ کن مرحلہ پر نہیں پہنچ سکی تھی اسلئے آنحضرتؐ نے تمام اصحاب کو ایک ببول کے درخت کے نیچے جمع کیا اور ہر مرد و زن سے اس بات پر بیعت لی کہ وہ رسولِ خدا کے حکم کے آگے اپنے جان و مال و عیال کو عزیز نہ سمجھیں گے۔ اس بیعت کو بیعتِ رضوان کہتے ہیں اور قرآن اس کا اس طرح ذکر کرتا ہے۔ سورہ الفتح آیت ۱۸ "لقد رضی اللہ عن المومنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ فعلم ما فی قلوبھم فانزل السکینۃ

علیہم و اثابہم فتحاً قریباً ۵" (جس وقت مومنین تم سے درخت کے نیچے (لڑنے مرنے) کی بیعت کر رہے تھے تو خدا ان سے (اس بات پر) ضرور خوش ہوا۔ غرض جو کچھ اُن کے دلوں میں تھا خدا نے اُسے دیکھ لیا۔ پھر اُن پر تسلی نازل فرمائی اور اُنھیں اس کے عوض میں بہت جلد فتح عنایت کی)۔

شبلی اپنی سیرت النبیؐ میں لکھتے ہیں کہ یہ نظریہ صحیح نہیں ہے کہ یہ بیعت قتلِ عثمان کا بدلہ لینے کے لیے لی گئی تھی۔

اس بیعت کے بعد ہی قریش نے سُہیل بن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا۔ وہ نہایت فصیح و بلیغ مقرر تھا۔ قریش نے اُس سے کہا کہ صلح اس بات پر ہو سکتی ہے کہ محمدؐ اس سال واپس چلے جائیں۔ چنانچہ سُہیل آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مفصل گفتگو کی۔ آخر کار چند شرائط پر اتفاق ہو گیا۔ آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کو معاہدہ لکھنے کا حکم دیا۔ آپؑ نے شروع بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کی۔ سُہیل نے اعتراض کیا اور کہا کہ قدیم دستور کے مطابق "بسمک اللّٰھم" لکھا جائے۔ آنحضرتؐ نے قبول فرمایا۔ پھر حضرت علیؑ نے لکھا "ھٰذا ما قضیٰ علیہ محمد رسول اللہ"۔ اس پر سہیل نے کہا کہ اگر ہم محمدؐ کو رسول تسلیم کر لیتے تو پھر جھگڑا ہی کس بات کا تھا لہٰذا یہ الفاظ مٹا دیے جائیں۔ آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ صرف میرا نام لکھ دو۔ اس پر حضرت علیؑ نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آنحضرتؐ نے پھر خود ہی "رسول اللہ" کے الفاظ کو کاٹ دیا۔

اس پر شبلی نے اپنا اظہارِ خیال کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت علیؑ کا "رسول اللہ" کے الفاظ کو مٹا دینے سے احتراز کرنا جوشِ عقیدت و محبت کا مظاہرہ تھا نہ کہ حضور صلعم کے حکم سے سرتابی۔

پھر یہ شرائط قلمبند کی گئیں (۱) مسلمان اس سال واپس چلے جائیں (۲)

اگلے سال آئیں اور صرف تین روز قیام کر کے چلے جائیں (۳) ہتھیار لگا کر نہ آئیں
مرف تلوار ساتھ لائیں اور وہ بھی نیام میں ہو اور نیام ایک بند تھیلے میں (۴) مکے
میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں اُن میں سے کسی کو ساتھ نہ لیجائیں اور مسلمانوں
میں سے کوئی مکہ میں رہنا چاہے تو اُس کو نہ روکیں (۵) کافروں یا مسلمانوں میں
سے کوئی شخص اگر مدینہ جائے تو اُسے واپس کر دیا جائے لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ
آئے تو اُس کو واپس نہ کیا جائے (۶) قبائلِ عرب کو اختیار ہوگا کہ فریقین میں
سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ میں شریک ہو جائیں۔

یہ شرائط مسلمانوں کے لئے بظاہر بے حد سخت اور مضر تھیں لیکن
حقیقت میں یہ اسلام کی سب سے بڑی فتح کا پیش خیمہ تھیں۔ اسی وقت ایک حادثہ
پیش آگیا۔ سہیل کے لڑکے ابو جندل، جو اسلام لا چکے تھے اور مکہ میں کافروں کی
قید میں تھے، کسی طرح بھاگ کر آنحضرتؐ کی خدمت میں پہنچ گئے اور فریاد بلند کی۔
اس پر تمام مسلمان دل برداشتہ ہوئے اور ابو جندل کو واپس نہ بھیجنے کی کوششیں
کرنے لگے۔ سہیل نے فوراً کہا کہ اس معاہدہ پر پہلا عمل ابھی ہوگا اور لڑکے کو
واپس مانگا۔ آنحضرتؐ نے ابو جندل کو صبر کی تلقین کی اور ہدایت کی کہ فی الحال
وہ واپس چلے جائیں۔ یہ سُن کر حضرت عمرؓ اس درجہ برہم ہوئے کہ رسول اللہؐ سے
یہ سوالات کر ڈالے "کیا آپ پیغمبرِ برحق نہیں ہیں؟" آپؐ نے فرمایا "ہاں"۔
"کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟" فرمایا "ہاں"۔ "تو ہم دین میں یہ ذلت گوارا کیوں کریں؟"
آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "میں خدا کا پیغمبرؐ ہوں اور خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتا۔
خدا میری مدد کرے گا"۔ پھر حضرت عمرؓ نے فوراً ہی کہا "کیا آپ نے یہ نہیں کہا
تھا کہ ہم لوگ کعبہ کا طواف کریں گے؟" آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا "لیکن یہ نہیں
کہا تھا کہ اسی سال کریں گے"۔ غرض حضرت عمرؓ ایسی ہی گفتگو کے بعد ناراضگی کے

عالم میں اٹھ کر ابوبکر کے پاس گئے اور وہی سب باتیں دہرائیں۔ بعض روایات کے مطابق، گو کہ شبلی اپنی تحریر سے اسے حذف کر گئے ہیں، یہاں تک کہدیا کہ قسم خدا کی جتنا شک مجھے رسالت میں آج ہوا ہے اتنا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔"

اس واقعہ کے بعد آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ سب لوگ قربانی یہیں کریں لیکن صحابہ اور دیگر مسلمانوں میں سے کوئی شخص اس حکم کی تعمیل کے لئے نہیں اٹھا۔ آپؐ نے تین بار یہی حکم دہرایا مگر پھر بھی لوگ ٹس سے مس نہیں ہوئے تو آپؐ اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے اور کچھ دیر کے بعد واپس آکر خود قربانی کی، بال کٹوائے اور احرام اتارا۔ امیر المومنینؑ رسول اللہؐ کے ساتھ تھے۔ قربانی میں شریک تھے اور اُن کی قربانیاں بھی مشترک تھیں۔ جب لوگوں نے یہ دیکھا تو بادلِ ناخواستہ آپؐ کی پیروی کی۔

آنحضرتؐ نے صلح کے تین روز بعد تک حدیبیہ میں قیام فرمایا۔ جب روانگی ہوئی تو راہ میں یہ آیت اتری" سورۃ الفتح آیت ۱۔ انا فتحنا لک فتحا مبینا۔ ......" (ہم نے تجھ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی)۔ آنحضرتؐ نے اسی وقت حضرت عمرؓ کو بلا کر یہ آیت سنائی تو حضرت عمرؓ نے تعجب خیز لہجہ میں آپؐ سے کہا "کیا یہ فتح ہے؟" ارشاد ہوا کہ ہاں"۔ شبلی لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کو بعد میں اطمینان ہوا تو بہت پشیمان ہوئے۔ کفارہ دینے کے لئے قربانیاں کیں اور توبہ استغفار کرتے رہے۔

اس صلح سے اب ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ مسلمان اور کفار ملنے جلنے لگے آمد و رفت شروع ہو گئی۔ خاندانی اور تجارتی تعلقات بڑھنے لگے تو باتوں باتوں میں اسلامی مسائل کا تذکرہ بھی آجاتا۔ کفار مسلمانوں کے آداب و اخلاق اور عمل سے متاثر ہونے لگے تو بے شمار لوگ اسلام کی طرف [illegible] ہوئے اور بہت سے مسلمان ہو گئے

عورتیں چونکہ معاہدہ کی شرائط سے مستثنیٰ تھیں اُن کے لئے یہ مخصوص آیت اتری۔ سورۃ الممتحنہ۔ آیت ۱۰ "یا ایہا الذین آمنوا اذا جاءکم المومنت مھجرات فامتحنوھن ط اللہ اعلم بایمانھن ج فان علمتموھن مومنت فلا ترجعوھن الی الکفار ط لاھن حل لھم ولا ھم یحلون لھن ط وآتوھم ما انفقوا ط ولا جناح علیکم ان تنکحوھن اذا آتیتموھن اجورھن ط ولا تمسکوا بعصم الکوافر وسئلوا ما انفقتم ولیسئلوا ما انفقوا ط ذالکم حکم اللہ ط یحکم بینکم ط واللہ علیم حکیم ٥ (ترجمہ: اے ایماندارو جب تمہارے پاس ایماندار عورتیں وطن چھوڑ کر آئیں تو تم اُن کو آزما لو۔ خدا تو اُن کے ایمان سے واقف ہے ہی۔ پس اگر تم بھی اُن کو ایماندار سمجھو تو اُنھیں کافروں کے پاس واپس نہ پھیرو۔ نہ یہ عورتیں اُن کے لئے حلال ہیں اور نہ وہ کفار ان عورتوں کے لئے حلال ہیں اور اُن کفار نے جو کچھ (ان عورتوں کے مہر میں) خرچ کیا ہو اُن کو دیدو اور جب تم اُن کا مہر اُنہیں دیدیا کرو تو اس کا تم پر کچھ گناہ نہیں کہ تم ان سے نکاح کر لو اور کافر عورتوں کی آبرو (جو تمہاری بی بیاں ہوں، اپنے قبضہ میں نہ رکھو (چھوڑ دو کفار سے جا ملیں) اور تم نے جو کچھ (اُن پر) خرچ کیا ہو (کفار سے) مانگ لو اور انھوں نے بھی جو کچھ خرچ کیا ہو (تم سے) مانگ لیں۔ یہ ہی خدا کا حکم ہے جو تمہارے درمیان صادر کرتا ہے اور خدا بڑا واقف کار حکیم ہے)۔

سمندر کے کنارے ذو مرہ کے قریب ایک مقام عیص تھا جہاں مکہ کے مظلوم و ستم رسیدہ مسلمان بھاگ کر جمع ہونے لگے اور کسی طرح قریش کے ہاتھ نہ آتے تو مجبوراً قریش نے آنحضرتؐ کو لکھ بھیجا کہ معاہدہ کی مسلمانوں کو واپس کرنے والی شق کو منسوخ سمجھا جائے۔ اس طرح اب یہ مسلمان بھی مدینہ پہنچ گئے

اور باقی بھی جن کو آنا تھا، آزادی سے آنے لگے۔ (اس صلح کے بیان میں بیشتر مضمون شبلی کی سیرت النبیؐ سے لیا گیا ہے)۔

آپ نے صلح حدیبیہ کے حالات کو غور سے سُنا۔ اس میں کچھ واقعات ایسے ہیں جن سے چند شکوک اور وسوسے ذہنوں میں پیدا ہو سکتے ہیں اور وہ یہ ہیں:

(۱) جب وحی کا سلسلہ جاری تھا اور وحی ہوتی رہتی تھی تو پھر خواب دکھانے کی کیا ضرورت تھی؟

(۲) اور خواب میں بھی پورا ماجرا نہیں دکھایا بلکہ صرف ادھورا جو اصحاب کے دلوں میں شکوک اور وساوس کا باعث ہوا۔

(۳) عثمانؓ کے قتل کی افواہ پھیلی تو نہ رسول اللہؐ نے وحی کی درخواست کی اور نہ ہی اللہ نے کوئی وحی نازل کی۔

ایسے شکوک و وساوس کا جواب یہ ہے کہ یہ تمام مظاہرہ ایک خاص مقصد کے حصول کے لئے تھا جو ایک راز تھا۔ اور تمام معاملات عسکری نیز سیاست مدن کا قانون ہے کہ راز کو راز رکھنا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے اور اس کو افشا کر دیا جائے تو مقصد میں کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ صورت حال یہ تھی کہ قریش کی آئے دن کی لڑائیوں کے سبب تبلیغ و اشاعت دین میں کوئی عملی کام نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہذا یہ ضروری تھا کہ قریش سے کسی نہ کسی طرح صلح کر لی جائے اور جو وقت جنگ میں صرف ہو رہا تھا وہ تبلیغ و اشاعت میں صرف ہو۔ چنانچہ آپ نے ابھی ملاحظہ فرمایا کہ یہ مقصد حاصل ہو گیا۔

رہی وحی اور خواب کی بات تو فرض کیجیے وحی ہوتی تو وحی میں راز افشا کرنا ہوتا۔ خواب میں تو عذر کی گنجائش ہے اور صحیح عذر مثلاً خواب میں یہ تو نہیں دکھایا جاتا کہ وہ کونسا سال اور کونسا دن ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے فرمایا بھی یہی تھا کہ میں نے خواب

دیکھا ہے کہ ہم عُمرہ بجالارہے ہیں۔ مگر جب عُمرہ کی اجازت نہیں ملی اور کفار اس پر راضی نہیں ہوئے اور بعض صحابہ نے یہ اعتراض کیا کہ آپ نے تو خواب دیکھا تھا اور کہا تھا کہ عُمرہ بجالائیں گے تو حضرتؐ نے یہی جواب دیا تھا کہ میں نے یہ تھوڑا ہی کہا تھا کہ اسی سال عُمرہ بجالائیں گے!

ادھورا خواب دکھانے اور عثمانؓ کے قتل کی افواہ پر وحی کے خاموش ہو جانے کا جواب بھی یہی ہے یہ سب کے سب راز تھے اور رازوں کا افشا کرنا حصولِ مقصد میں رکاوٹ ڈالنے کے مترادف تھا۔

ان تمام شکوک و وساوس کا جواب قرآن ایک آیت میں دیتا ہے:۔

"ام یحسبون ان یترکوا ان یقولوا آمنا وھم لا یفتنون"

(ترجمہ:۔ کیا وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ چھوڑ دیئے جائیں گے۔ صرف یہ کہنے پر کہ ہم ایمان لے آئے اور وہ سخت جانچ میں نہ ڈالے جائیں گے؟)

قتلِ عثمانؓ کی افواہ پر رسولؐ اللہ نے وحی کی درخواست کی اور نہ خدا نے وحی کی تو مقصد صرف یہ تھا کہ سب کے سب امتحان میں ڈالے جائیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس صلح کے موقع پر قریب قریب تمام صحابی متزلزل ہو گئے۔ جب حضرتؐ نے قربانی کا حکم دیا تو کسی نے تعمیل نہ کی سوائے امیر المومنینؑ کے جو رسولؐ اللہ کے ساتھ قربانی میں شریک تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ کامل الوفا اصحاب کسی نبی یا رسول کو ملے ہی نہیں اور منزلِ وفا کربلا میں ختم ہو گئی۔

امامِ مظلوم کے اصحاب ایسے کامل الایمان، کامل الوفا اور امامت کے حق شناس تھے کہ ان سے امام نے کسی موقعہ پر اپنا تعارف نہیں کرایا۔ کوئی بھولا ہوا سبق یاد نہیں دلایا۔ زندگی کی کوئی امید نہیں دلائی۔ اپنی نصرت پر مجبور نہیں کیا۔ مرنے والے خطرے سے آگاہ کر دیا۔ بیعت کا بار ان کی گردنوں سے اٹھا لیا

مگر اُن کے ارادوں میں بال برابر بھی لغزش نہ آئی۔ امامؑ کے اقتدار و اعزاز کا کوئی پہلو مضمحل نہیں ہوا۔ موت نے اُن کے دلوں کو خوف زدہ نہیں کیا۔ ظلم و ستم کی آندھیوں نے اُن کے پائے ثبات و عقیدت کو ڈگمگایا نہیں۔ وہ حق کے فدائی شمع امامت کے پروانے تین دن کی بھوک و پیاس میں ایسی ہمت و شجاعت سے لڑے کہ سیر و سیراب دُشمن کو اپنی جانوں کے لالے پڑ گئے۔ دیکھیے! وہ میدان میں کس آن بان سے جاتے ہیں۔ چہرے بشاش، دل میں موت کی تمنّا، دُشمنوں کی صفوں کو روند ڈالنے کا ولولہ اور ہر ایک کی یہی کوشش کہ پہلے وہ شہادت کی سعادت حاصل کرے۔

چالیس ہزار کا بہتر یا زیادہ سے زیادہ تین ساڑھے تین سو مجاہدوں کو قتل کر دینا کوئی بہادری نہیں۔ البتہ اس کثیر التعداد فوج سے تین دن کی بھوک و پیاس میں ڈٹ کر مقابلہ کرنا اور ایک چوتھائی فوج کا صفایا کر دینا ایک ایسا معجز نما کارنامہ ہے جس کو تاریخ بھلا نہیں سکتی۔

ایک انگریز ڈاکٹر لکھتا ہے کہ بتیس ۳۲ گھنٹوں کی پیاس سے ہر موئے بدن اتنی تکلیف دینے لگتا ہے جتنا کہ ایک انچ گہرا اور ایک انچ چوڑا زخم اذیت دیتا ہے۔ شاید اس تحقیق کے وقت اُس محقق کے پیش نظر کم سن بچے نہ ہوں گے جن میں قوت برداشت بہ نسبت جوانوں اور بوڑھوں کے بہت کم ہوتی ہے۔ شاید اُسکے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ یہ مصیبت ایک چھ ماہ کی ننھی سی جان پر بھی نازل ہو سکتی ہے۔

شب عاشور بُریر ہمدانی اپنے خیمہ میں بیٹھے تلاوت کلام پاک میں مصروف تھے کہ یکایک کئی بچے در خیمہ پر فریاد کرنے لگے " ارے کوئی ایسا نہیں جو ہماری پیاس بجھا دے؟ آہ! ہمارے کلیجے شدّتِ تشنگی سے کباب ہوئے جاتے ہیں

اور ہماری جان لبوں پر آ گئی ہے لیکن ہم کو ایک قطرہ پانی بھی کسی خیمہ میں نظر نہیں آتا اور ہم پانی کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔" اس آواز کا سننا تھا کہ بریر تڑپ گئے۔ تلاوت ختم کی۔ باہر نکلے اور بآوازِ بلند لوگوں کو پکارا "اے انصارِ حسینؑ! تف ہے ہماری زندگی پر کہ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے پانی کے لئے تڑپیں اور فریاد بلند کرتے پھریں اور ہم خاموش رہیں۔ اے جوانمردو! اپنے اپنے خیموں سے نکل آؤ، مشکوں کو اٹھا لو اور میرے ساتھ چلو! اگر پانی مل گیا تو خیر ورنہ ہم اپنی جانیں ان بچوں کی دل شگافتہ کرنے والی خشک اور بھرائی ہوئی آوازوں پر قربان کر دیں گے۔" چنانچہ، بیس جوان مسلح ہو کر بریر کے ساتھ چلے۔ فرات پر پہنچے تو کسی نے ٹوکا۔ بریر نے اس کی آواز پہچان لی اور کہا کہ میں ہوں تیری قوم اور قبیلہ کا بریر۔ اس نے پوچھا۔ کیا چاہتے ہو؟ جواب دیا "پانی"۔ وہ بولا کہ "تم شوق سے پیو!" بریر اپنے ساتھیوں سمیت نہر میں داخل ہوئے اور ابھی ایک مشکیزہ ہی بھرا تھا کہ کسی نے غل مچایا "خبردار! یہ حسینؑ کے لشکر والے ہیں اور خیام میں پانی پہنچانا چاہتے ہیں۔ ان کو فوراً روکو کہیں ایسا نہ ہو کہ پانی وہاں تک پہنچ جائے۔" یہ شور و پکار سنتے ہی فوجِ لعین کے پہرہ دار جمع ہو گئے اور شب کی تاریکی میں ان مجاہدوں سے جنگ شروع کر دی۔ بریر اور ان کے ساتھی دلیری سے لڑتے جاتے تھے اور آگے بڑھتے جاتے تھے یہاں تک کہ ان نابکاروں کے حلقہ سے نکل کر خیام کی طرف پلٹے۔ بریر اسی پر خوش تھے کہ چلو ایک مشکیزہ ہی سہی اس سے کم سے کم معصوم بچوں کے خشک گلے ہی تر ہو سکیں گے۔ جب خیمہ گاہ کے قریب پہنچے تو زور سے آواز دی "بچو! آؤ۔ پانی آ گیا"۔ اتنا سننا تھا کہ چاروں طرف سے چھوٹے چھوٹے بچے اپنے ہاتھوں میں سوکھے ہوئے کوزے لئے دوڑے اور پیاس کی شدت میں بے تابی سے اس زمین پر رکھے ہوئے مشکیزہ پر

ٹوٹ پڑے جس کی وجہ سے مشکیزہ کا تسمہ کھل گیا اور افسوس کہ وہ تمام پانی بہہ کر فوراً ریت میں جذب ہو گیا۔ بچّوں نے بے قراری کے عالم میں اپنے سوکھے گلے اُس تر ریت پر رکھنا شروع کر دیئے۔ وہ روتے جاتے تھے اور فریاد بلند کر رہے تھے کہ "آہ بُریر! کوئی کیا کرے جب ہماری تقدیر میں پانی پینا ہی نہ ہو؟" ہائے ہمارے دل شق ہو جائیں اگر ہم یہ ہی تصوّر کر لیں کہ ان مایوس ماہیٔ بے آب کی مانند تڑپتے بچّوں نے اس واقعہ کے بعد وہ رات کس طرح گزاری؟ اہلِ حرم سے اِن بچّوں کی بے چینی و بے قراری دیکھی نہ جاتی تھی۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ سیدانیاں چاہتی تھیں کہ وہ کسی نہ کسی طرح سو جائیں مگر آہ! کیا ایسی حالت کرب و بلا میں بھی کسی کو نیند آ سکتی تھی؟

عزادارو شبِ عاشور بُریر کی مشک کم از کم درِ خیمہ تک تو آ گئی مگر روزِ عاشور ایک ایسی مشک بھی تھی جو نہ درِ خیمہ تک ہی پہنچ سکی نہ اُس کا لانے والا ہی آ سکا۔ سامعین عبّاسؑ علمدار کے ساتھ دو ایسی باتیں مخصوص ہیں جو دوسرے کسی شہید میں نہیں ملتیں۔ ایک تو یہ کہ دوسرے تمام مجاہدین کو تو مولاؑ نے جنگ کی اجازت دی اور لڑنے کے لیے بھیجا مگر عبّاسؑ علمدار کو مرتے دم تک لڑنے کی اجازت نہ ملی۔ حکم ہوا تو صرف یہ کہ جاؤ پانی لے آؤ اور دوسرے یہ کہ سقائے سکینہ پانی لانے گیا بھی تو اس طرح کہ غازی کے دو ہاتھوں میں بیک وقت ایک دو نہیں بلکہ پانچ چیزیں تھیں۔ مشک بھی، علم تھا، تلوار بھی، سپر بھی اور گھوڑے کی لگام بھی۔ اس شان سے شیرِ خدا کا جگر بند سکینہؑ کی سقائی کے لیے دریا پہ آیا۔

پھر سوکھی ہوئی مشک کو کاندھے سے اتارا　　　بھرنے لگا پانی اسدُ اللہ کا پیارا
مشکیزہ کو بھر کر گیا دریا سے کنارا　　　گھبرایا وہ لشکر جو پریشان تھا سارا

پھر کیا تھا چلے تیر علمدارؑ کے اوپر
اور نیزہ و تلوار بھی تلوار کے اوپر

لڑتا ہوا جاتا تھا وہ شبیرؑ کا غمخوار　　خیموں کی طرف تیز بڑھائے ہوئے رہوار
اتنے میں چلا داہنے شانے پہ جو اک وار　　وہ ہاتھ گرا دوسرے میں تھام لی تلوار

لڑتا رہا پھر بھی شہؑہ ابرار کا بازو
ناگاہ کٹا دوسرا جرّار کا بازو

جب ہو گیا بے دست شہِ دیں کا برادر　　مجبور ہوا تیغ چلانے سے وہ صفدر
بے روک ہر اک وار پہنچنے لگا اس پر　　تیغ و تبر و تیر برستے تھے برابر

ہر سمت سے تھا لشکرِ غدار دبائے
بے دست چلا جاتا تھا رہوار دبائے

مشکیزے کو بازوئے بریدہ سے ہٹایا　　تسمہ کو لیا دانتوں میں، سینہ سے لگایا
خیموں کی طرف اسپ کو تیزی سے بڑھایا　　ناگاہ لگا مشک پہ اک تیر جو آیا

اس تیر سے صدمہ یہ ہوا جھک گئے عباسؑ
بہنے لگا پانی تو وہیں رک گئے عباسؑ

اک گرز کسی نے سرِ عباسؑ پہ مارا　　اس ضرب کے لگنے سے ہوا سر بھی دوپارہ
سنبھلا نہ گیا زین پہ ریتی پہ وہ آیا　　گرتے ہوئے گھوڑے سے شہہ دیں کو پکارا

ہے وقتِ مدد ابنِ یداللہ خبر لو
قربان فدائی ہوا یا شاہ خبر لو

سنتے ہی چلے نہر کی جانب شہہ صفدر　　کس شان سے دیکھو تو ذرا جاتے ہیں سرور
بھائی نہ بھتیجے نہ علمدار نہ لشکر　　اس وقت فقط ساتھ ہیں، ہمشکل پیمبر

انصار و اعزہ کا الم کونسا کم تھا
اُس پہ علمِ احمدِ مرسل ہوا ٹھنڈا

اے بھائیو دیکھو تو ذرا پیاسوں کی تقدیر — پانی کی نہ بچوں کے لئے ہو سکی تدبیر
افسوس کہ بے دست ہوا بازوئے شبیرؑ — بن بھائی کے اب دین کا سلطان ہے دلگیر

پانی کی طرح خونِ علمدار بہا ہے
ریتی پہ ہے مشکیزہ، علم ساتھ پڑا ہے

ہے ہے شہ والا کا فدائی گیا مارا — فریاد ہے شبیرؑ کا بھائی گیا مارا
جس کو نہ گوارا تھی جدائی گیا مارا — وہ اُلفتِ شبیرؑ کا داعی گیا مارا

عباسؑ علیؑ عازمِ دربارِ خدا ہیں
دو نیم ہے سر جسم سے شانے بھی جدا ہیں

اے دل تو ذرا شہؑ کے علمدارؑ سے کہہ تو — اے حق کے فدائی ابھی کوثر پہ نہ جاؤ
پیاسی ہے سکینہؑ اُسے پانی تو پلا دو — شبیرؑ کی بچی تو بہت پیاری ہے تم کو

وہ تم سے ہلی ہے اُسے غربت میں نہ چھوڑو
سقائے حرم' پیاسی ہے وہ آس نہ توڑو

رہتا تھا سکینہ پہ سدا پیار تمہارا — کیوں ایسی دُلاری کو بھلا دل سے اُتارا
دیکھو تو ذرا ٹوٹ گیا اُس کا سہارا — تم نے نہ سُنا اُس نے چچا کہہ کے پکارا

کیا ہو گیا ہے آج خبر بھی نہیں لیتے
وہ روتی ہے اور آپ اثر بھی نہیں لیتے

عباسؑ خبر لیجئے روتی ہے سکینہؑ — بے چین ہے منہ اشکوں سے دھوتی ہے سکینہؑ
افسوس کہ بے آسرا ہوتی ہے سکینہؑ — آرام دل و جاں کو کھوتی ہے سکینہؑ

دو ایک اشارہ اسے نزدیک بُلا لو
سینے سے ذرا پیاری بھتیجی کو لگا لو

ہے ہے شہِ بیکس کا مددگار سدھارا   ماری گئی سب فوج علمدار سدھارا
بے آس ہیں شبیرؑ وفادار سدھارا   تھا جس کا سکینہؑ پہ بہت پیار سدھارا
کیسی یہ بلا ننھی سی بچی پہ پڑی ہے
وہ آس میں ابتک درِ خیمہ پہ کھڑی ہے

اطفالِ حرم کو جو کئی روز کی ہے پیاس   معصوموں کے چہروں سے برستی ہے عجب یاس
عباسؑ کے دم تک انہیں پانی کی رہی آس   تکتے تھے کھڑے لڑتے تھے جب حضرتِ عباسؑ
کہتے تھے کہ سقّائے حرم خیر سے آئے
پانی سے بھری مشک کو اب خیمہ میں لائے

اے دوستو دیکھو تو ذرا بچوں کا عالم   پیاسے ہیں کئی روز کے سن بھی ہے بہت کم
اس پر بھی نہ فریاد و فغاں اور نہ ماتم   لب پر ہے فقط واعطشا چشم ہے پُرنم
کیا گذری ہو کیا جانئے بچوں کے دلوں پر
جب تیر برسنے لگے غازی پہ سراسر

کہہ اے دلِ ناداں کہ عباسؑ کے صدقے   اطفالِ شہِ دیں کی اس پیاس کے صدقے
میدان کو تکنے کے اور اس آس کے صدقے   کیسی ہوئی پھر یاس میں اس یاس کے صدقے
دروازۂ خیمہ پہ کھڑے ہونے کے صدقے
پھر خاک پہ بے حال پڑے رونے کے صدقے

اے سیدِ عادل کے علمدار میں قرباں   شبیرؑ کی سرکار کے مختار میں قرباں
اے حیدرِ کرار کے دلدار میں قرباں   بے ہمدم و مونس کے مددگار میں قرباں

ٹکڑے ہو بدن ہاتھ بھی شانوں سے جدا ہو
قرباں ہوئے ہم پر ترے لاشے پہ فدا ہوں

عباسؑ علیؑ اے پسرِ فاتحِ خیبر شبیرؑ کو تم نے نہ کبھی جانا برادر
کہتے رہے آقا ہی انہیں آپ برابر اپنے تئیں ادنیٰ سا غلام شہہ صفدر
تعظیم کے آداب میں اس طرح رہے گم
بوسے قدمِ پاک کے لیتے تھے سدا تم

پر آج شہادت نے تمہیں کیسا سُلایا تعظیم نہ دی ابنِ یداللہ جو آیا،
تم کو جو پکارا تو جواب اُس نے نہ پایا کیا ہو گیا تسلیم کو سر تک نہ جھکایا
فرزندِ شہہ بدر و حنین آئے ہیں اٹھو!
عباسؑ علیؑ، دیکھو حسینؑ آئے ہیں اٹھو!

تسکین تو دِ قلب برادر ہوا سُونا شبیرؑ کا دیکھو تو بھرا گھر ہوا سُونا
دربارِ شہنشاہِ دلاور ہوا سُونا اے ماہِ تمام عالمِ اختر ہوا سُونا
لشکر کا گماں ہوتا تھا دیدارِ علم سے
فوجوں سے کہیں بڑھ کے تھی شوکت ترے دم سے

اے ثانیِ حیدرؑ تری ہمت کے میں صدقے میرے لئے دی جان سخاوت کے میں صدقے
قربانی و ایثار و ہدایت کے میں صدقے جرأت پہ فدا اور شجاعت کے میں صدقے
بچوں کا بھی اپنے تجھے کچھ دھیان نہ آیا
ہم لوگوں کی خاطر ہی جوانی کو گنوایا

قربان ہوں میں تجھ پہ یداللہ کے جائے میرے لئے تو تیغ و سناں شوق سے کھائے
اور اپنی سکینہؑ کا تجھے دھیان نہ آئے میرے لئے میدان میں شانے بھی کٹائے

میرے لئے زخموں سے بدن چور ہو سارا

کر جائے میرے واسطے بخشش کا سہارا

تلا تجھے عباسؑ کا کچھ غم نہیں اے دل
کچھ تجھ میں نشانِ الم و ہم نہیں اے دل

وئی بھی ترا شوق ابھی کم نہیں اے دل
کیا اب بھی تجھے فرصتِ ماتم نہیں اے دل

افسوس ادیمؔ تو ہی بتا کیسا یہ غم ہے؟

نے حرص گھٹی اور نہ جذبہ کوئی کم ہے؟

کی جاسکتی ہے ورنہ رضائے الہٰی سے محرومی لازمی ہے۔ اب سلنے کی طرح کس کے ساتھ ہوجانا چاہیئے اور کس کے سائے سے دُور بھاگنا چاہیئے، اس کا فیصلہ خود سامعین کو کرنا ہوگا۔ تاریخ بہرحال محفوظ ہے اور واقعات بہر طور مذکور۔ سوچنا، سمجھنا اور فکر و تدبر کے بعد کسی قطعی فیصلہ پر پہنچنا افراد کا اپنا عمل ہے جو بالکل اختیاری ہے۔ جبر کو ہرگز اس امر میں دخل نہیں اسلئے کہ "لا اکراہ فی الدین" (دین میں جبر نہیں ہے) نیز یہ کہ جبر کی رسائی اگر ہے بھی تو صرف جسم تک اور دین کا جسم سے کوئی تعلق نہیں۔ دین تو براہِ راست نفس سے متعلق ہے۔ نفس، رُوح، قلب، افکار، خیالات۔ یہ سب جبر کی دسترس سے باہر ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ " افلا یتدبرون اور افلا یعقلون" کی تلقین اور تنبیہہ جو قرآن حکیم میں مکرر اور جابجا کی گئی ہے اُسے نظر انداز کرکے انصاف کا فیصلہ نہ کرنا ظلم ہے اور ظالم کو اللہ دوست نہیں رکھتا۔

اب ہم پُرانے اور نئے سامعین کی خاطر اُن کی یاد تازہ کرانے اور مجالس کے سلسلے کو مربوط رکھنے کے لئے گزشتہ نکات کو پھر دُہرانا مناسب خیال کرتے ہیں تاکہ اس تکرار سے نفوس پر نقش بیٹھتے چلے جائیں۔

(۱) حقیقت کے مطابق اظہار کرنا بشرطیکہ احقاقِ حق کے لئے ہو صدق ہے، بدنیتی سے ہو تو جھوٹ ہے۔

(۲) خلافِ حقیقت بیان جبکہ ہدایتِ خلق کے لئے ضروری ہو، جھوٹ نہیں بلکہ مکر و تقیہ ہے۔

(۳) ہادیانِ دین کا ہر حرکت و سکون نفسِ انسان پر گہرے نقوش بٹھانے کیلئے مظاہرہ ہوتا ہے جو حقیقت نہیں ہوتا۔

(۴) لا الٰہ الا اللہ کہنے والوں کو قرآن میں "یاایہا الذین آمنوا"

یعنی اے ایمان لانے والو ہی کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے لیکن اکثر کی کیفیات جو بیان کی گئی ہیں وہ قابلِ مذمّت ہیں۔

(۵) قرآن یہودیوں کے ایک ایسے گروہ کی نشاندہی کرتا ہے جو تخریب اسلام کے لئے مسلمان ہوا اور اُس نے بے شمار خلافِ عقل و فطرت باتیں مسلمان علماء تک پہنچائیں جو حماقت پر مبنی ہونے کے باوجود اب بھی علمِ دین میں شامل ہیں اور اکثر علماء ان پر ایمان رکھتے ہیں۔

(۶) قرآن کی رُو سے ایمانِ حقیقی کی پہچان حُبّ شدید ہے اور حبِ شدید کی علامت "وجلت قلوبہم" ہے یعنی نام سُنتے ہی دِل لرز جائے۔

(۷) قرآن میں ایسے مومنین کا ذکر ہے جو رسُول کے ساتھ ایمان میں شریک ہیں۔ حضرت ابو طالبؑ ان میں شامل ہیں اور ان کے ایمان کی قسم قرآن نے اس طرح کھائی ہے "لا اقسم بھٰذا البلد و انت حلّ بھٰذا البلد و والد وما ولد "۔ (ترجمہ: قسم ہے اس شہر کی اور تم اس میں رہتے ہو اور ایک باپ اور بیٹے)۔

(۸) تمام مذاہب میں صرف اسلامی نماز ہی ایسی ہے جو تقسیمِ توجہ کے ساتھ ذکرِ الٰہی کی تعلیم دیتی ہے اور ہماری اس نماز نے "ہتھ کار دل مَن یار ول" کا عجیب نسخہ کیمیا فراہم کیا ہے۔

(۹) یہ سوال کہ رسُولؐ کی بعثت کا مقصد تزکیۂ نفس ہے نہ کہ سلطنت اور تنظیم عسکری کا قیام۔ تو غور و فکر کرنے والوں کے نزدیک تو ایسے وسوسے کوئی اہمیّت نہیں رکھتے وہ تو سمجھ سکتے ہیں کہ حصُولِ مقصد کے لئے جو ذرائع اختیار کئے جائیں وہ تکمیلِ مقصد کا ایک جُزو ہوتے ہیں۔ اس میں بہت سے راز پوشیدہ ہیں۔ محبوبِ خدا رحمت اللعالمین ہیں اور اُن کو تمام عالم کی اقوام کو ہدایت کرنا ہے

لہذا تنظیم عسکری قائم کر کے دُنیا کو یہ سبق دینا تھا کہ کسی قوم کی زندگی اور بقا کا انحصار تنظیم عسکری پر ہے۔ جو قوم منظّم ہو جائے گی وہ دوسروں پر غالب آئے گی۔

(۱۰) قانونِ فطرت کے مطابق جب کوئی قوم تعیّش میں پڑ کر آزادی کی اہلیت کھو دیتی ہے تو اُس پر ایسی قوم کو مُسلّط کر دیا جاتا ہے جو سخت جان اور جفاکش ہو اور اس طرح بدکردار اقوام کو خلافِ فطرت اعمال کی سزا دینے کے لئے تنظیم عسکری کی ضرورت ہے۔

(۱۱) قانونِ فطرت ہے کہ جب موت سامنے رہے حتّٰی کہ خوف کی جگہ شوق لے لے تو قوّتِ ادراک میں ترقّی ہوتی ہے اور عالمِ غیب یا عالمِ نور کا مُشاہدہ ہو جاتا ہے اور اس طرح کچھ تزکیۂ نفس حاصل ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی اشخاص کو شہید کہا جاتا ہے۔ تو مطلب یہ ہُوا کہ شوقِ شہادت میں نکلنے والوں کے لئے تنظیم عسکری تزکیہ کے حصول کا ذریعہ ہے۔

(۱۲) اصل اور عظیم تر مقصد یہ تھا کہ احباب کے قلوب کو تڑپانے کے لئے ذبحِ عظیم پیش کرنا تھی جو کسی محدود علاقہ میں ہوتی تو بے فائدہ ہوتی۔ اسلئے ضرورت تھی کہ اس پُر درد مظاہرے کے لئے اسلامی سلطنت کا علاقہ وسیع تر ہو جہاں ہر گوشہ تک اس قربانی کا اثر پھیل سکے۔

(۱۳) رسولؐ اور آلِ رسولؐ کو اہلِ عالم کو اپنی محبت کی طرف بلانا تھا مگر وہ فاتح کی حیثیت سے مُلک کی توسیع میں حصّہ نہیں لے سکتے تھے اس لئے کہ مفتوح کو فاتح سے محبت نہیں بلکہ نفرت ہوتی ہے۔ پس ضروری ہُوا کہ تنظیم عسکری قائم ہو اور اُس کے سربراہ اغیار ہوں۔

(۱۴) آلِ رسولؐ کی قربانی کا ذریعہ ایسے عساکر ہی ہو سکتے تھے جن کے سربراہ رسولؐ اور آلِ رسولؐ کے بدترین دشمن ہوں۔ اگر یہ سربراہ غیر مُسلم ہوتے تو وہ اہلِ

اسلام کو طعن و تشنیع کا ہدف بناتے اور کہتے کہ دیکھو ہم نے تمہارے پیشوایانِ دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور تمہارا خدا اُن کی مدد بھی نہ کر سکا۔ پس ایسے عساکر کے سربراہوں کا ظاہراً مسلمان ہونا ضروری تھا۔

(۱۵) اہلبیتؑ کو تو بحکمِ خدا یہ عظیم قربانی پیش کرنا ہی تھی مگر اسکے لیے بنی ہاشم کے بدترین دشمن بنو اُمیّہ کے گروہ کو منتخب کیا گیا اور اُن کی حکومت کیلئے ایک ہزار مہینے مقدّر کر دیئے گئے۔

(۱۶) صبر کے معنی بے چارگی، مجبوری اور کسمپرسی نہیں ہیں۔ بلکہ صبر کے معنی ہیں انتہائی نامساعد حالات میں پامردی اور استقلال کا ثبوت دینا۔ صابر وہ نہیں جس پر حالات نے غلبہ حاصل کر لیا ہو بلکہ وہ ہے جو حالات پر غالب آئے اور تاریخ کا رُخ موڑ دے۔

تو آیئے اب ہم جنگِ خیبر میں اس "حین الباس" کی صفت کا مزید جائزہ لیتے ہیں۔

بقول شبلی یہ واقعہ ۶ھ کے آخر یا شروع ۷ھ کا ہے۔ خیبر کے معنی ہیں "قلعہ" اور یہ مدینہ سے تقریباً آٹھ منزل پر واقع تھا۔ لیکن ایک یوروپین سیاح نے جو یہاں ۱۸۶۲ء میں مقیم رہا، لکھا ہے کہ اس کا فاصلہ مدینہ سے تقریباً دو سو میل ہے۔ وہ علاقہ نخلستان جسکے کنارے پر یہ قلعہ واقع تھا بہت زرخیز تھا اور یہاں یہودیوں نے کئی اور مضبوط قلعے بنائے ہوئے تھے۔ اس طرح یہ مقام عرب میں یہودیوں کی قوّت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ مدینہ سے جب رؤسا بنو نضیر جلاوطن ہو کر خیبر میں آباد ہوئے تو انھوں نے تمام عرب کو اسلام کے خلاف برانگیختہ کر دیا جس کے نتیجے میں جنگِ خندق واقع ہوئی۔ ان رؤساء میں حیّ بن اخطب معرکۂ قریظہ میں قتل ہوا اس کے بعد ابو رافع سلام بن ابی الحقیق

جانشین ہوا، یہ بہت با اثر تاجر تھا۔ غطفان عرب کا ایک بڑا صاحب اقتدار قبیلہ تھا اس کی آبادی خیبر سے متصل تھی اور اس کے لوگ ہمیشہ سے خیبر کے یہودیوں کے حلیف تھے۔ سنہ ھ میں سلام نے خود جا کر قبیلہ غطفان اور ان کے آس پاس کے قبائل کو اسلام کے مقابلہ کے لئے آمادہ کیا یہاں تک کہ ایک عظیم الشان فوج لیکر مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں لیکن وہ سوتے ہوئے اپنے قلعہ میں مارا گیا۔ آنحضرتؐ کو ان تیاریوں کی خبریں برابر پہنچ رہی تھیں۔ شبلی لکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے ایما سے سلام کے بعد یہودیوں نے اُسیر بن رزام کو مسند ریاست پر بٹھایا۔ اسنے قبائل یہود کو جمع کر کے ایک تقریر کی اور کہا کہ "میرے پیش روؤں نے محمدؐ کے مقابلے کے لئے جو تدابیر اختیار کی تھیں وہ غلط تھیں اور صحیح تدبیر یہ ہے کہ ہم کو خود محمدؐ کے دار الریاست پر حملہ کرنا چاہیئے اور میں یہی طریقہ اختیار کروں گا"۔۔۔ اب یہاں یہ بات سمجھ سے باہر ہے کہ بقول شبلی اگر اُس کو حکومت ملی ہی تھی آنحضرتؐ کی مرضی سے تو پھر یہ جنگ کی تقریر کیسی ہے؟۔ بہر حال اُسیر نے غطفان اور دیگر قبائل کا دورہ کیا اور نئے سرے سے لشکر کی ترتیب دی۔ آنحضرتؐ کو جب اسکی اطلاع ملی تو آپؐ نے عبداللہ بن رواحہ کو بھیجا کہ وہ خود جا کر خیبر کے حالات معلوم کر کے لائیں۔ چنانچہ وہ چند آدمیوں کے ساتھ خیبر پہنچے اور چھپ کر اُسیر کی زبانی اُس کی تدبیروں اور مشوروں کو سنا اور واپس ہو کر تمام حال آنحضرتؐ کو سنایا۔ آپؐ نے عبداللہ کو تیس آدمیوں کے ساتھ پھر دوبارہ خیبر روانہ کیا۔ وہاں پہنچکر عبداللہ نے اُسیر سے گفتگو کی اور کہا کہ آنحضرتؐ نے ہم کو اسلئے بھیجا ہے کہ اگر تم ہمارے ساتھ چلو تو خیبر کا اقتدار تم کو سونپ دیا جائے گا۔ یہ بھی مولانا شبلی کا بیان ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ جب وہ پہلے ہی آنحضرتؐ کی ایما سے مسند نشین ہو چکا تھا تو اب یہاں کونسی حکومت دینے کا وعدہ کیا جا رہا ہے۔ بہر حال یہ شبلی کی

تحقیق ہے۔ ہم آگے بڑھتے ہیں۔ چنانچہ اُسیر تیس آدمیوں کو لے کر خیبر سے نکلا اور احتیاطاً اس قافلہ کو اس صورت سے مخلوط کر دیا کہ دو دو اشخاص جن میں ایک یہودی اور دوسرا مسلمان تھا، ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ قرقرہ پہنچکر اُسیر کے دل میں بدگمانی پیدا ہوئی اور اُسنے ہاتھ بڑھا کر عبداللہ بن اُنیس کی تلوار چھیننا چاہی۔ عبداللہ نے کہا دشمن خدا تو بد عہدی کرنا چاہتا ہے؟۔ یہ کہہ کر اپنی سواری بڑھائی اور نزدیک ہو کر ایک وار کیا جس سے اُس کی ران کٹ گئی اور وہ گھوڑے سے گرتے گرتے عبداللہ کو بھی زخمی کر گیا۔ اس واقعہ پر مسلمان یہودیوں پر ٹوٹ پڑے۔ ایک یہودی کے علاوہ اور کوئی زندہ نہ بچ سکا۔ اس حادثہ سے یہودیوں میں ایک ہیجان برپا ہو گیا اور وہ پوری شدت سے تمام دشمنانِ اسلام کو یکجا کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے تاکہ آئندہ ایک متحدہ لشکرِ کثیر تیار کر کے مسلمانوں اور مدینہ کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیا جائے۔ سلام کی موت کے بعد اُس کا بھتیجہ کنانہ بن الربیع خیبر کے مشہور قلعہ قموص کی ریاست کا والی ہوا۔ اُدھر مدینہ سے منافقین یہودیوں کو مسلسل خبریں پہنچاتے رہتے اور ہمت دلاتے کہ تم پر مسلمان فتحیاب نہیں ہو سکتے۔ رسولِ خدا نے چاہا کہ ان یہود سے ایک معاہدہ صلح ہو جائے لیکن اُن کی شقی القلبی، اسلام دشمنی اور بدگمانی کے سبب ایسا نہ ہو سکا اور اب خیبر اسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ اور حریف بن چکا تھا۔

غطفان کا ایک طاقتور قبیلہ بنو فزارہ خیبر پہنچا اور اُنکے ساتھ شریک ہو کر مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے کا وعدہ کیا۔ آنحضرتؐ نے ان لوگوں کو ایک خط لکھا جسمیں تحریر تھا کہ خیبر فتح ہونے پر اُن کو بھی حصہ دیا جائے گا اور اُن کو خیبر کے یہودیوں کی مدد کرنے سے باز آ جانا چاہیئے مگر بنو فزارہ نے انکار کر دیا۔ اُن کی شرکتِ جنگ کی وجہ یہ تھی کہ ذی قرد کی چراگاہ پر جو آنحضرتؐ کی اونٹنیوں کے

کی چراگاہ تھی، اس قبیلہ کے چند آدمیوں نے عبدالرحمٰن بن عُنیبہ کی سرکردگی میں چھاپہ مارا اور بیس اونٹ پکڑ کر لے گئے۔ حضرت ابوذر کے صاحبزادے جو اونٹوں کی حفاظت پر متعین تھے مارے گئے اور اُن کی بیوی کو بھی وہ لوگ گرفتار کر کے لے گئے۔ مُسلمانوں کو جب اس غارت گری کی خبر ملی تو انہوں نے حملہ آوروں کا تعاقب کیا جو بھاگتے بھاگتے درّہ میں جا گھُسے۔ کافی لڑائی کے بعد اُن لوگوں نے راہِ فرار اختیار کی۔

اس واقعہ کے چند روز بعد خیبر کی جنگ پیش آئی۔ شبلی لکھتے ہیں کہ اس جنگ کے اسباب اور اہمیت میں ایک خاص امتیاز ہے جو باقی غزوات اور جنگوں میں کہیں نہیں ملتا۔ اوّل یہ کہ جب آنحضرتؐ نے خیبر کا قصد کیا تو یہ اعلانِ عام کر دیا کہ ہمارے ساتھ صرف وُہی لوگ آئیں جو طالبِ جہاد ہوں۔ ایک مدّت تک لوگ عرب کے قدیم طریقے کے مطابق جہاد کو معاش کا ذریعہ ہی سمجھتے رہے۔ چنانچہ اب تک یہ لوگ مالِ غنیمت کے حصول کی وجہ سے ہی غزوات وغیرہ میں شرکت کرتے تھے اور جہاں مقابلہ سخت درپیش آجاتا اور لُوٹ کے نہ ملنے کا احتمال ہوتا تو وہ لڑائی سے کترانے کے لئے طرح طرح کے بہانے بنایا کرتے، وہاں سے کھسک جاتے یا پھر جنگ سے بھاگ جاتے تھے۔ خیبر کی پہلی جنگ ہے جہاں یہ پردہ اُٹھا دیا گیا۔

دوسرا نمایاں فرق یہ تھا کہ اب تک جو لڑائیاں ہوئیں وہ محض دفاعی تھیں لیکن اس جنگ میں غیر مُسلم رعایا بنائے گئے اور طرزِ حکومت کی بُنیاد ڈالی گئی۔ اسلام کا اصلی مقصد دعوتِ تبلیغ ہے۔ اب اگر کوئی قوم اس دعوت کے راستہ میں حائل نہ ہو تو اس سے نہ جنگ ہے اور نہ اُسے رعایا بنانے کی ضرورت۔ صرف معاہدہ صلح کافی ہے جس کی مثالیں اسلام میں کافی موجود ہیں لیکن جب کوئی قوم خود اسلام

تسلیم ہے اور گو شیعہ ہونا بے اعتباری کی دلیل نہیں ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ جس روایت میں حضرت عمر کے بھاگنے کا واقعہ شیعہ کی زبانی بیان کیا جائے اُس کا رتبہ کیا رہ جاتا ہے؟ مگر شبلی یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس کے علاوہ اوپر بیان کی گئی روایت کو عبداللہ بن بریدہ نے بھی اپنے والد کی سند سے بیان کیا ہے لیکن محدثین کو اس بات میں شبہ ہے کہ جو روایتیں اُن کے باپ کے سلسلے سے منقول ہیں وہ صحیح بھی ہیں کہ نہیں۔" لیکن اس میں تو کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ اُن کو آنحضرتؐ نے مع فوج جنگ کرنے کے لئے بھیجا اور وہ تمام فوج کے ساتھ واپس تشریف لے آئے!! دشمن کے آگے پاؤں نہ جم سکے ہوں گے تبھی تو بخیریت واپسی ہوئی ہوگی ورنہ تاریخ میں اور کوئی خاص بات تو واپسی کے سبب کی ملتی نہیں ـــ آخر میں شبلی کو چاروناچار یہ لکھنا پڑ ہی گیا کہ "تاہم اس قدر ضرور صحیح ہے کہ اس مہم پر بڑے بڑے صحابہ بھیجے گئے لیکن فتح کا فخر کسی اور کی قسمت میں تھا۔"

غرض اس قلعہ کو فتح کرنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی اور اسی طرح محاصرہ، لڑائی، موسم کی سختی، مسلمانوں کی بددلی اور عالم سراسیمگی میں بیس روز گزر گئے تو ایک شام آنحضرتؐ نے فرمایا "یحبّ لو اعطینا الرایۃ غدا رجل کرار غیر فرار یحبّہ اللہ واللہ ورسولہ لن یرد حتّٰی یفتح اللہ علی یدیہ" (کل میں ایسے شخص کو علم دوں گا جو بار بار حملہ کرنے والا ہے اور بھاگنے والا نہیں ہے۔ جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول اُس سے محبت کرتے ہیں۔ وہ ہرگز واپس نہ آئے گا جب تک اللہ اُس کے ہاتھ پر فتح عطا نہ کردے) اس حدیث کے مضمون کی ایک آیت ۵۴ تا ۵۶ سورہ مائدہ میں پارہ ۶ وہ بھی سُن لیجئے: یا ایّہا الّذین اٰمنوا من یرتدّ منکم عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبّہم و یحبّونہ

اذلّۃ علی المومنین اعزّۃ علی الکٰفرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لآئم ط ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یّشآء ط واللہ واسعٌ علیم o انّما ولیکم اللہ ورسولہ والذین آمنوا الّذین یقیمون الصّلوٰۃ ویؤتون الزّکوٰۃ وھم راکعون o ومن یّتول اللہ ورسولہ والّذین اٰمنوا فان حزب اللہ ھم الغٰلبون o" (اے ایماندارو تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائیگا تو پھر جائے) عنقریب ہی خدا ایسے لوگوں کو ظاہر کرے گا جنہیں خدا دوست رکھتا ہوگا اور وہ اُس کو دوست رکھتے ہوں گے۔ ایمانداروں کے ساتھ منکسر (اور) کافروں کے ساتھ سخت۔ خدا کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی کچھ پرواہ نہ کرینگے۔ یہ خدا کا فضل و کرم ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور خدا تو بڑی گنجائش والا واقف کار ہے اے ایماندارو) تمہارے مالک سرپرست تو بس یہی ہیں، خُدا اور اس کا رسُول اور وہ مومنین جو پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں اور جس شخص نے خدا اور رسُول اور (ان ہی) ایمانداروں کو اپنا سرپرست بنایا تو (خدا کے لشکر میں آ گیا اور) اس میں تو شک نہیں کہ خدا ہی کا لشکر غالب رہتا ہے)۔

آنحضرتؐ کے کلام کے بعد وہ رات نہایت اُمید اور انتظار کی رات تھی صحابہ نے تمام رات اس بیقراری میں کاٹی کہ دیکھئے یہ تاجِ فخر کس کے ہاتھ آتا ہے۔ دیگر معتبر روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اس بے چینی اور اُمید کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ حضرت علیؑ مرتضٰے بوجہ آشوبِ چشم مدینہ ہی میں چھوڑ دیئے گئے تھے۔ میدان خالی تھا اور اہلِ کتاب کے مُقابلہ میں فتح پانا ایسی بین بزرگی تھی کہ جتنی بھی اُس کی آرزو کی جاتی کم تھی۔ طلوعِ فجر سے پہلے پہلے آنحضرتؐ کے خیمہ کے سامنے

اچھا خاصا ہجوم تھا۔ اُس صبح حضرتؐ نے نماز اپنے خیمہ ہی میں ادا کی اور بعد نماز اُپنا خاص علَم خود اپنے دستِ مبارک سے باندھا۔ پھر باہر تشریف لائے۔ صحاب پر ایک نظر ڈالی۔ لوگوں کے دل دھڑک رہے تھے اور ہر شخص اس کوشش میں متحرک تھا کہ رسولِؐ خدا اُس کی جانب متوجہ ہوں۔ لیکن سب کی اُمیدوں پر یکدم پانی پھر گیا۔ آپؐ نے آواز دی۔ "این اخی ابن علیؑ بن ابی طالبؑ!" یہ کلمہ بلند ہونا تھا کہ بہ اعجاز حضرت علیؑ سامنے تھے۔ عرض کی "لبیک لبیک یا رسول اللہ"۔ مجمع کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ چہرے زرد اور منھ کھلے ہوئے تھے۔ آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کی آنکھوں پہ اپنا لعابِ دہن لگایا تو آنکھیں ٹھیک ہوگئیں۔ اور پھر یہ الفاظ ارشاد فرمائے "اللّٰھم اکفہ الحرّ والبرد" اور علَم ہاتھ میں دے کر کہا کہ یا علیؑ اس قلعہ کو فتح کیے بغیر اِدھر رُخ نہ کرنا۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ اس دن سے پیشتر میں نے سرداری کی کبھی اس درجہ تمنّا نہیں کی تھی۔ علَم لینے کے بعد حضرت علیؑ آگے بڑھے اور بغیر مڑے ہوئے دریافت کیا کہاں تک لڑوں؟" آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ جب تک وہ سب قائل شہادتین نہ ہو جائیں۔ یہاں شبلی لکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے رسولؐ خدا سے سوال کیا تھا کہ کیا یہود سے لڑکر مسلمان بنالوں؟۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ نرمی کے ساتھ اُن پر اسلام پیش کرو۔ اگر ایک شخص بھی تمہاری ہدایت سے اسلام لے آئے تو سُرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔ لیکن یہ یہود اسلام یا صلح قبول کرنے پر راضی نہیں ہوسکتے تھے چنانچہ مرحب قلعہ سے یہ رجز پڑھتا ہوا نکلا "خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں، دلیر ہوں تجربہ کار ہوں، سلاح پوش ہوں۔" اُس کے سر پر یمنی زرد رنگ کا مغفر اور اُس کے اوپر پتھر کا خود تھا۔ جواب میں حضرت علیؑ نے فرمایا "میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر (شیر) رکھا اور

میں شیرِ نیستاں کی طرح مہیب اور خوفناک ہوں"۔

لڑائی شروع ہو گئی اور مرحب نے پہلا وار کیا جسے حضرت علیؑ نے روکا اور روکتے ہی فوراً اس سرعت اور طاقت کے ساتھ اپنی تلوار ماری جو بجلی کی کڑک کے مانند مرحب کے سر پر پڑی اور اس کے خود کو کاٹتی ہوئی سر کو دوبارہ کرتی ہوئی دانتوں تک در آئی۔ اس ضربتِ حیدری کی آواز اس قدر دہشتناک تھی کہ تمام فوج نے سنی اور سب پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ مرحب کے مارے جانے کے بعد تمام یہود نے عام حملہ کر دیا تو آپ جلال میں آکر بپھرے ہوئے شیر کی مثل اُن پر جا پڑے اور ذوالفقار سے کشتوں کے پشتے لگانا شروع کر دیئے اسی اثناء میں آپؑ کے ہاتھ سے سپر چھوٹ کر نیچے گر پڑی تو آپؑ نے، بقول خود امیرالمومنینؑ قوتِ ربانیہ سے قلعہ کا وہ در جو پتھر کا تھا اور ایک روایت کے مطابق قلعہ کی کھائی پر پُل کا کام بھی دیتا تھا، بائیں ہاتھ سے اکھاڑ لیا اور اس سے سپر کا کام لینا شروع کر دیا اور لڑائی یہاں تک جاری رکھی کہ قلعہ قموص فتح ہو گیا۔ آپؑ نے اس دروازۂ سنگ کو جب پھینکا تو بقول شبلی ابورافع نے سات آدمیوں کے ساتھ اسے اٹھانا چاہا مگر وہ ہلایا بھی نہ جا سکا۔ ساتھ ہی شبلی نے یہ روایت بھی نقل کر دی ہے کہ یہ مبالغہ آمیز افواہ ہے اور ابنِ اسحاق اور حاکم کے حوالے سے اسے بازاری قصہ قرار دیا ہے۔ (مولف گوید: کتنے افسوس کی بات ہے کہ مولوی شبلی انسان میں قوائے باطنی کی بے پناہ طاقتوں سے کس درجہ غافل تھے انسانِ کامل جسکے قوائے باطنی اپنے کمال پر ہوں تو پہاڑ کو بھی اپنی جگہ سے ہٹا دے۔ فی زمانہ تو یوروپین محققین بھی اسکے قائل ہیں اور تجربوں کی بنا پر یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر معمولی انسان بھی اپنے قوائے باطنی کو اجاگر کر لے تو وہ حیرت انگیز باتیں دکھانے میں آسکتی ہیں جنکو معجزات کہا جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ انسان کے نفس میں ہے)۔

الغرض اس جنگ میں ۹۳ یہودی مارے گئے جن میں حارث، مرحب، اسیر، یاسر، انتر اور عامر سب کے سب آزمودہ کار جنگجو اور شہرت یافتہ تھے اور یہ ذوالفقارِ حیدری کا لقمۂ اجل بنے۔ ادھر ۱۵ مسلمان شہید ہوئے۔ حضرت علیؑ نے تمام اہلِ قلعہ کو داخلِ دائرۂ اسلام کیا اور مرحب کی بہن حضرت صفیہ کو آپؑ نے نہایت عزت و احترام کے ساتھ جنابِ رسولِ خدا کی خدمت میں بھیج دیا جو بعد میں آنحضرتؐ کے نکاح میں آئیں۔ اس جنگ و فتح کے بعد جب آپ رسولِ خدا کی خدمت میں واپس آئے تو آنحضرتؐ نے کافی آگے بڑھ کر آپ کا استقبال کیا، سینہ سے لگایا۔ چہرہ کی گرد اپنے دامن سے صاف کی اور دونوں آنکھوں کے درمیان بوسے لیے اور ارشاد فرمایا کہ "یا علیؑ! اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ میری امت کے لوگ تمہارے حق میں وہی کچھ کہنے لگیں گے جو نصاریٰ عیسیٰ ابنِ مریم کے بارے میں کہنے لگے تو میں آج تمہاری کچھ فضیلتیں بیان کرتا جن کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جس طرف سے تم گزرتے تو لوگ تمہارے قدموں کے نیچے کی خاک اٹھا کر اپنی آنکھوں میں بطور سرمہ لگاتے اور اپنی بیماریوں کا اس سے علاج کرتے۔"

خیبر کی فتح کے بعد مفتوحہ زمین پر قبضہ کر لیا گیا لیکن یہود نے درخواست کی کہ زمین ہمارے قبضہ میں رہنے دی جائے اور ہم پیداوار کا نصف حصہ ادا کرتے رہیں گے جسے منظور کر لیا گیا۔ شبلی یہ بھی لکھتے ہیں کہ زمین تمام مجاہدین میں جو اس جنگ میں شریک تھے، تقسیم کر دی گئی۔ اسی میں آنحضرتؐ کا خمس بھی تھا اور اس کے علاوہ ایک حصہ رسولِ خدا کے لیے مخصوص کر دیا گیا جسے "صفی" کہتے ہیں۔"

تو یہ تھے جنگِ خیبر کے حالات و واقعات جو آپ نے سماعت فرمائے۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کیجیے کہ وہ کون کون حضرات تھے جن کو مرحب کے مقابلے کیلئے مع فوج کے بھیجا گیا اور وہ اس کی شکل ہی دیکھ کر پلٹ پلٹ آتے اور الزام لگایا

کر لشکر بھاگ گا تو ہم بھی بھاگے اور لشکر نے کہا کہ وہ حضرت بھاگ کھڑے ہوئے تو ہمارے وہاں ٹھہرے رہنے کا کیا جواز تھا۔ ایک طرف تو یہ منظر ہے اور دوسری طرف یہ عالم کہ جو "حین الباس" کی صفت کا حامل تھا وہی اُس مہیب دیو ہیکل جنگجو کا مُقابل ہُوا اور اُس کے ٹکڑے کر کے رکھدیئے۔

آئیے اِس صفت کا جائزہ کربلا کے میدان میں بھی لیں جہاں اس خاندانِ رسالت کا بچہ بچہ اس صفت کا حامل ہے۔ آپ نے ارزق شامی کا نام تو سُنا ہے۔ وہ اپنی شہ زوری، شہ سواری اور جنگجویانہ مہارت میں کسی طرح مرحب سے کم نہ تھا۔ حضرت قاسم ابن حسنؑ جو ابھی سنِ بلوغ کو بھی نہ پہنچے تھے اپنے چچا سے جنگ کی اجازت طلب کر رہے ہیں مگر آپ کی کم سنی امامِ مظلوم کے سامنے ہے۔ بھائی کی تصویر پیشِ نظر ہے کس طرح رُخصت دیدی جائے۔؟ ادھر جنابِ زینبؑ کے صاحبزادوں کی شہادت کی خبر سے غم انگیز خاموشی طاری ہے جناب قاسمؑ کی والدہ بی بی اُمِّ فروہ کا عجب حال ہے۔ سر جھکائے بیٹھی ہیں اور آنسو جاری ہیں۔ دِل ہی دل میں کہہ رہی ہیں کہ زینبؑ نے اپنے دونوں فرزند اور زوجۂ مسلم نے اپنے نونہال امامؑ پر نثار کر دیئے لیکن میرے قاسمؑ نے اب تک اتنی تاخیر کیوں کی؟ اس بے تابی و بیقراری کی کیفیت ان اشعار میں ملتی ہے ؎

دل میں یہ سوچتی ہوئی اُٹھی وہ خوش خصال
قاسم کو اپنے پاس بُلایا بصد ملال
رو کر کہا کہ اے حسنِؑ مجتبیٰ کے لال
کچھ اس ضعیف ماں کی بھی عزت کا ہے خیال؟

جاری ہیں اشکِ خوں مری چشمِ پُر آب سے
زینبؑ کے آگے جا نہیں سکتی حجاب سے

گھر لُٹ گیا ہے فاطمہ زہرہ کا ہائے ہائے
دشمن وہ دوست ہے جو نہ اس وقت کام آئے
عونؑ نے تو حسینؑ کے قدموں پہ سر کٹائے
کیا قہر ہے کہ بھائی کا جایا نہ مرنے جائے

الغرض اس جنگ میں ۹۳ یہودی مارے گئے جن میں حارث، مرحب، اسیر، یاسر، انتر اور عامر سب کے سب آزمودہ کار جنگجو اور شہرت یافتہ تھے اور یہ ذوالفقار حیدری کا لقمۂ اجل بنے۔ ادھر ۱۵ مسلمان شہید ہوئے۔ حضرت علیؑ نے تمام اہل قلعہ کو داخلِ دائرۂ اسلام کیا اور مرحب کی بہن حضرت صفیہ کو آپؑ نے نہایت عزت و احترام کے ساتھ جناب رسولِ خدا کی خدمت میں بھیجدیا جو بعد میں آنحضرتؐ کے نکاح میں آئیں۔ اس جنگ و فتح کے بعد جب آپ رسولؐ خدا کی خدمت میں واپس آئے تو آنحضرتؐ نے کافی آگے بڑھ کر آپ کا استقبال کیا، سینہ سے لگایا۔ چہرہ کی گرد اپنے دامن سے صاف کی اور دونوں آنکھوں کے درمیان بوسے لئے اور ارشاد فرمایا کہ یا علیؑ! اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ میری اُمت کے لوگ تمہارے حق میں وہی کچھ کہنے لگیں گے جو نصاریٰ عیسیٰ ابن مریم کے بارے میں کہنے لگے تو میں آج تمہاری کچھ فضیلتیں بیان کرتا جن کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جس طرف سے تم گزرتے تو لوگ تمہارے قدموں کے نیچے کی خاک اُٹھا کر اپنی آنکھوں میں بطور سرمہ لگاتے اور اپنی بیماریوں کا اُس سے علاج کرتے۔"

خیبر کی فتح کے بعد مفتوحہ زمین پر قبضہ کر لیا گیا لیکن یہود نے درخواست کی کہ زمین ہمارے قبضہ میں رہنے دی جائے اور ہم پیداوار کا نصف حصہ ادا کرتے رہیں گے جسے منظور کر لیا گیا۔ شبلی یہ بھی لکھتے ہیں کہ زمین تمام مجاہدین میں جو اس جنگ میں شریک تھے، تقسیم کر دی گئی۔ اسی میں آنحضرتؐ کا خمس بھی تھا اور اس کے علاوہ ایک حصہ رسولؐ خدا کے لئے مخصوص کر دیا گیا جسے "صفی" کہتے ہیں۔"

تو یہ تھے جنگ خیبر کے حالات و واقعات جو آپ نے سماعت فرمائے۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ وہ کون کون حضرات تھے جن کو مرحب کے مقابلے کیلئے مع فوج کے بھیجا گیا اور وہ اُس کی شکل ہی دیکھ کر پلٹ پلٹ آتے اور الزام لگایا

کر لشکر بھاگا تو ہم بھی بھاگے اور لشکر نے کہا کہ وہ حضرت بھاگ کھڑے ہوئے تو ہمارے وہاں ٹھہرے رہنے کا کیا جواز تھا۔ ایک طرف تو یہ منظر ہے اور دوسری طرف یہ عالم کہ جو "حین الباس" کی صفت کا حامل تھا وہی اُس مہیب دیو ہیکل جنگجو کا مقابل ہوا اور اُس کے ٹکڑے کر کے رکھ دیئے۔

آیئے اس صفت کا جائزہ کربلا کے میدان میں بھی لیں جہاں اس خاندانِ رسالت کا بچّہ بچّہ اس صفت کا حامل ہے۔ آپ نے ارزق شامی کا نام تو سُنا ہے۔ وہ اپنی شہ زوری، شہ سواری اور جنگجویانہ مہارت میں کسی طرح مرحب سے کم نہ تھا۔ حضرت قاسم ابن حسنؑ جو ابھی سنِ بلوغ کو بھی نہ پہنچے تھے اپنے چچا سے جنگ کی اجازت طلب کر رہے ہیں مگر آپ کی کم سنی امامِ مظلوم کے سامنے ہے۔ بھائی کی تصویر پیشِ نظر ہے کس طرح رخصت دیدی جائے۔؟ ادھر جنابِ زینبؑ کے صاحبزادوں کی شہادت کی خبر سے غم انگیز خاموشی طاری ہے جناب قاسم کی والدہ بی بی اُمّ فروہ کا عجیب حال ہے۔ سر جھکائے بیٹھی ہیں اور آنسو جاری ہیں۔ دل ہی دل میں کہہ رہی ہیں کہ زینبؑ نے اپنے دونوں فرزند اور زوجہ مسلم نے اپنے نونہال امامؑ پر نثار کر دیئے لیکن میرے قاسم نے اب تک اتنی تاخیر کیوں کی؟ اس بے تابی و بیقراری کی کیفیت ان اشعار میں ملتی ہے ؎

دل میں یہ سوچتی ہوئی اُٹھی وہ خوش خصال
قاسم کو اپنے پاس بُلایا بصد ملال
رو کر کہا کہ اے حسنؑ مجتبےٰ کے لال
کچھ اس ضعیف ماں کی بھی عزت کا ہے خیال؟

جاری ہیں اشکِ خوں مری چشمِ پُر آب سے
زینبؑ کے آگے جا نہیں سکتی حجاب سے

گھر لُٹ گیا ہے فاطمہ زہرہؑ کا ہائے ہائے
دشمن وہ دوست ہے جو نہ اس وقت کام آئے
غیروں نے تو حسینؑ کے قدموں پہ سر کٹائے
کیا قہر ہے کہ بھائی کا جایا نہ مرنے جائے

گھیرا ہے بے وطن کو عدو کی سپاہ نے
منہ دیکھنے کو کیا تمہیں پالا ہے شاہ نے
سب مر چکے امام دو عالم کے اقربا باقی ہے کون اکبرؑ و عباسؑ کے سوا
حضرت کے تن کی جان ہیں وہ دونوں مہ لقا سر اُن کے کٹ گئے تو قیامت ہوئی بپا
تم بھی خجل رہو گے سدا جد کے سامنے
شرمائیں گے حسنؑ بھی محمدؐ کے سامنے

جناب قاسمؑ نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ اے مادرِ گرامی اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے میں تو کئی بار چچا جان کی خدمت میں اجازت طلب کرنے کے لئے حاضر ہوا لیکن کیا کروں چچا جان کسی نہ کسی صورت سے مجھے ٹال دیتے ہیں اور واپس کر دیتے ہیں۔ آپ ہی اُن سے میری سفارش کر دیجیے۔ اس پر والدۂ قاسمؑ نے فرمایا کہ اب تم جاؤ اور یہ تعویذ جو تمہارے بازو پر بندھا ہے اسے کھول کر اپنے چچا جان کو دکھا۔ اس میں تمہارے والدِ محترم کی کچھ وصیت ہے۔ جناب قاسمؑ پھر امامِ مظلوم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایسا ہی کیا جیسا کہ اُن کی والدہ نے ارشاد فرمایا تھا۔ امام نے وصیت کو پڑھا تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ فرمایا، قاسمؑ تم میرے بھائی کی نشانی ہو۔ جب تمہیں دیکھتا ہوں تو میرے بھائی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ قلب کو سکون ہوتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح تم کو میدانِ قتال میں بھیجدوں؟ جناب قاسمؑ نے کہا، اے چچا جان! قریب قریب سب عزا و اقارب شہادت کا شرف حاصل کر چکے اور راہیِ جنت ہوئے۔ اس غلام نے کیا قصور کیا ہے کہ مجھے اس سعادت سے محروم رکھا جائے؟ میری والدۂ گرامی مجھ سے ناراض ہیں۔ میں اُن کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤں۔ پیارے چچا جان! اب آپ اپنے بھتیجے کو نہ روکیے اور جانے دیجیے!!

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ درِ خیمہ سے ایک بی بی کے رونے کی آواز آئی۔ امامؑ

وہاں پہنچے اور فضہ سے پوچھا کہ یہ کون رو رہا ہے؟ عرض کی کہ شہزادے آپ کی بھابی رو رہی ہیں۔ امام مظلوم اندر داخل ہوئے اور دیکھا کہ امّ فروہ خیمہ کے ستون سے لپٹی ہوئی ہیں اور آنکھوں سے اشک رواں ہیں۔ آپ نے اس کا سبب دریافت کیا تو اس غمزدہ بی بی نے کہا، یا ابن رسول اللہ! کیا ایک بیوہ کا فرزند فدیۂ راہِ خدا بننے کا اہل نہیں؟ خدارا! آپ مجھے اپنی مادرِ گرامی کے سامنے شرمندگی سے بچائیے!! یہ تو ایک قاسمؑ ہے اگر میرے ہزار قاسمؑ بھی ہوتے تو آپکے قدموں پر نثار کرتی۔" یہ سن کر امامؑ مظلوم اپنا سر جھکائے خیمے سے باہر آئے اور دیر تک خاموش کھڑے رہے اپنے بھائی حسنؑ کی تحریر کو پھر کھول کر پڑھا۔ "قاسمؑ! جب تمہارے چچا نرغۂ اعدا میں گھر جائیں تو تم اُن پر جان نثار کرنے میں پس و پیش نہ کرنا۔" آپؑ نے ایک آہ سرد بھری اور حسرت سے کہا کہ اچھا بیٹا قاسمؑ تم بھی جاؤ! عجب وقت آگیا کہ گود کے پلے آنکھوں کے سامنے مرنے جا رہے ہیں۔ اسکے بعد آپؑ نے حضرت امام حسنؑ کے تبرکات منگوائے اور اپنے ہاتھوں سے یتیم بھتیجے کو اُن سے آراستہ کیا۔ عمامۂ حسنؑ قاسمؑ کے سر پر باندھا، زرہ پہنائی، کمر کو پٹکے سے کسا اور ایک تلوار جوان کے قد کے مطابق موزوں بھی حمائل کی۔ جب اچھی طرح سجا لیا تو ایک نظر بھر کر دیکھا۔ آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔ بھائی حسنؑ کی تصویر سامنے تھی۔ بھتیجے کو سینے سے لگا کر پیار کیا اور پوچھا بیٹے! موت کو کیسا پاتے ہو؟ قاسمؑ نے عرض کی چچا جان شہد سے میٹھا۔ آپؑ نے قاسمؑ کو گھوڑے پر سوار کیا اور نہایت غمناک لہجہ میں فرمایا "اللہ تم کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ خدا حافظ! بیٹا قاسمؑ ابد سدھارو!!" ایک روایت میں منقول ہے کہ سواری ابھی کچھ دور ہی آگے بڑھی تھی کہ امامؑ مظلوم کچھ سوچ کر گھوڑے کے پیچھے گئے۔ اور پکارا "بیٹا قاسمؑ! کچھ دیر کے لئے اور ٹھہر جاؤ کہ تمہارا چچا تم کو ایک بار اور چھاتی سے لگا کر پیار کر لے!" قاسمؑ گھوڑے سے اُترے

اور اپنے چچا جان سے لپٹ گئے اور کہا کہ میں تو آپ سے رخصت لے کر آیا تھا۔ آپ نے فرمایا "بیٹا کسی طرح دل نہیں مانتا کہ میں زندہ رہوں اور تم کو اپنی آنکھوں کے سامنے خاک و خون میں تڑپتا دیکھوں۔ آؤ! بیٹا آؤ! ایک مرتبہ اور اپنے بھائی حسنؑ کی طرف تم کو پیار کر لوں"۔ آپ نے قاسمؑ کو پھر چھاتی سے لگایا اور سر اور آنکھوں پر بوسے دیئے۔ پھر گھوڑے پر سوار کیا اور حسرت بھری نظروں سے دوبارہ رخصت کیا۔ عزادارو! کیا آپ حضرات اس دردناک اور دل فگار منظر کو کرب و بلا کے میدان میں اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں!

دیکھئے جناب قاسمؑ میدان کارزار میں پہنچے اور :-

"نعرہ کیا، دادا مرا سردارِ عرب ہے | ضرغامِ خدا، نامِ خدا جس کا لقب ہے
جس شہ کی ولادت کا مکاں خانۂ رب ہے | حجۂ ذاتِ خدا، اس کا نواسا کوئی کب ہے؟

سرسبز ہیں اس جنگ میں گو تشنہ دہن ہوں
میں، سبز قباپوش، گلستانِ حسنؑ ہوں

یہ سنتے ہی، کی بارشِ تیر اہلِ جفا نے | لی میاں سے شمشیرِ دو دم شیرِ وغا نے
حملہ کیا، چمکا کے فرس قلعہ کشا نے | جائے وہ کہاں؟ گھیر لیا قہرِ خدا نے

اس غول میں یارا تھا کسے جنگ و جدل کا
کادہ تھا وہ گھوڑے کا کہ حلقہ تھا اجل کا"

پھر آپ نے بلند آواز سے کہا کہ جو اپنی جان سے بیزار ہو وہ میرے سامنے آئے۔ میں شیر کردگار کا پوتا، امام حسنؑ کا فرزند ہوں!!۔ یہ سن کر ارزق شامی کا ایک لڑکا جو اپنے کو رستمِ زماں سمجھتا تھا بڑے طمطراق سے گھوڑا بھگاتا ہوا سامنے آیا اور ایک وار کیا۔ حضرت قاسمؑ نے وہ وار سپر پر روک کر شمشیرِ حیدری کا ایک ایسا ہاتھ مارا کہ وہ ضربت اس نابکار کا خود کاٹتی ہوئی، سر کو دو نیم کرتی

اُس کے سینہ تک اُتر آئی۔ بالکل مولا علیؑ کی جنگ کا نقشہ سامنے تھا۔ آپ نے اُس کا سر کاٹ کر پسر سعد کے لشکر کی طرف پھینک دیا۔ یہ حال دیکھ کر یکے بعد دیگرے ارزق کے تین بیٹے اسی طرح آگے آئے اور اسی طرح جہنم رسید ہوئے۔ اَب ارزق کو اِس رنج و غم کا یارا نہ رہا اور انتہائی غیض و غضب میں خود آگے بڑھا، اس طرح کہ اُسکے سر پہ فولادی خُود تھا، دوہری زرہ پہنے ہوئے تھا اور پُشت پر سپر اور نیزہ لگائے تھا۔ وہ ملعُون نخوت سے کہنے لگا اے حسنؑ کے بیٹے مجھے تیرے لڑکپن پہ ترس آتا ہے۔ یہ سننا تھا کہ جناب قاسمؑ نے کہا کہ او سگِ نجس! گھبراتا کیوں ہے میں تجھ کو بھی تیری خُود سری کا مزہ ابھی چکھاتا ہوں ؎

جرأت تو جوانوں کی ہے گو کم ہے سن و سال　　　ہم جان پہ کھیلے ہوئے ہیں جان کیا مال؟
جس طرح گھروندے کو مٹا دیتے ہیں اطفال　　　یوں قصرِ بدن کو ترے کردوں گا میں پامال

کس بحر کو یہ تیغِ دو دَم جھیل رہی ہے
ہشیار! اجل سر پہ ترے کھیل رہی ہے

غرض:۔

"وہ دیو بڑھا واں سے تو یہ جبّار ادھر سے　　　مرحب پہ چلے حیدرِ کرّار ادھر سے
اُڑ کر گیا رہوار یہ رہوار ادھر سے　　　چلنے لگی تلوار پہ تلوار ادھر سے

ہر ہاتھ میں بڑھنے لگیں، گھٹنے لگیں ڈھالیں
سینے جو سپر کر دیئے، سکٹنے لگیں ڈھالیں

جرّار نے تلوار کا اِک ہاتھ جو مارا　　　چہرہ پہ سپر رکھ کے، دبا وہ ستم آرا
دھار اُس کی نہ تھی، بجر فنا کا تھا وہ دھارا　　　ٹکڑے تھے سپر کے، سر و سینہ تھا دو پارا

کیا اَب بھی تلواریں! کیا ہاتھ میں کس تھا!
جوشن تھا، نہ زنجیر کمر تھی، نہ فرس تھا!"

المختصر، ایک ہی وار میں یہ لعین بھی واصلِ جہنم ہوا۔ اُدھر خیمہ گاہ سے اس بچے کی اس خیبری جنگ کو ایک مختصر سا ستم رسیدہ، تشنہ لب گروہ دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ اور محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں جوشِ مسرت سے حضرت علی اکبر پکارے:-

اب پست ہمتِ عمرِ خیرہ سر ہوئی | آؤ گلے ملیں کہ تمہاری ظفر ہوئی
تسلیم کر کے دور سے قاسم نے دی صدا | ادنیٰ غلام ہوں مری جرأت کا ذکر کیا؟
دنیا میں عمو جان کو قائم رکھے خدا | کام آ گئی دعائے جگر بندِ مرتضیٰ

سر سبز ہوا وہ چشمِ عنایت جدھر ہوئی
یہ سب مہم حضور کے صدقے میں سر ہوئی!

ایک بچے کے ہاتھوں یہ قتلِ عام دیکھا تو پسرِ سعد گھبرا گیا اور سردارانِ لشکر سے کہا کہ یہ بنی ہاشم کے شیر ہیں۔ ان سے تنہا مقابلہ کرنا موت کو دعوت دینا ہے۔ اب اس لڑکے کو چاروں طرف سے گھیر کر حملہ کر دو! چنانچہ ہر سمت سے دشمنانِ آلِ رسولؐ اس بچے پر ٹوٹ پڑے تیروں اور نیزوں کا چلنا شروع ہو گیا۔ ادھر جناب قاسمؑ کو جلال آ گیا اور وہ شیرِ غضبناک کی مثال اُن ملاعین پر ٹوٹ پڑے اور وہ جنگ کی کہ دشمن کے ہوش اڑ گئے۔ آپ نے بیالیس اہلِ نار کو تہِ تیغ کیا مگر آہ! یہ تین روز کا بھوکا پیاسا، جنگ کی سختی سے چور کب تک لڑتا رہتا۔ تمام بدن پر تیر و تبر شمشیر و سناں کے زخم ہی زخم تھے اور ان سے لہو بہہ رہا تھا۔

تیر آتے تھے سینہ پہ کلیجہ پہ جبیں پر
کٹ کٹ کے گرے پیچ عمامے کے زمیں پر

زخموں کا لگا خون رکابوں سے ٹپکنے | طاقت گئی لڑنے کی لگا ہاتھ بہکنے
پانی کے لئے تن میں لگی روح پھڑکنے | مڑ مڑ کے سوئے خیمہ لگے یاس سے تکنے

سینہ پہ سناں گرز لگا کاٹ سر پہ
تیور کے جھکے تھے کہ پڑی تیغ کمر پر

عمو کو صدا دی کہ چچا جان خبر لو　　ہوتا ہے غلام آپ پہ قربان خبر لو
دنیا میں کوئی دم کا ہے مہمان خبر لو　　تکلیف نہ دیتا مگر اس آن خبر لو

ذریت حیدرؑ کی یہ توقیر ہوئی ہے
پامال ہمیں کرنے کی تدبیر ہوئی ہے

یہ سنتا تھا کہ امام مظلوم آواز کی سمت تیزی سے روانہ ہوئے۔ دشمن آپکی راہ میں حائل ہوئے تو

جھپٹے جو شاہ فوج پہ چمکا کے ذوالفقار　　بجلی گری یزید کے لشکر پہ ایک بار
اس غیظ میں یہیں سے جو آئے سوئے یار　　بھاگے پھرا کے گھوڑوں کی باگوں کو سب سوار

بھاگڑ میں خوں سے رن کی زمیں لال ہوگئی
دولہا کی لاش گھوڑوں سے پامال ہوگئی

آپ نے اپنے پیارے بھتیجے کو اٹھانے کی کوشش کی مگر گھوڑوں کی ٹاپوں سے جسم کی تمام ہڈیاں چور چور ہو چکی تھیں۔ حسرت سے ادھر ادھر دیکھا' اپنا عمامہ اتار کر زمین پر بچھایا' حضرت قاسمؑ کی لاش کو سمیٹ کر اس پر لٹایا اور بولے۔ بیٹا قاسمؑ! تم نے تو بڑا داغ دیا' میرے بھائی کا گھر ہی اجڑ گیا۔ بیٹا! کچھ تو بولو۔ تمہاری ماں کس طرح تم کو اس حال میں دیکھ سکے گی۔

یہ کہتے تھے جو موت کی ہچکی لبے آئی　　منھ کھول کے حضرت کو زباں خشک دکھائی
مخدومۂ عالم نے یہ آ۔ زسنائی　　میں ساغر کوثر ہوں ترے واسطے لائی

پی لے اسے اے لال کہ تر خشک گلا ہو
دادی ترے سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ فدا ہو

لب بند کئے قائم ناشاد نے اک بار
یعنی نہ جیوں گا کہ ہیں پیاسے شہ ابرار
دنیا سے سفر کر گیا وہ آئینہ رخسار
لاش اسکی چلے لے کے شہ بیکس و ناچار
تاریک جہاں آنکھوں میں تھا شاہ ہدیٰ کی
مرنے نے بھتیجے کے کمر توڑی چچا کی

ڈیوڑھی پہ لاش لائے جو سلطان بحر و بر
پردہ اٹھایا ڈیوڑھی کا فضہ نے دوڑ کر
لاشے کے پاؤں تھامے تھا کوئی، کوئی کمر
چادر کمر کی پکڑے تھے عباسؑ نامور
ٹکی تھیں دونوں خاک میں زلفیں اٹی ہوئیں
رخ پر پڑی تھیں سہرے کی لڑیاں کٹی ہوئیں

بارہویں مجلس

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیمۃ الحمد للہ ربّ العٰلمین والصّلوٰۃ والسّلام علےٰ سیّد المرسلین وخاتم النبیین وشفیع المذنبین ابی القاسم محمّد وآلہٖ الطیّبین الطّاھرین المعصومین من یومنا ھٰذا الی یوم الدّین وامابعد فقد قال اللہ سبحانہ وتعالیٰ فی کتابہ المجید وفرقانہ الحمید وقولہ الحق ٥ بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ٥ یاایہا الّذین اٰمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصّادقین ٥

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

ہم نے گزشتہ مجالس میں سورۂ بقر کی آیت "لیس البرّان تولوا وجوھکم" کی طرف اس لئے رجوع کیا تھا کہ اس آیت میں صدق اور تقویٰ دونوں صفات یکجا ملتی ہیں اور صادقین کی نشاندہی کے لئے اس آیت میں ان کی صفات کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ ان صفات میں سے ایک صفت "والصّابرین فی البأسآء والضرّاء" کی بھی ہے یعنی وہ صادقین ایسے ہیں جو جنگ کی سختی میں صبر سے کام لیتے ہیں۔ اور صبر کی تعریف پہلے کی جا چکی ہے کہ انتہائی نامساعد حالات میں پامردی اور استقلال کا ثبوت دینا صبر ہے اور جو ایسا کر سکے وہی صابر ہے۔ صبر کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ ایسے حالات میں جب غلبہ حاصل ہو چکا ہو اور مقابل مغلوب اور بے دست وپا ہو تو اعتدال کا دامن ہاتھ میں

رہے۔ عفو و درگزر اور صلۂ رحمی کا مظاہرہ کیا جائے نہ یہ کہ مرتے کو مارا جائے اور پھر بھی سیف اللہ کہلایا جائے یہ اللہ کی سیف نہیں اُس کی توہین ہے۔ چنانچہ اس مجلس میں فتح مکّہ کے واقعات کی تفصیل آپکے سامنے پیش کرکے صادقین کی اِس صفت صبر پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ فیصلہ آپ خود فرمائیں۔ تفصیل سے قبل نکات کا اعادہ ضروری ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) حقیقت کے مطابق اظہار کرنا بشرطیکہ احقاق حق کے لیئے ہو، صدق ہے۔ بدنیتی سے ہو تو جھوٹ ہے۔

(۲) خلافِ حقیقت بیان جبکہ ہدایت خلق کے لئے ضروری ہو جھوٹ نہیں بلکہ مکر و تقیہ ہے۔

(۳) ہادیانِ دین کا ہر حرکت و سکون نفسِ انسان پر گہرے نقوش بٹھانے کیلیے مظاہرہ ہوتا ہے جو حقیقت نہیں ہوتا۔

(۴) لا الہ الا اللہ کہنے والوں کو قرآن میں " یا ایہا الذین امنوا اے ایمان والو ہی کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے۔ لیکن اکثر کی کیفیات جو بیان کی گئی ہیں وہ قابلِ مذمت ہیں۔

(۵) قرآن یہودیوں کے ایسے گروہ کی نشاندہی کرتا ہے جو تخریب اسلام کے لئے مسلمان ہوا۔ اور اُس نے بے شمار خلافِ عقل و فطرت باتیں مسلمان علماء تک پہنچائیں جو حماقت پر مبنی ہونے کے باوجود اب بھی علمِ دین میں شامل ہیں اور اکثر علماء ان پر ایمان رکھتے ہیں۔

(۶) قرآن کی رُو سے ایمان حقیقی کی پہچان حُبّ شدید ہے اور حبّ شدید کی علامت " وجلت قلوبہم " ہے یعنی نام سنتے ہی دل لرز جائے۔

(۷) قرآن میں ایسے مومنین کا ذکر ہے جو رسولؐ کے ساتھ ایمان میں شریک ہیں۔

حضرت ابو طالبؑ ان میں شامل ہیں اور اُن کے ایمان کی قسم قرآن نے اس طرح کھائی ہے" لا اقسم بھٰذا لبلد ۝ وانت حلّ بھٰذا البلد و والد وما ولد" (ترجمہ: قسم ہے اس شہر کی اور تم اُس میں رہتے ہو۔ اور ایک باپ اور بیٹے)

(۸) تمام مذاہب میں صرف اسلامی نماز ہی ایسی ہے جو تقسیم توجّہ کے ساتھ ذکرِالٰہی کی تعلیم دیتی ہے۔ اور ہماری اس نماز نے "ہتھ کار وَل مَن یار وَل" کا عجیب نسخۂ کیمیا فراہم کیا ہے۔

(۹) یہ سوال کہ رسولؐ کی بعثت کا مقصد تزکیۂ نفس ہے نہ کہ سلطنت اور تنظیمِ عسکری کا قیام۔ تو غور و فکر کرنے والوں کے نزدیک تو ایسے وسوسے کی کوئی اہمیّت نہیں۔ وہ تو سمجھ سکتے ہیں کہ حصولِ مقصد کے لئے جو ذرائع اختیار کئے جائیں وہ تکمیلِ مقصد کا ایک جزو ہوتے ہیں۔ اس میں بہت سے راز پوشیدہ ہیں۔ محبوبِ خدا رحمت اللعالمین ہیں۔ اور اُن کو تو تمام عالم کی اقوام کی ہدایت کرنا ہے۔ لہٰذا تنظیمِ عسکری قائم کرکے دُنیا کو یہ سبق بھی دینا تھا کہ کسی قوم کی زندگی اور بقا کا انحصار تنظیمِ عسکری پر ہے۔ جو قوم منظّم ہو جائے گی وہ دوسروں پر غالب آ جائے گی۔

(۱۰) قانونِ فطرت کے مطابق جب کوئی قوم تعیش میں پڑ کر آزادی کی اہلیت کھو دیتی ہے تو اُس پر ایسی قوم کو مسلّط کر دیا جاتا ہے جو سخت جان اور جفاکش ہو۔ اور اس طرح بد کردار اقوام کو خلافِ فطرت اعمال کی سزا دینے کے لئے تنظیمِ عسکری کی ضرورت ہے۔

(۱۱) قانونِ فطرت ہے کہ جب موت سامنے رہے حتیٰ کہ خوف کی جگہ شوق لے لے تو قوتِ ادراک میں ترقی ہوتی ہے اور عالمِ غیب یا عالمِ نور کا مشاہدہ ہو جاتا ہے اور اس طرح کچھ تزکیۂ نفس حاصل ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی اشخاص کو شہید کہا جاتا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ شوقِ شہادت میں نکلنے والوں کے لئے تنظیمِ عسکری تزکیہ

کے حصول کا ذریعہ ہے۔

(۱۲) اصل اور عظیم تر مقصد یہ تھا کہ احباب کے قلوب کو تڑپانے کے لئے ذبح عظیم پیش کرنا تھی جو کسی محدود علاقہ میں ہوتی تو بے فائدہ ہوتی۔ اسلئے ضرورت تھی کہ اس پُر درد مظاہرہ کے لئے اسلامی سلطنت کا علاقہ وسیع تر ہو جہاں ہر گوشہ تک اس قربانی کا اثر پھیل سکے۔

(۱۳) رسولؐ اور آلِ رسولؐ کو اہلِ عالم کو اپنی محبت کی طرف بلانا تھا۔ وہ فاتح کی حیثیت سے ملک کی توسیع میں حصّہ نہیں لے سکتے تھے۔ اس لئے کہ مفتوح کو فاتح سے محبت نہیں بلکہ نفرت ہوتی ہے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ تنظیمِ عسکری قائم ہو اور اسکے سَربراہ اغیار ہوں۔

(۱۴) آلِ رسولؐ کی قربانی کا ذریعہ ایسے عساکر ہی ہو سکتے تھے جن کے سربراہ رسولؐ اور آلِ رسولؐ کے بدترین دشمن ہوں۔ اگر یہ سربراہ غیر مُسلم ہوتے۔ تو وہ اہلِ اسلام کو طعن تشنیع کا ہدف بناتے اور کہتے کہ دیکھو ہم نے تمہارے پیشوایانِ دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور تمہارا خدا اُن کی مدد بھی نہ کر سکا۔ پس ایسے عساکر کے سَربراہوں کا ظاہراً مسلمان ہونا ضروری تھا۔

(۱۵) اہلبیتؑ کو تو بحکم خدا یہ عظیم قربانی پیش کرنا ہی تھی اور اس کے لئے بنی ہاشم کے بدترین دشمن بنو اُمیّہ کے گروہ کو منتخب کیا گیا۔ اور اُن کی حکومت کے لئے ایک ہزار مہینے مقدر کر دیئے گئے۔

(۱۶) صبر کے معنی بے چارگی مجبوری اور کسمپرسی نہیں ہیں۔ بلکہ صبر کے معنی ہیں انتہائی نامساعد حالات میں پامردی اور استقلال کا ثبوت دینا۔ صابر وہ نہیں جس پر حالات نے غلبہ حاصل کر لیا ہو بلکہ وہ ہے جو حالات پر غالب آئے اور تاریخ کا رُخ موڑ دے۔

فتحِ مکّہ

...... انّا فتحنا لک فتحا مبینا ....

ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی نسل میں جن ذواتِ مقدسہ کو خداوند تعالیٰ نے چن لیا تھا انکا ایک اہم فریضہ یہ بھی تھا کہ توحید خالص کا احیا کیا جائے اور حرم کعبہ کی تطہیر کی جائے لیکن قریش کے پے در پے حملوں اور عرب کی مخالفت عام نے پورے اکیس برس تک اس فرض کو پایۂ تکمیل تک پہنچنے سے روکے رکھا۔ صلح حدیبیہ کی بدولت اتنا ہوا کہ چند روز کے لئے امن و امان قائم ہو گیا اور مسلمانوں کو ایک موقع ہاتھ آ گیا کہ وہ ایک نظر کعبہ کی زیارت کر سکیں لیکن یہ معاہدہ بھی قریش سے نبھ نہ سکا۔ حلم و عفو و تحمل کی انتہا ہو چکی تھی اور اب وقت آ گیا تھا کہ آفتابِ حق پر سے پردوں کو چاک کر کے ہٹا دیا جائے۔ صلح حدیبیہ کی بنا پر قبائلِ عرب میں خزاعہ آنحضرتؐ کے حلیف ہو گئے تھے اور ان کے حریف بنو بکر نے قریش سے مخالفت کا معاہدہ کر لیا تھا ان دونوں حریفوں میں مدت سے لڑائیاں جاری تھیں۔ اسلام کے ظہور نے عرب کو ادھر متوجہ کیا تو وہ لڑائیاں رک گئیں اور عرب کا سارا زور اسلام کے مقابلے میں آ گیا۔

صلح حدیبیہ کی وجہ سے لوگوں نے ذرا اطمینان کا سانس لیا تو بنو بکر سمجھے کہ اب انتقام کا وقت آ گیا ہے اور وہ دفعتاً خزاعہ پر حملہ آور ہوئے اور رؤسائے قریش نے اعلانیہ ان کو مدد دی۔ عکرمہ بن ابی جہل، صفوان بن امیہ، سہیل بن عمرو وغیرہ نے بھیس بدل بدل کر بنو بکر پر تلواریں چلائیں۔ خزاعہ نے مجبور ہو کر حرم میں پناہ لی لیکن بنو بکر کے سردار نوفل کی ایما پر عین حدودِ حرم میں خزاعہ کو قتل کر دیا گیا۔ آنحضرتؐ مسجد میں تشریف فرما تھے کہ یکایک یہ صدا بلند ہوئی "اے خدا! میں محمدؐ کو وہ معاہدہ یاد دلاؤں گا جو ہمارے اور ان کے قدیم خاندان میں ہوا ہے اے پیغمبرِ خدا! ہماری اعانت کر اور خدا کے بندوں کو بلا، سب اعانت کے لئے حاضر ہوں گے۔" معلوم ہوا کہ خزاعہ کے چالیس ناقہ سوار جن کا پیشرو عمرو بن سالم ہے یہ فریاد لے کر آئے ہیں۔ آنحضرتؐ کو تمام واقعات سن کر نہایت افسوس ہوا اور آپؐ نے قریش

کے پاس تین شرائط کے ساتھ ایک قاصد بھیجا کہ ان میں سے وہ کوئی ایک منظور کرلیں۔
(۱) مقتولین کا خون بہا دیا جائے (۲) قریش بنو بکر کی حمایت سے الگ ہوجائیں۔
(۳) اعلان کردیا جائے کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ چکا ہے۔

قرطہ بن عمر نے قریش کی طرف سے کہا کہ صرف تیسری شرط منظور ہے۔ لیکن قاصد کے چلے جانے کے بعد قریش کو ندامت ہوئی تو انہوں نے ابوسفیان کو سفیر بنا کر بھیجا کہ وہ مدینہ جا کر معاہدۂ حدیبیہ کی تجدید کرالائیں۔ ابوسفیان نے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض مدعا کیا مگر کوئی جواب نہ پا کر حضرت ابوبکر و عمر کو بیچ میں ڈالنا چاہا لیکن اُن حضرات نے جب مدد نہ کی تو وہ مجبور ہو کر حضرت فاطمہؑ زہرا کے در پر پہنچا اور حضرت امام حسنؑ، جو اُس وقت ۵ سال کے تھے، کی طرف اشارہ کر کے درخواست کی کہ اگر یہ بچہ اتنا کہدے کہ میں نے دونوں فریقین میں بیچ بچاؤ کرادیا تو آج سے یہ عرب کا سردار پکارا جائے گا۔ جناب سیدہ نے فرمایا کہ بچوں کو ان معاملات میں کیا دخل ہے۔ یہاں سے ناکام ہو کر وہ حضرت علیؑ کے پاس آیا اور اُن کے مشورے سے مسجد نبوی میں اعلان کردیا کہ میں نے معاہدۂ حدیبیہ کی تجدید کردی۔ ابوسفیان نے واپسی پر یہ واقعہ مکہ میں لوگوں کو سنایا تو وہ بولے یہ نہ تو صلح ہوئی کہ ہم اطمینان سے بیٹھ جائیں اور نہ ہی جنگ کہ لڑائی کا سامان کیا جائے۔

اسی اثنا میں آنحضرتؐ نے مکہ کی تیاریاں شروع کردیں۔ اتحادی قبائل کے پاس قاصد بھیجے کہ تیار ہو کر آئیں۔ یہ بھی احتیاط کی گئی کہ اہل مکہ کو خبر نہ ہونے پائے۔

حاطب بن ابی بلتعہ ایک صحابی تھے، انھوں نے قریش کو خفیہ طور پر خط لکھ کر ایک قاصد کے ذریعہ ان تمام حالات سے آگاہ کرنا چاہا لیکن رسولؐ خدا کو اس کا علم ہوگیا اور آپ نے حضرت علیؑ، زبیر، مقداد اور ابو مرثد غنوی کو بھیجا

کہ وہ قاصد جس راہ پر ملے فوراً واپس لایا جائے۔ چنانچہ قاصد مع خط آنحضرتؐ کی خدمت میں لایا گیا تو حاطب کے افشائے راز پر تمام لوگوں کو حیرت ہوئی۔ حضرت عمر بیتاب ہو گئے اور آنحضرتؐ سے عرض کی کہ اگر حکم ہو تو حاطب کی گردن اُڑا دوں۔ ارشاد ہوا۔ "اے عُمر! تم کو کیا معلوم ہے کہ خُدا نے اہلِ بدر کو مخاطب کر کے کہہ دیا ہے کہ تم سے مواخذہ نہیں ہے!!"

شبلی لکھتے ہیں کہ حضرت حاطب نے آنحضرتؐ کی خدمت میں یہ عذر پیش کیا کہ چونکہ اُن کے اعزا و اقارب مکّہ میں ہیں اور وہاں اُن کا کوئی حامی نہیں اسلئے اس خبر کے ذریعے انھوں نے قریش پر احسان رکھنا چاہا تا کہ وہ اُن کو ضرر نہ پہنچائیں۔ آنحضرتؐ نے یہ عذر قبول فرمالیا۔ آنحضرتؐ نے اتحادی قبائل کو تیار ہو کر مدینے آنے کی دعوت دی۔ مکّہ پر چڑھائی کا راز افشا نہیں کیا۔ صرف اتنا اشارہ تھا کہ بنی ہوازن کی طرف جانا ہے۔

الغرض۔ ار مضان المبارک ۸ھ کو رسولِ خدا نہایت عظمت وشان سے مکّہ کی طرف بڑھے۔ دس ہزار ہتھیار بند فوج ہمرکاب تھی۔ راہ میں قبائل عرب آکر ملتے جاتے تھے۔ مرالظہران پہنچکر لشکر نے پڑاؤ کیا۔ یہ مقام مکّہ سے تقریباً ایک منزل ہے۔ فوج کو دُور تک پھیلا دیا گیا اور آنحضرتؐ کے حکم سے الگ الگ آگ روشن کی گئی۔ اس فوج کے آنے کی اطلاع قریش کے کانوں تک پہنچ چکی تھی اور انھوں نے تحقیق کے لیے حکیم بن حزام (حضرت خدیجہ کے بھتیجے) ابوسفیان اور بدیل بن ورقا کو بھیجا۔ خیمہ نبوی کی دربانی پر جو دستہ متعین تھا اُس نے ابوسفیان کو دیکھ لیا اور گرفتار کر کے دربارِ نبوت میں پیش کیا۔ شبلی کہتے ہیں کہ حضرت عمر جذبۂ انتقام کو ضبط نہ کر سکے، تیز قدمی سے آگے بڑھے اور بارگاہِ رسالتؐ میں آکر عرض کی کہ "کفر کے استیصال کا وقت آگیا ہے۔" لیکن حضرت عباس نے جان بخشی کی درخواست

کی. حضرت عمرؓ نے اپنی عرض پھر دہرائی. اس پر حضرت عباسؓ نے کہا "عمرؓ! اگر یہ شخص تمہارے قبیلہ کا آدمی ہوتا تو تم اس قدر سخت دلی نہ کرتے"، حضرت عمرؓ نے کہا "آپ یہ نہ فرمائیں. آپ جس دن اسلام لائے، مجھ کو جو مسرت ہوئی، خود میرا باپ خطاب اسلام لاتا تو مجھ کو اس قدر خوشی نہ ہوتی"۔

صحیح بخاری میں ہے کہ گرفتار ہونے کے ساتھ ابو سفیان نے اسلام قبول کر لیا لیکن طبری وغیرہ میں (بقول شبلی) اس اجمال کی تفصیل میں حسب ذیل مکالمہ لکھا ہے:۔

رسول اللہ — کیوں ابو سفیان کیا اب بھی تم کو یقین نہیں آیا کہ خدا کے سوا اور کوئی معبود نہیں؟

ابو سفیان — کوئی اور خدا ہوتا تو آج ہمارے کام آتا؟

رسول اللہ — کیا اس میں کچھ شک ہے کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں؟

ابو سفیان — اس میں تو ذرا شبہ ہے۔

اس کے بعد شبلی لکھتے ہیں "بہر حال ابو سفیان نے اسلام کا اظہار کیا اور اس وقت گو ان کا ایمان متزلزل تھا لیکن مورخین لکھتے ہیں کہ بالآخر وہ سچے مسلمان بن گئے۔ چنانچہ غزوہ طائف میں ان کی ایک آنکھ زخمی ہوئی اور یرموک میں وہ بھی جاتی رہی"۔

لشکر اسلام جب مکہ کی طرف بڑھا تو آنحضرتؐ نے حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ ابو سفیان کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر کھڑا کر دو کہ افواج الٰہی کا جلال آنکھوں سے دیکھیں. کچھ دیر کے بعد فوجیں موج در موج بڑھتی نظر آئیں. سب سے پہلے غفار کا پرچم نظر آیا. پھر جہینہ سعد بن ہدیم سلیم ہتھیاروں میں ڈوبے ہوئے نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے نکل گئے. ابو سفیان پر رعب طاری تھا. سب کے بعد انصار کا قبیلہ اس شان و شوکت سے آیا کہ آنکھیں خیرہ ہو گئیں. ابو سفیان نے متحیر ہو کر پوچھا کہ یہ کون لشکر ہے؟ حضرت عباسؓ نے نام بتایا. دفعتہً سردار

فوج حضرت سعد بن عبادہ ہاتھ میں علم لئے ہوئے برابر سے گزرے اور ابوسفیان کو دیکھ کر پکار اٹھے "آج گھمسان کا دن ہے۔ آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا۔"

سب سے آخر میں رسالتمآب کی سواری تھی۔ زبیر بن العوام اس کے علمبردار تھے۔ ابوسفیان کی نظر جمال مبارک پر پڑی تو پکار اٹھے۔ حضور نے سنا؟ عبادہ کیا کہتے ہوئے گئے ہیں؟" ارشاد ہوا" عبادہ نے غلط کہا۔ آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے۔" یہ کہہ کر حکم دیا کہ فوج کا علم عبادہ سے لے کر ان کے بیٹے کو دیدیا جائے۔

مکہ پہنچکر آپ نے ارشاد فرمایا کہ علم نبوی مقام حجون پر نصب کیا جائے۔ خالد بن ولید (جو بقول شبلی فتح مکہ سے قبل اسلام لا چکے تھے) کو حکم ہوا کہ فوجوں کے ساتھ بالائی حصہ کی طرف آئیں۔ اور اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا یا ابوسفیان کے یہاں پناہ لے گا، یا خانہ کعبہ میں داخل ہو جائے گا اس کو امن ہے۔

تاہم قریش کے ایک گروہ نے مقابلہ کا قصد کیا اور خالد کی فوج پر تیر برسائے نتیجہ میں کرز بن جابر فہری، حبیش بن اشعر اور سلمہ بن المیلاد نے شہادت پائی۔ بقول شبلی خالد نے مجبور ہو کر حملہ کر دیا اور یہ لوگ ۱۳ لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

آنحضرت نے تلواروں کا چمکنا دیکھا تو خالد سے بازپرس کی لیکن جب معلوم ہوا کہ ابتدا مخالفین نے کی تھی تو آپ نے فرمایا کہ "قضائے الٰہی یہ ہی تھی"۔ دیگر متواتر احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت نے جب خلاف حکم خالد کی طرف سے اس حملہ اور کشت و خون کی خبر سنی تو آپ نے خالد سے بازپرس ہی نہیں کی بلکہ سخت رنجیدہ ہوئے اور بارگاہِ الٰہی میں خالد کے اس عمل سے پناہ مانگی۔

کعبہ میں بت شکنی کا ذکر کرتے ہوئے شبلی سرسری طور پر گزر گئے ہیں اور صرف اسی قدر فرماتے ہیں کہ خدا کی شان، حرم محترم، جو خلیل بت شکن کی یادگار تھا اس کی آغوش میں ۳۶۰ بت جاگزیں تھے۔ آنحضرت ایک ایک کو لکڑی کی

نوک سے ٹھوکر دیتے جاتے تھے اور یہ پڑھتے جاتے تھے "حق آگیا اور باطل مٹ گیا اور باطل مٹنے ہی کی چیز ہے"۔ عین کعبہ کے اندر بہت سے بُت تھے جنکو قریش خدا مانتے تھے۔ آنحضرتؐ نے اندر داخل ہونے سے پہلے حکم دیا کہ سب نکلوا دیے جائیں۔ حضرت عمرؓ نے اندر جاکر جس قدر تصویریں تھیں وہ مٹا دیں۔ حرم آلائشوں سے پاک ہو چکا تو آپ بلال اور طلحہ کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور نماز ادا کی۔ ایک دوسرے مقام پر بھی بتوں کے صرف نام گنوائے ہیں اور یہ کہ آنحضرتؐ کے حکم سے اُن کو برباد کر دیا گیا۔ حالانکہ دیگر متواتر روایت سے بالخصوص ابوہریرہؓ کے حوالہ سے یہ بیان ملتا ہے۔ ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے جابر ابن عبداللہ انصاری نے ذکر کیا کہ ہم جناب رسولؐ خدا کے ساتھ شہر مکہ اور حرم کعبہ میں پہنچے تو کعبۃ اللہ کے گرداگرد تین سو ساٹھ بُت موجود تھے۔ آنحضرت نے علیؑ مرتضیٰ کو اُن کے توڑنے کا حکم دیا اور بیت اللہ کے اُوپر ایک بڑے اونچے قد کا بُت تھا جس کا نام ہُبل تھا۔ پس آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اے علیؑ میری پشت پر سوار ہو جاؤ تاکہ ہُبل کعبۃ اللہ کے اُوپر سے گرا دیا جائے۔ علیؑ مرتضیٰ نے عرض کی کہ یا رسولؐ اللہ! یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ حضور میری پُشت پر سوار ہو جائیں۔ پس جیسے ہی آنحضرتؐ نے علیؑ مرتضیٰ کی پُشت پر قدم رکھے تو وہ حضرتؑ خود فرماتے ہیں کہ ثقلِ رسالت کے سبب میں آنحضرتؐ کو نہ اُٹھا سکا اور میں نے عرض کی یا رسولؐ اللہ میں آپ کی پُشت پر سوار ہو جاؤنگا۔ آنحضرتؐ نے تبسم فرمایا، اُترآئے اور اپنی پشت مبارک جھکا دی۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ میں آنحضرتؐ کے کاندھوں پر سوار ہو گیا اور اُسی ذات کی قسم جس نے دانہ کو شگافتہ کیا اور انسان کو پیدا کیا اگر میں یہ چاہتا کہ آسمان کو چھولوں تو اپنے دونوں ہاتھوں سے ایسا کر سکتا تھا۔ پس میں نے کعبہ کی چھت سے ہُبل کو پھینک دیا اور اِسی کے بارے میں خدائے تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی قل جاء الحق وزھق الباطل ۵ ان الباطل کان زھوقا ۵

علامہ ابن شہر آشوب فرماتے ہیں کہ روز "فتح مکہ" جب امیر المومنینؑ رسولِ خدا کے کاندھوں پر سوار ہوئے اور کعبہ کی چھت پکڑ کر اُس پر چڑھ گئے اور بتوں کو اس طرح اکھاڑا کہ بیت اللہ کی دیواریں ہل گئیں۔ پھر اُن بتوں کو اس زور سے زمین پر پھینکا کہ اُن کے پرخچے اُڑ گئے۔ یہ روایت احمد حنبل نے اور ابو لیلےٰ موصلی نے بھی اپنی مسند میں درج کی ہے اور ابو بکر خطیب نے اپنی تاریخ میں اخطیب خوارزمی نے اپنی کتاب "اربعین" میں محمد بن صباح زعفرانی نے اپنی کتاب الفضائل اور ابو عبداللہ طبری نے اپنی کتاب الخصائص میں درج کی ہے۔ ان کے علاوہ اور بیشمار مقامات پر ایسی ہی روایات ملتی ہیں۔

شبلی اپنی کتاب "سیرت النبیؐ حصہ اوّل" میں لکھتے ہیں کہ بت شکنی کے بعد آنحضرتؐ نے تمام اہلِ مکّہ کے سامنے ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا جس میں توحید اور معاشرت کے اسلامی احکام تعلیم فرمائے۔

نماز کا وقت آیا تو حضرت بلالؓ نے بامِ کعبہ پر چڑھ کر اذان دی۔ اذان کی آواز سُن کر وہی سرکش جو ابھی رام ہو چکے تھے اُن کی آتشِ غیرت پھر مشتعل ہوئی اور عتاب بن اسید نے کہا "خدا نے میرے باپ کی عزّت رکھ لی کہ اس آواز کے سننے سے پہلے اس کو دُنیا سے اٹھا لیا"۔ ایک اور سردارِ قریش نے کہا "اب جینا بے کار ہے"۔

نماز ادا کی گئی۔ پھر مقام صفا میں ایک بلند مقام پر بیٹھے۔ جو لوگ اسلام قبول کرنے آتے تھے۔ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے۔ مردوں کے بعد مستورات کی باری آئی۔ اور شبلی لکھتے ہیں کہ ان ہی میں ہندہ بھی آئی۔ یہ وہی ہندہ ہے جو رئیس العرب عتبہ کی بیٹی اور امیر معاویہ کی ماں تھی۔ حضرت حمزہؑ کو اسی نے قتل کرایا تھا اور اُن کا سینہ چاک کر کے کلیجہ چبا گئی تھی۔ وہ نقاب پہن کر آئی۔ شریف عورتیں

عموماً نقاب پہنتی تھیں لیکن اس وقت یہ غرض بھی تھی کہ کوئی اُسے پہچاننے نہ پائے بیعت کے وقت اسنے نہایت دلیری بلکہ گستاخی سے باتیں کیں جو حسب ذیل ہیں

رسولؐ اللہ :۔ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔

ہندہ :۔ یہ اقرار آپنے مردوں سے تو لیا نہیں! لیکن بہر حال ہم کو منظور ہے۔

رسولؐ اللہ۔ چوری نہ کرنا۔

ہندہ :۔ میں اپنے شوہر کے مال سے دو چار آنے کبھی لے لیا کرتی ہوں معلوم نہیں یہ بھی جائز ہے یا نہیں!!

رسولؐ اللہ :۔ اولاد کو قتل نہ کرنا۔

ہندہ :۔ ہم نے تو اپنے بچوں کو پالا تھا۔ بڑے ہوئے تو جنگ بدر میں آپ نے اُن کو مار ڈالا۔ اب آپ اور وہ باہم سمجھ لیں۔

فتح مکہ کے بعد آنحضرتؐ نے خالد بن ولید کے ساتھ کچھ لوگوں کو ادھر اُدھر اسلام کی طرف دعوت دینے کے لئے روانہ کیا۔ یہ سب قبیلہ بنو جزیمہ کے پاس پہنچے۔ خالد کے اور اس قبیلے کے درمیان دشمنی تھی۔ بنو جزیمہ نے اسلام کا اظہار کیا۔ خالد نے کہا کہ اگر تم مسلمان ہوتے ہو تو سب ہتھیار رکھدو۔ انھوں نے ہتھیار رکھدیئے۔ خالد نے انھیں قتل کیا۔ اور ان کا سب مال و اسباب لوٹ لیا۔ وہ لوگ فریاد لے کر رسول اللہ کے پاس آئے۔ آنحضرتؐ نے سُنا تو فرمایا اے خدا میں خالد کے افعال سے بری الذمہ ہوں۔ یہ سیف اللہ کا پہلا کارنامہ ہے۔ پھر جناب امیر المومنینؑ سے فرمایا کہ تم اس قوم کے پاس جاؤ ان کے واقعہ کی تحقیقات کرو اور جاہلیت کی باتوں کو اپنے پاؤں سے روند ڈالو۔ حضرت علیؑ وہاں پہنچے۔ ہر مقتول کا خونبہا دیا اور جو مال لوٹا گیا تھا اس کا تاوان اور معاوضہ بھی ادا کر دیا یہاں تک کہ اُس برتن کی قیمت بھی دے دی جس میں کتا پانی پیتا تھا۔ جب اُن کا کوئی مطالبہ باقی نہ رہا اور جناب امیرؑ کے پاس کچھ

مال بچ گیا تو فرمایا اب یہ بقیہ مال بھی تم لوگوں کو دئے دیتا ہوں تاکہ احتیاطاً ادا کاری بھی ہو جائے۔ یہ سب عادلانہ بلکہ رحیمانہ انتظام کر کے جناب امیرؑ آنحضرت کے پاس واپس تشریف لائے اور پورا حال بیان کیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا تم نے بالکل ٹھیک اور بہت خوب کیا۔

غرضیکہ امیر المومنینؑ نے اس موقع پر دشمنوں سے قتال کرنے کی نسبت زیادہ صبر کا مظاہرہ کیا اور اس واقعہ کے دوران کوئی بدعنوانی یا خونریزی نہ ہو سکی جبکہ حضرت سیف اللہ نے مسلمانوں کو دھوکے سے قتل کر کے بہت بڑی مثال قائم کی اور اہلِ عالم کو یہ کہنے کا موقع مہیا کر دیا کہ مسلمان سرداروں کے اخلاق یہ ہیں کہ وہ اپنے دینی بھائیوں کو بھی دھوکے سے قتل کر دیتے ہیں۔ اسکے لئے اہلِ دنیا کو یہ دکھلانا ضروری تھا کہ اسلام کا ایسی بداخلاقی سے کوئی تعلق نہیں بلکہ مسلم اپنے بدترین دشمن کو بھی دھوکے سے قتل نہیں کرتا خواہ اس کا نتیجہ اس کے لئے کیسا ہی تباہ کن کیوں نہ ہو۔ خاندانِ رسالت کے افراد نے مظاہرۂ الم برپا کر کے دنیا پر یہ واضح کر دیا چنانچہ دیکھیے حضرت مسلمؑ اگر ابن زیاد کو قتل کر دیتے تو معاملہ ختم ہو جاتا۔

تواریخ میں منقول ہے کہ جب مکہ میں امام حسینؑ کے پاس اہلِ کوفہ کے بیشمار خطوط جمع ہو گئے جن میں حضرت کی نصرت کے وعدے کئے گئے تھے اور ہدایت کے لئے بلایا گیا تھا تو حضرتؑ نے اپنے چچا زاد بھائی حضرت مسلمؑ کو اپنا سفیر بنا کر کوفہ بھیجا۔

وہاں پہنچنے پر تقریباً اٹھارہ ہزار کوفیوں نے حضرت مسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ جب یزید کو ان حالات کی اطلاع ہوئی تو اس نے گورنر کوفہ نعمان بن بشیر کو برطرف کر کے کوفہ کا انتظام بھی عبید اللہ ابن زیاد حاکم بصرہ کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ ابن زیاد شب کے وقت ہمراہیوں کے ساتھ کوفہ میں داخل ہوا۔ اہلِ کوفہ نے سمجھا کہ امام حسینؑ آ گئے۔ اور وہ السلام علیک یا ابن رسول اللہ کہہ کے پیشوائی کرتے رہے۔

یہاں تک کہ وہ دارالامارہ میں داخل ہوا اور عمائدین کوفہ کو ڈرانا اور دھمکانا شروع کیا۔
اُس وقت حضرت مسلم ہانی بن عروہ حجی کے ہاں مُقیم تھے۔ شریک بن عبداللہ اعور ہمدانی عمائدین بصرہ میں سے تھے۔ شریک بن عبداللہ کوفہ پہنچتے ہی بیمار ہوگئے اور وہ ہانی بن عروہ کے گھر مقیم ہوئے اور بیماری کے سبب ابن زیاد کے پاس نہ جا سکے۔ تو ابن زیاد نے شریک کی عیادت کے لئے آنے کو کہلا بھیجا۔ شریک نے حضرت مسلمؑ سے کہا کہ ابن زیاد میری عیادت کے لئے آئے گا تو میں جس وقت کھانسوں آپ اُس کو قتل کردیں پھر تمام کوفہ آپ کے زیر اثر ہوگا۔ ابن زیاد شریک کے پاس بہت دیر تک بیٹھا۔ اس درمیان میں شریک کئی دفعہ کھانسے مگر حضرت مسلمؑ نہ نکلے۔ جب ابن زیاد چلا گیا تو شریک نے حضرت مسلمؑ سے کہا کہ آپنے بہت سنہری موقع ہاتھ سے کھو دیا۔ پھر ایسا وقت نہیں آئیگا۔ حضرت مسلمؑ نے فرمایا کہ فرمانِ رسولؐ ہے کہ کسی کو دھوکے سے قتل کرنا اسلام میں جائز نہیں ہے۔ حضرت مسلمؑ نے اس وقت اسلام کے کردار کی عظمت کا اظہار دُنیا پر کردیا اور دُنیا یہ جانتی ہے کہ اس کردار کو مثالی رکھنے میں خاندان رسالت کو بے پناہ قربانیاں دینا پڑیں۔

دوسرے دن حضرت مسلمؑ جب اپنے ہمراہی کوفیوں کے جم غفیر میں موجود تھے ابن زیاد کے ایک ساتھی نے مکان کی چھت پر چڑھ کر حضرت مسلمؑ کے ساتھیوں کو ڈرایا کہ یزید کی فوج کوفہ میں داخل ہوا چاہتی ہے، اور اگر تم شام ہونے سے قبل اپنے گھروں کو نہ لوٹے تو وہ تم سب کو قتل کردینگے اور تمہارا گھر بار لوٹ لیا جائے گا۔ یہ سن کر کوفی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ گئے اور حضرت مسلمؑ کو تن تنہا چھوڑ کر اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ حضرت مسلمؑ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میدان خالی تھا۔ آپ اکیلے رہ گئے تھے۔ پھر آپ کوفے کی گلیوں میں سے ہوتے ہوتے ایک عورت طوعہ کے دروازے پر جا بیٹھے اُس نے کہا زمانہ مخدوش ہے تم کون ہو۔ حضرت نے پانی طلب کیا اور پھر فرمایا انا برید الحسینؑ۔

میں حسینؑ کا قاصد ہوں۔ تو اُس مومنہ نے کہا کہ میں قربان جاؤں مکان کے اندر آجاؤ۔ اُدھر ابن زیاد کے کارندے ہر طرف حضرت مسلمؑ کی تلاش میں مصروف تھے۔ صبح کو طوعہ کے بیٹے نے ہی ابن زیاد کو اطلاع کر دی تو اُس نے محمد ابن اشعث کو دو سو سوار دے کر حضرت مسلمؑ کی گرفتاری کے لیے روانہ کر دیا۔ جب حضرت مسلمؑ نے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سُنی تو سمجھ گئے کہ یہ میری تلاش میں آئے ہیں اور آپ ہتھیار لگا کر باہر نکل آئے۔ حضرت مسلمؑ نے ابن اشعث کے ساتھیوں کو عاجز کر دیا اور کوئی آپ کو گرفتار نہ کر سکا۔ اُس نے ابن زیاد سے اور کمک مانگی۔ ابن زیاد نے کہا کہ وائے ہو تجھ پر ایک شخص کو دو سو سواروں کی مدد سے گرفتار نہیں کر سکتا۔ ابن اشعث نے کہلا بھیجا "کیا تو نے کسی بنیے بقّال کے مقابل مجھے بھیجا ہے؟ یہ وہ شیر ہے جو ہزار سوار کے برابر ہے۔ غرضیکہ اور کمک پہنچ گئی۔ اور حضرت کو پتّھر برسا کر زخمی کرنا شروع کر دیا۔ جب کسی طرح قابو نہ چلا تو ایک شخص نے آپ کی پُشت پر نیزہ مارا جس سے حضرت زمین پر گر گئے۔ پس حضرت کو گرفتار کر کے ابن زیاد کے پاس لے گئے۔ بالآخر اُس ملعون نے حکم دیا کہ حضرت مسلمؑ کو کوٹھے پر لے جا کر قتل کرو اور لاش کو نیچے پھینک دو۔ ملعون قاتل حضرت کو لے کر اوپر چڑھا اور حضرت کا سرِ مبارک قلم کر کے لاش مطہر کوٹھے سے نیچے پھینک دی۔

عزادارو! مولا کو ابھی تک اپنے سفیر کے قتل کی بظاہر خبر نہیں ملی ہے۔ مدہ کوفہ کی طرف سفر میں مصروف ہیں۔ منزل ثعلبیہ پر پہنچے تو ایک تیز رفتار سوار نمودار ہوا۔ مولا نے اُس سے حضرت مسلمؑ کا حال دریافت کیا تو اُس نے تمام حالات بیان کئے اور استدعا کی کہ آپ کوفہ تشریف نہ لے جائیں اور وطن واپس ہو جائیں۔ یہ خبر سُن کر حضرتؑ آبدیدہ ہوئے۔ جناب زینبؑ خاتون نے جب بھائی کی یہ کیفیت ملاحظہ فرمائی تو خیمہ میں بُلا بھیجا جس وقت مولاؑ آئے کائنات خیمہ میں تشریف لائے تو رقیہؑ دختر

حضرت مسلمؑ کو اپنے پاس بُلایا۔ جونہی نگاہ امام علیہ السّلام چہرۂ رقیہؑ پر پڑی بے اختیار آنکھوں میں اشک بھر آئے۔ گود میں لے کر سینہ سے لگایا اور فرمایا کہ اے جانِ عم کیوں روتی ہو۔ ایک دن اپنے بابا سے ملوگی۔ بار بار سر پر شفقت ہاتھ پھیرتے تھے۔ یہ حال دیکھ کر وہ بچّی بولی عمو ئے نامدار معلوم ہوتا ہے کہ میرے پدر بزرگوار شہید ہوگئے کیونکہ اس وقت حضورؑ کی میرے حال پر شفقت مثل یتیموں کے معلوم ہوتی ہے۔ یہ سُن کر آپ کے آنسو نکل آئے۔

عزادارو! نالہ و فریاد بلند کرو۔ تمہارے مولاؑ کا سفیر بظلم و جور قتل کر دیا گیا۔ ہر عزادار پر لازم ہے کہ امامؑ مظلوم کو اُن کے عمِ زاد مظلوم سفیر کا پُرسا دیں۔ یا بنِ رسول اللہ! آپ کے سفیر کی تنہائی کے ہم صدقے ہو جائیں جب تمام بیعت کرنے والے اُس کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ ہماری جانیں اُس پر قربان جو کوفے کی گلیوں میں جائے پناہ کی تلاش میں پھر رہا تھا۔ ہم اُس کے دروازۂ طوعہ پر بیٹھ کر پانی طلب کرنے کے قربان۔ ایک ملعون نے جب اُس پر نیزہ مارا جس کے صدمے سے منہ کے بل گر پڑے۔ ہماری سینکڑوں جانیں اُس گرنے پر قربان۔ اے مولاؑ! فریاد ہے آپ کے سفیر کا قتل ظلم ہوگیا۔ ہزار جانیں ہماری اُس لاشۂ بے سر پر قربان ہو جائیں جس کو کوٹھے سے نیچے پھینکا گیا۔

مسلمؑ سا بھی مظلوم زمانے میں نہ ہوگا　　دشمن تو ہزاروں تھے، وہ بیکس تنِ تنہا
دم لیں کہیں، اتنا نہ روادار کوئی تھا　　کچھ امن کی صورت نظر آتی نہ تھی اصلا

اس پر بھی نہ کچھ رنج تھا اپنا نہ الم تھا
کوفے میں چلے آویں نہ شبّیرؑ، یہ غم تھا

جانے کی کہیں راہ نہ تھی بند تھے رستے — کوفی چلے آتے تھے کمر ظلم پہ کستے
گھیرے تھے سوارانِ ستمگار کے دستے — تھے نیچے یہ، اور کوٹھوں سے پتھر تھے برستے
جب وار نہ چل سکتا تھا اس شیرِ ژیاں پر
انگارے لعیں پھینکتے تھے سوختہ جاں پر

زخم ہوا اس شہ کے ہراول پہ یکایک — تلوار سے کٹ کر گرے لب ہائے مبارک
پہلو پہ لگیں برچھیاں اور چھاتی پہ ناوک — دنداں بھی شکستہ ہوئے پتھر چلے یاں تک
آلودہ تھی سب ریشِ مبارک جو لہو سے
چھاتی پہ ٹپکتا تھا لہو ہر بُنِ مُو سے

جب غش میں گرا خاک پہ وہ بے کس و ناچار — اعدا نے کیا مسلمؑ بے کس کو گرفتار
اس زخمی کے بازو میں رسن باندھ کے یکبار — کوٹھے پہ جدا کرنے کو سر لے گئے کفار
سو ٹکڑے محمدؐ کا ہوا دل بھی جگر بھی
مارا گیا مسلمؑ بھی ہوئے قتل پسر بھی

بیٹوں نے تو پایا بھی کفن آبِ رواں کا — اور باپ کو کیا کفن اور غسل کہاں کا
کوٹھے پہ تو سر کٹ گیا اس شیرِ ژیاں کا — اور جائے کفن خوں نے تنِ پاک کو ڈھانکا
نیزے پہ گیا شام کی جانب سرِ مسلمؑ
محتاج رہا گور کو بھی پیکرِ مسلمؑ

تیرھویں مجلس

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ہ الحمد للہ رب العٰلمین و الصلوٰۃ و السّلام علےٰ سیّد المرسلین وخاتم النبیین وَ شفیع المذنبین ابی القاسم محمّد وآلہ الطیبین الطاھرین المعصومین من یومنا ھٰذا الیٰ یوم الدّین ہ

امّا بعد فقد قال اللہ سبحانہ وتعالیٰ فی کتاب المجید وفرقانہ الحمید وقولہ الحق ہ

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ہ یا ایھا الّذین اٰمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصّادقین ہ

ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو۔ اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہوجاؤ۔

اس سے قبل کی مجالس میں صادقین کی وہ تمام صفات جن کا ذکر ہوچکا ہے اس مجلس میں وہ سب یکجا پیش کی جاتی ہیں۔ آیت سورۂ بقر کی ہے یعنی "لیس البرّان تولوا وجوھکم الخ" صادقین وہ ہیں جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان لاتے ہیں۔ اپنا مال رشتہ داروں۔ یتیموں۔ محتاجوں۔ مسافروں۔ سوال کرنے والوں اور غلاموں پر صرف کرتے ہیں۔ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کی پابندی کرتے ہیں اپنی نذریں پوری کرتے ہیں۔ اور فقر اور جنگ کی سختیوں میں صبر کرتے ہیں۔ یہی لوگ صادقین ہیں اور یہی لوگ متقین ہیں" چنانچہ ہم نے مختلف واقعات

کاذکر پہلے کیا اور آپ نے اُن ذوات کو روزِ روشن کی طرح دیکھا جو ان صفات سے متصف ہیں اور یہی وہ ہیں جن کے ساتھ ہو جانا حکم خدا کی متابعت اور ہماری نجات کا ذریعہ ہے۔

یہاں پر گزشتہ مجالس کے نکات ملاحظہ کرتے چلیں:۔

(۱) حقیقت کے مطابق اظہار کرنا بشرطیکہ احقاقِ حق کے لئے ہو صدق ہے۔ بدنیتی سے ہو تو جھوٹ ہے۔

(۲) خلافِ حقیقت بیان جبکہ ہدایتِ خلق کے لئے ضروری ہو تو جھوٹ نہیں بلکہ مکر و تقیہ ہے۔

(۳) ہادیانِ دین کا ہر حرکت و سکون نفس انسان پر گہرے نقوش بٹھانے کے لئے مظاہرہ ہوتا ہے جو حقیقت نہیں ہوتا۔

(۴) لا الٰہ الا اللہ کہنے والوں کو قرآن میں یا ایہا الذین آمنو! "یعنی اے ایمان والو ہی کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے لیکن اکثر کی کیفیات جو بیان کی گئی ہیں وہ قابلِ مذمت ہیں۔

(۵) قرآن یہودیوں کے ایسے گروہ کی نشاندہی کرتا ہے جو تخریبِ اسلام کے لئے مسلمان ہوا اور اُس نے بے شمار خلافِ عقل و فطرت باتیں مسلمان علماء تک پہنچائیں جو حماقت پر مبنی ہونے کے باوجود اب بھی علم دین میں شامل ہیں اور اکثر علماء ان پر ایمان رکھتے ہیں۔

(۶) قرآن کی رُو سے ایمانِ حقیقی کی پہچان حُبِّ شدید ہے اور حبّ شدید کی علامت "وجلت قلوبھم" ہے یعنی نام سُنتے ہی دِل لرز جائے۔

(۷) قرآن میں ایسے مومنین کا ذکر ہے جو رسُول کے ساتھ ایمان میں شریک ہیں۔ حضرت ابوطالبؑ ان میں شامل ہیں اور اُن کے ایمان کی قسم قرآن نے اس طرح

کھائی ہے "لا اقسم بھٰذا البلد ۝ وانت حلّ بھٰذا البلد ۝ ووالدٍ وما ولد ۝" (ترجمہ: قسم ہے اس شہر کی اور تم اس میں رہتے ہو۔ اور ایک باپ اور بیٹے)۔

(۸) تمام مذاہب میں صرف اسلامی نمازہی ایسی ہے جو تقسیم توجہ کے ساتھ ذکر الٰہی کی تعلیم دیتی ہے اور ہماری اس نماز نے "ہتھ کار وَل مَن یار وَل" کا عجیب نسخۂ کیمیا فراہم کیا ہے۔

(۹) یہ سوال کہ رسولؐ کی بعثت کا مقصد تزکیۂ نفس ہے نہ کہ سلطنت اور تنظیم عسکری کا قیام۔ تو غور و فکر کرنے والوں کے نزدیک تو ایسے وسوسے کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ تو سمجھ سکتے ہیں کہ حصولِ مقصد کے لیے جو ذرائع اختیار کئے جائیں وہ تکمیل مقصد کا ایک جزو ہوتے ہیں۔ اس میں بہت سے راز پوشیدہ ہیں۔ محبوبِ خدا رحمت اللعالمین ہیں۔ اور اُن کو تو تمام عالم کی اقوام کی ہدایت کرنا ہے۔ لہٰذا تنظیم عسکری قائم کرکے دُنیا کو یہ سبق بھی دینا تھا کہ کسی قوم کی زندگی اور بقا کا انحصار تنظیم عسکری پر ہے جو قوم منظم ہو جائے گی وہ دوسروں پر غالب آئے گی۔

(۱۰) قانونِ فطرت کے مطابق جب کوئی قوم تعیش میں پڑ کر آزادی کی اہمیت کھو دیتی ہے تو اُس پر ایسی قوم کو مسلط کر دیا جاتا ہے جو سخت جان اور جفاکش ہو اور اس طرح بدکردار اقوام کو خلافِ فطرت اعمال کی سزا دینے کے لئے تنظیم عسکری کی ضرورت ہے۔

(۱۱) قانونِ فطرت ہے کہ جب موت سامنے رہے حتیٰ کہ خوف کی جگہ شوق لے لے تو قوتِ ادراک میں ترقی ہوتی ہے اور عالمِ غیب یا عالمِ نور کا مشاہدہ ہو جاتا ہے اور اس طرح کچھ تزکیۂ نفس حاصل ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی اشخاص کو شہید کہا جاتا ہے، تو مطلب یہ ہوا کہ شوقِ شہادت میں نکلنے والوں کے لئے تنظیم عسکری تزکیے حصول کا ذریعہ ہے۔

(۱۲) اصل اور عظیم تر مقصد یہ تھا کہ احباب کے قلوب کو تڑپانے کے لئے ذبح عظیم پیش کرنا تھی جو کسی محدود علاقہ میں ہوتی تو بے فائدہ ہوتی۔ اسلئے ضرورت تھی کہ اس پُر درد مظاہرہ کے لئے اسلامی سلطنت کا علاقہ وسیع تر ہو جہاں ہر گوشہ تک اس قربانی کا اثر پھیل سکے۔

(۱۳) رسولؐ اور آلِ رسولؐ کو اہلِ عالم کو اپنی محبت کی طرف بلانا تھا لہٰذا وہ فاتح کی حیثیت سے ملک کی توسیع میں حصہ نہیں لے سکتے تھے اس لئے کہ مفتوح کو فاتح سے محبت نہیں بلکہ نفرت ہوتی ہے۔ پس ضروری تھا کہ تنظیم عسکری قائم ہو اور اس کے سربراہ اغیار ہوں۔

(۱۴) آلِ رسولؐ کی قربانی کا ذریعہ ایسے عساکر ہی ہو سکتے تھے جن کے سربراہ رسولؐ اور آلِ رسولؐ کے بدترین دشمن ہوں۔ اگر یہ سربراہ غیر مسلم ہوتے تو وہ اہلِ اسلام کو طعن و تشنیع کا ہدف بناتے اور کہتے کہ دیکھو ہم نے تمہارے پیشوانِ دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور تمہارا خدا ان کی مدد بھی نہ کر سکا۔ پس ایسے عساکر کے سربراہوں کا ظاہراً مسلمان ہونا ضروری تھا۔

(۱۵) اہلبیتؑ کو تو بحکم خدا یہ عظیم قربانی پیش کرنا ہی تھی اور اس کے لئے بنی ہاشم کے بدترین دشمن بنوامیّہ کے گروہ کو منتخب کیا گیا اور ان کی حکومت کے لئے ایک ہزار مہینے مقدر کر دیئے گئے۔

(۱۶) صبر کے معنیٰ بیچارگی، مجبوری اور کسمپرسی نہیں ہیں۔ بلکہ صبر کے معنیٰ ہیں انتہائی ناسازگار حالات میں پامردی اور استقلال کا ثبوت دینا۔ صابر وہ نہیں جس پر حالات نے غلبہ حاصل کر لیا ہو بلکہ وہ ہے جو حالات پر غالب آئے اور تاریخ کا رُخ موڑ دے۔ آیئے اب غزوۂ حنین ملاحظہ فرمایئے۔

حُنین، مکّہ اور طائف کے درمیان ایک وادی کا نام ہے۔ فتح مکّہ کے بعد قبائل

عرب نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا لیکن ہوازن اور ثقیف جو نہایت جنگجو اور سخت تھے ان پر اُلٹا اثر پڑا۔ اُن کے رؤسار کو اپنے اپنے امتیاز اور ریاست کی فکر پڑ گئی۔ لہٰذا آپس میں مشورہ کیا کہ مسلمان جو فتح مکّہ کے وقت سے وہاں جمع ہیں اُن پر ایک عام حملہ کر دیا جائے۔ اُن کے جوش کا یہ عالم تھا کہ ہر قبیلہ اپنے اہل و عیال کو لیکر چلا اسلئے کہ بچّے اور عورتیں ساتھ ہوں گی تو اُن کی حفاظت کی غرض سے لوگ جانیں دیدیں گے۔ اس معرکے میں کعب اور کلاب کے سوائے ہوازن و ثقیف کی تمام شاخیں شامل تھیں۔ فوج کی سرداری کے لئے مالک بن عوف مقرر کیا گیا۔ لیکن اسکی حیثیت ایک مشیر ہی کی سی رہی جیسا کہ شبلی نے لکھا ہے۔

درید بن الصمہ جو سو سال سے زیادہ بوڑھا اور فقط ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا مگر جس کی بہادری اور شاعری عرب کی تاریخ میں یادگار تھی۔ اور اس کی رائے اور تدبیر پر تمام ملک کو اعتماد تھا اس کو سردار فوج کی درخواست پر ایک چارپائی پر اٹھا کر میدان جنگ میں لایا گیا۔ اُسنے پوچھا یہ کونسا مقام ہے۔ لوگوں نے کہا اوطاس۔ بولا کہ "ہاں۔ یہ مقام جنگ کے لئے موزوں ہے۔ اسکی زمین نہ بہت سخت ہے نہ اس قدر نرم کہ پاؤں دھنس جائیں" پھر پوچھا کہ "یہ بچّوں کے رونے کی آوازیں کیسی آرہی ہیں؟" لوگوں نے کہا کہ بچّے اور عورتیں ساتھ آئی ہیں کہ کوئی شخص پاؤں پیچھے نہ ہٹائے۔ وہ بولا "کہ جب پاؤں اُکھڑ جاتے ہیں تو کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ میدان جنگ میں صرف تلوار کام دیتی ہے۔ بدقسمتی سے اگر شکست ہوئی تو درتوں کی وجہ سے اور بھی ذلت ہوگی۔" پھر پوچھا کہ کعب اور کلاب شریک ہیں کہ نہیں؟ اور جب یہ معلوم ہوا کہ اُن معزز قبیلوں کا ایک شخص بھی میدان جنگ میں نہیں تو کہا اگر آج کا دن عزت و شرف کا دن ہوتا تو کعب اور کلاب غیر حاضر نہ ہوتے۔" اسکی

رائے بھی کہ میدان سے ہٹ کر کسی محفوظ مقام میں فوجیں جمع کی جائیں اور وہیں اعلان جنگ کیا جائے لیکن مالک بن عوف نے جو تیس سالہ جوان سردار لشکر تھا، اس رائے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور جواباً کہا "آپ ضعیف ہو چکے ہیں اور آپ کی عقل بیکار ہو چکی ہے"

رسولؐ اللہ کو مکہ میں ان واقعات کی خبر پہنچی تو آپؐ نے تصدیق کے لیے عبداللہ بن حدرد کو بھیجا۔ وہ جاسوس بن کر حنین آئے اور کئی دن تک فوج میں رہ کر حالات تحقیق کیے۔ آنحضرتؐ نے مجبوراً مقابلہ کی تیاریاں کیں۔ رسد اور سامانِ جنگ کیلئے قرض کی ضرورت پیش آئی۔ عبداللہ ابن ربیعہ جو ابو جہل کے سوتیلے بھائی تھے اور نہایت دولت مند تھے اُن سے تیس ہزار درہم قرض لئے۔ صفوان بن اُمیہ جو مکہ کا رئیسِ اعظم تھا اور مہمان نوازی میں مشہور تھا لیکن اب تک اسلام نہیں لایا تھا اُس سے آنحضرتؐ نے اسلحہ جنگ مستعار مانگے۔ اُس نے سو زرہیں اور اُنکے لوازمات پیش کیے۔ اور اس طرح شوال ۸ھ میں اسلامی فوجیں حُنین پر چڑھیں جنکی تعداد تقریباً دس ہزار تھی اور دو ہزار جوانانِ اہلِ مکہ بھی ساتھ ہو لیے جن میں اکثر اسلام بھی نہیں لائے تھے۔ یہ کثرت اور شان و شوکت دیکھ کر بعض اصحاب کی زبان سے بے اختیار نکل گیا "کہ آج ہم پر کون غالب آسکتا ہے آج ہم بارہ ہزار ہیں۔"

ہوازن تیر اندازی میں تمام عرب میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اُن کا ایک تیر بھی خالی نہیں جاتا تھا انھوں نے معرکہ گاہ میں پہلے ہی سے پہنچکر مناسب مقامات پر قبضہ کر لیا اور تیر اندازوں کے دستے پہاڑ کی گھاٹیوں کھوؤں اور دروں میں بیٹھا دیے۔

فوجِ اسلام نے صبح کے وقت جب خوب اُجالا بھی نہیں ہوا تھا حملہ کیا۔ میدانِ جنگ نشیب میں تھا سامنے سے ہزاروں فوجیں ٹوٹ پڑیں اور اُدھر کمین گاہوں سے تیر اندازوں کے دستے نکل آئے۔ تیروں کا مینہ برسنا شروع ہو گیا۔ مسلمانوں کی فوج کا وہ حصہ جو خالد بن ولید کی افسری میں تھا (یہ اسلام لا چکے تھے) بوکھلا کر پیچھے ہٹا اور بھگدڑ مچگئی

یہاں تک کہ تمام فوج کے پاؤں اُکھڑ گئے۔

امیر عبدالرحمٰن خلیفۂ اندلس سے تاریخ ابوالفدا میں منقول ہے کہ جب مسلمانوں کا لشکر بھاگا تو ابوسُفیان بہت خوش ہوئے۔ اور کہنے لگے کہ "آج محمدؐ کا طلسم باطل ہوا۔ ابھی کیا ہے ابھی تو یہ بحیرۂ قلزم تک بھاگتے جائیں گے" اور پھر تیر کمان میں رکھ کر رسولؐ اللہ پر چلانا چاہا۔ اُس وقت ایک قریشی جو ابھی مسلمان بھی نہیں ہوا تھا قریب کھڑا تھا۔ اُس نے کمان پر ہاتھ مارا اور ابوسُفیان کو بہت سخت سست کہا کہ تیری غیرت اور حمیّتِ قومی بھی زائل ہو گئی ہے۔ اس وقت تو قریش اور ہوازن کے درمیان جنگ ہے، تو محمدؐ پر تیر چلاتا ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ "سب لوگ ٹل گئے اور آنحضرتؐ اکیلے رہ گئے"۔ شبلی لکھتے ہیں کہ "تیروں کا مینہ برس رہا تھا۔ بارہ ہزار فوجیں ہوا ہو گئی تھیں۔ ایک پیکرِ مقدس پابرجا تھا جو تنہا ایک فوج، ایک مُلک، ایک اقلیم، ایک عالم بلکہ مجموعۂ کائنات تھا" آنحضرتؐ نے داہنی جانب دیکھا اور پکارا "یا معشر الانصار" آواز کے ساتھ صدا آئی "ہم حاضر ہیں" پھر آپؐ نے بائیں جانب مڑ کر پکارا اور اب بھی وہی صدا آئی۔ آپ سواری سے اُتر پڑے اور جلالِ نبوّت کے لہجہ میں فرمایا۔ "میں پیغمبر ہوں۔ یہ جھوٹ نہیں ہے۔ میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں"۔ پھر شبلی ہی اپنی سیرت النبیؐ میں رقم طراز ہیں کہ حضرت عباسؓ نہایت بلند آواز تھے۔ آنحضرتؐ نے اُن کو حکم دیا کہ مہاجرین اور انصار کو آواز دو۔ (ظاہر ہے کہ چند مومنین ایسے ثابت قدم تھے کہ وہ رسولؐ اور خدا کو چھوڑ کر نہیں بھاگے تھے بلکہ جہاد کر رہے تھے) دیگر معتبر مورخین ان کے نام یہ بتلاتے ہیں جو بارہ ہزار میں سے رسولؐ کے ساتھ رہ گئے تھے۔ حضرت علیؑ جو رسولؐ کے آگے علَم لئے دشمن کو دفع کرنے میں مصروف تھے۔ عباس۔ ابوسُفیان بن حارث۔ نوفل۔ فضل عباس۔ ربیعہ بن حارث۔ جعفر بن ابوسفیان

بن حارث۔ اسامہ بن زید اور حضرت ایمن بن اُم ایمن۔

الغرض حضرت عباس نے بحکم رسولؐ اللہ ایک ٹیلہ پر چڑھ کر باآوازِ بلند لوگوں کو اس طرح پکارنا شروع کیا۔ "اے خدا کے بندو! اے اوبیعتِ رضوان کے کرنے والو! اے سورہ بقر کے اصحابو! کہاں بھاگے جاتے ہو۔ رسولؐ یہاں تنہا ہیں۔ پلٹو! جان نہ چراؤ! کچھ تو بیعت کا خیال کرو"! غرض یہ آواز سنتے ہی لوگوں نے پلٹنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ شکست خوردہ جنگ میں مسلمانوں کی طرف سے شدت اور طاقت پیدا ہوگئی۔ جن لوگوں کے گھوڑے کشمکش اور گھمسان کی لڑائی کی وجہ سے مڑ نہ سکتے تھے وہ گھوڑوں سے کود پڑے اور اپنی زرہیں پھینک دیں۔ دفعتاً لڑائی کا رنگ بدل گیا۔ کفار بھاگ نکلے اور جو رہ گئے تھے گرفتار کر لیے گئے۔ بنو مالک جو ثقیف کی ایک شاخ تھی جم کر لڑے۔ اُن کے ستر آدمی مارے گئے۔ اور جب اُن کا علمدار عثمان بن عبداللہ مارا گیا تو وہ بھی ثابت قدم نہ رہ سکے۔ کافروں کی یہ بھاگی ہوئی فوج کچھ اوطاس میں اور کچھ طائف میں جا کر پناہ گزیں ہوئی۔

مسلمانوں کی فوجِ کثیر کے پہلے ہی ہلّہ میں بھاگ جانے اور رسولؐ اللہ کو چند ساتھیوں کے ساتھ چھوڑ جانے پر شبلی لکھتے ہیں "رسولؐ اللہ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو رفقائے خاص میں سے کوئی بھی پہلو میں نہ تھا"۔

حضرت قتادہ نے حضرت عمر کو دیکھا۔ پوچھا کہ "مسلمانوں کا کیا حال ہے؟ وہ بولے کہ قضائے الٰہی یہی تھی"!

اسیرانِ جنگ کی تعداد ہزاروں سے زائد تھی اور اُن میں حضرت شیمار رسولؐ اللہ کی رضاعی بہن بھی تھیں جن کی تصدیق آنحضرتؐ نے کی اور اُن کو بہ عزت و احترام اُن کے خاندان میں پہنچا دیا گیا۔ غنیمت کا بے شمار ذخیرہ تھا۔ چھ ہزار اسیرانِ جنگ۔

چوبیس ہزار اونٹ۔ چالیس ہزار بکریاں اور چار ہزار اُوقیہ چاندی تھی۔ مال غنیمت کے پانچ حصے کیے گئے۔ چار حصے حسب قاعدہ اہل فوج کو تقسیم کیے گئے۔ خمس بیت المال۔ غربا اور مساکین کے لیے رکھا گیا۔

بقول شبلی "مکہ کے اکثر رؤسا، جنھوں نے حال ہی میں اسلام قبول کیا تھا ابھی تک ضعیف الاعتقاد تھے۔ اُنہی کو قرآن نے "مولفۃ القلوب" کہا ہے۔ انہیں نہایت فیاضانہ انعامات دیئے گئے۔ جن لوگوں پر انعامات کی بارش ہوئی عموماً اہل مکہ اور جدید الاسلام تھے۔ اس پر انصار کو رنج ہوا۔ بعضوں نے کہا۔ رسول اللہ نے قریش کو انعام دیا اور ہم کو محروم رکھا حالانکہ ہماری تلواروں سے اب تک قریش کے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔ بعض بولے کہ مشکلات میں ہماری یاد ہوتی ہے اور غنیمت اوروں کو ملتی ہے۔ آنحضرتؐ نے یہ چرچے سُنے تو انصار کو طلب فرمایا۔ ایک چرمی خیمہ نصب کیا گیا۔ جب آنحضرتؐ نے پوچھا کہ یہ کیا واقعہ ہے تو چونکہ انصار جھوٹ نہیں بولتے تھے انھوں نے کہا آپ نے جو سُنا وہ صحیح ہے۔ آپ نے ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرما کر کہا۔

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم پہلے گمراہ تھے۔ خدا نے میرے ذریعے تم کو ہدایت کی تم منتشر اور پراگندہ تھے خدا نے میرے ذریعے تم میں اتفاق پیدا کیا۔ تم مفلس تھے خدا نے میرے ذریعے تم کو دولت مند کیا۔" آپؐ فرماتے جاتے تھے اور ہر فقرہ پر انصار کہتے جاتے تھے کہ "خدا اور رسولؐ کا احسان سب سے بڑھ کر ہے۔" آپؐ نے فرمایا "نہیں! تم یہ جواب دو کہ اے محمدؐ تجھ کو جب لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے تیری تصدیق کی۔ تجھ کو جب لوگوں نے چھوڑ دیا تو ہم نے پناہ دی۔ تو مفلس آیا تھا ہم نے ہر طرح کی مدد کی۔ یہ کہہ کر آپ نے فرمایا "تم یہ جواب دیتے جاؤ اور میں یہ کہتا جاؤں گا کہ تم صحیح کہتے ہو۔ لیکن اے انصار کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر

جائیں اور تم محمدؐ کو لے کر اپنے گھر آؤ"۔ اس پر انصار بے اختیار چیخ چیخ کر رونے لگے یہاں تک آنسوؤں سے اُن کی داڑھیاں تر ہو گئیں۔ وہ بولے "ہم کو صرف محمدؐ درکار ہے"۔ پھر آنحضرتؐ نے اُن کو سمجھایا کہ مکّہ کے لوگ جدید الاسلام ہیں۔ مَیں نے جو کچھ اُن کو دیا ہے حق کی بناء پر نہیں بلکہ تالیفِ قلوب کیلئے دیا ہے۔

زہیر بن حرو، رئیس قبیلہ کی سرکردگی میں ایک معزز سفارت آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور درخواست کی کہ اسیرانِ جنگ رہا کر دیئے جائیں۔ آنحضرتؐ کی رضاعی والدہ حضرت حلیمہ اسی قبیلہ سے تھیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ خاندانِ عبدالمطلبؑ کا جس قدر حصّہ ہے وہ تمہارا ہے لیکن رہائی کی تدبیر یہ ہے کہ جب مجمع ہو تو سب کے سامنے یہ درخواست پیش کرو۔ چنانچہ نمازِ ظہر کے بعد یہ درخواست پیش کی گئی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا "مجھ کو صرف اپنے خاندان پر اختیار ہے لیکن میں تمام مسلمانوں سے آپ کے لئے سفارش کرتا ہوں"۔ مہاجرین اور انصار بول اٹھے "ہمارا حصّہ بھی حاضر ہے"۔ اس طرح چھ ہزار قیدی دفعتہً آزاد کر دیئے گئے۔

مندرجہ جنگ کے بیشتر اقتباسات مولوی شبلی کی "سیرت النبیؐ جلد اوّل" سے لئے گئے ہیں۔

حُنین کے متعلق جناب باری تعالیٰ نے خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے "اللہ نے تمہاری بہت سے موقعوں پر مدد کی اور خاص کر حُنین کے دن جب تمہاری کثرت نے تمہیں دھوکے یا غرور میں ڈالا تھا تو زمین باوجود فراخی کے تم پر تنگ ہو گئی۔ پھر پیٹھ پھیر کر بھاگے"۔

تمام تاریخ میں صرف ایک موقعہ ایسا ہے جہاں موت کی طرف دوڑنے والے نظر آتے ہیں۔ شہدائے کربلا میں نہایت کبیر السن عبداللہ ابن عروة غفاری بھی شامل تھے ان کے سن کے متعلق صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ حضور سرورِ کائنات ؐ نے ان کو نماز

جماعت سے یہ کہہ کر روک دیا تھا کہ آپ پر بسبب کبیر السنی نماز جماعت ساقط ہے۔ اُنکی حالت یہ تھی کہ خود حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ جب امام حسین علیہ السلام کی روانگی کے وقت رونے کی آوازیں سُنیں تو بے چین ہو گئے اور اپنی خدمت کرنے والے سے کہا کہ یہ کیا رونا ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ امام علیہ السلام مدینہ سے سفر کر رہے ہیں تو کہنے لگے "خدا کی قسم اس رونے میں وہی اثر ہے جو وفاتِ رسولؐ کے وقت تھا یا جنابِ سیدہ کی وفات کے وقت تھا یا اُس وقت تھا جب امیر المومنین علیہ السلام کی سُنائی آئی یا اُس وقت تھا جب امام حسن علیہ السلام شہید ہوئے۔ اب پنجتنؑ میں ایک دم صرف حسینؑ کا باقی ہے۔ اب مجھے زندہ رہنا کسی طرح گوارا نہیں۔ ہمارا اسباب بھی باندھو اور حضرت کے ساتھ لے چلو۔ چنانچہ انہی حالات اور کیفیات میں صعوبات سفر برداشت کرتے ہوئے واردِ کربلائے معلیٰ ہوئے۔ اور یوم عاشور اذنِ جہاد طلب کیا تو حضرتؑ نے آپ کی کبیر سنی کا عذر پیش کیا۔ آپ نے عرض کی مولا ! مجھے گھوڑے سے بندھوا دیجئے۔ اور اس ضعیف کو جو دُنیا کے کسی کام نہیں آسکتا حصول سعادتِ دائمی سے نہ روکئے۔ بغرضیکہ میدان میں تشریف لائے اور چار بے دینوں کو واصل جہنم کر کے داخلِ جنت ہوئے۔ اس جنگ میں شرکت کرنے والے مردوں کا تو کیا ذکر یہاں تو عورتوں نے بھی وہ جرأتیں دکھائی ہیں جسکی مثال نہیں ملتی۔ چنانچہ وہب ابنِ عبداللہ کلبی جن کی شادی کو سترہ روز گزرے تھے کربلا میں وارد ہوئے تو یہ سانحہ نظر آیا۔ ماں نے کہا کہ اب ہم سیدہ کے لال کو دشمنوں کے نرغے میں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ غرض یوم عاشور ماں نے یہ کہہ کر بیٹے کو رخصت کیا "کہ میں تجھ سے خوش نہ ہوں گی۔ جب تک سیدہ کے لالؑ پر قربان نہ ہو جائے"۔ چنانچہ وہبؓ نے یزیدیوں پر حملہ کیا اور بہت سے بے دینوں کو قتل کر کے ماں کے پاس آیا۔ اس وقت خود بھی کافی زخمی ہو چکا تھا اس نے پوچھا "ماں کیا تو مجھ سے خوش ہوئی؟"

اُس نے کہا" کہ میں تو تجھ سے راضی ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ تو میری بی بی سیدہ کے لال پر قربان نہ ہو جائے گا۔" وہب پھر معروفِ جنگ ہو گئے یہاں تک کہ زخمی ہو کر گھوڑے سے زمین پر گرے۔ یہ حال دیکھ کر آپ کی سترہ اٹھارہ روز کی دلہن بیتابانہ میدانِ قتال میں دوڑی آئی اور وہب کا سر گود میں لے کر بیٹھ گئی۔ چہرے سے خاک و خون پونچھتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی۔ ایک ملعون نے ایسا گرز مارا کہ وہیں شہید ہو گئی۔ ایک ملعون نے وہب کا سر کاٹ کر ماں کی طرف پھینکا۔ ماں نے دوڑ کر سر گود میں اُٹھا لیا۔ پیار کیا، بوسے لئے اور کہا کہ" ہاں اب میں تجھ سے راضی ہو گئی کہ تو میری بی بی کے فرزند پر قربان ہو گیا" پھر اُس سر کو قاتل کی طرف یہ کہہ کر پھینک دیا "کہ یہ تو صدقہ ہے اور صدقہ جب دے دیا جاتا ہے تو واپس نہیں لیا جاتا۔"

چودھویں مجلس

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیمہ الحمد للہ رب العٰلمین والصّلوٰۃ
والسّلام علےٰ سیّد المرسلین وخاتم النّبیین وشفیع المذنبین
ابی القاسم محمّد والہٖ الطّیّبین الطّاھرین المعصومین یومنا
ھٰذا الیٰ یوم الدّین ہ

امّا بعد فقد قال اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ فی کتابہ المجید
وفرقانہ الحمید وقولہ الحق ہ

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیمہ یا ایہا الّذین اٰمنوا اتقوا اللہ
وکونوا مع الصّادقین ہ

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو۔ اللہ سے ڈرو اور سچّوں کے
ساتھ ہو جاؤ۔

سامعین گرامی! ان مجالس میں آیۂ مذکورہ "یا ایہا الّذین اٰمنو اتّقوا اللہ
وکونوا مع الصّادقین" پر بحث کی گئی اور خداوند قدوس کی مقرّر کردہ صادقین کی
جملہ صفات کو ضبط تحریر میں لاکر اس سلسلے کا قیام اس لئے کیا گیا کہ قرآن حکیم کی
روشنی میں "صادقین" کا تعین ہو جائے اور ان کے ساتھ ہو جانے کا مسئلہ ابدالاباد
تک کے لئے طے ہو جائے جو خدا کی خوشنودی اور ہماری نجات کا ضامن ہو۔
چنانچہ ہم مختلف منازل طے کرتے ہوئے اب اس بحث کی چودھویں منزل پر ہیں اور
یہ سلسلے کی چودھویں اور آخری مجلس ہے۔ گزشتہ مجالس میں ہم نے سورۃ بقرکی اس
آیت "لیس البرّ ان تولوا وجوھکم ہ" پر سیر حاصل گفتگو کی اور اس آیت

میں صادقین کی جتنی صفات مندرج ہیں سب پر ایک ایک کر کے روشنی ڈالی اور صادقین کا تعین کرنے کی کوشش کی۔ صادقین کا یہ تعارف اُن کی صفات کے ذریعے تھا مگر اسلامی تاریخ میں ایک ایسا واقعہ بھی ہے جہاں صادقین نے اپنا تعارف کاذبین کے مقابلے میں کھلے میدان میں اور علی الاعلان کیا اور وہ کاذبین کے سامنے یہ کہتے ہوئے آئے کہ آؤ ہم مباہلہ کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت کی دُعا کریں۔ اس واقعہ مباہلہ کا ذکر تفصیل سے آگے آتا ہے۔ چونکہ یہ آخری مجلس ہے لہٰذا گزشتہ تمام مجالس کے جملہ نکات آپ کے سامنے ایک بار پھر پیش کئے جاتے ہیں تاکہ حافظے پر ان کے نقوش کو دوام حاصل ہو۔ نکات یہ ہیں:۔

(۱) حقیقت کے مطابق اظہار کرنا بشرطیکہ احقاق حق کیلئے ہو، صدق ہے۔ بدنیتی سے ہو تو جھوٹ ہے۔

(۲) خلافِ حقیقت بیان جبکہ ہدایتِ خلق کے لئے ضروری ہو جھوٹ نہیں بلکہ مکر و تقیہ ہے۔

(۳) ہادیانِ دین کا ہر حرکت و سکون نفسِ انسان پر گہرے نقوش بٹھانے کیلئے مظاہرہ ہوتا ہے۔ جو حقیقت نہیں ہوتا۔

(۴) لا الٰہ الا اللہ کہنے والوں کو قرآن میں "یا ایہا الذین آمنوا" یعنی اے ایمان والو ہی کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے لیکن اکثر کی کیفیات جو بیان کی گئی ہیں وہ قابلِ مذمت ہیں۔

(۵) قرآن یہودیوں کے ایسے گروہ کی نشاندہی کرتا ہے جو تخریبِ اسلام کیلئے مسلمان ہوا اور اس نے بے شمار خلافِ عقل و فطرت باتیں مسلمان علماء تک پہنچائیں جو حماقت پر مبنی ہونے کے باوجود اب بھی علم دین میں شامل ہیں اور اکثر علماء ان پر ایمان رکھتے ہیں۔

(۶) قرآن کی رُو سے ایمانِ حقیقی کی پہچان حُبِّ شدید ہے اور حُبِّ شدید کی علامت "وجلت قلوبھم" ہے۔ یعنی نام سُنتے ہی دِل لرز جائے۔

(۷) قرآن میں ایسے مومنین کا ذکر ہے جو رسُولؐ کے ساتھ ایمان میں شریک ہیں حضرت ابو طالبؑ ان میں شامل ہیں اور اُن کے ایمان کی قسم قرآن نے اس طرح کھائی ہے "لا اقسم بھٰذا البلد ۝ و انت حل بھٰذا البلد ۝ و والد و ما ولد ۝" (ترجمہ:۔ قسم ہے اس شہر کی اور تم اُس میں رہتے ہو اور ایک باپ اور بیٹے)

(۸) تمام مذاہب میں صرف اسلامی نماز ہی ایسی ہے جو تقسیم توجّہ کے ساتھ ذکرِ الٰہی کی تعلیم دیتی ہے اور ہماری اس نماز نے "دستِ بکار و دل بیار" کا عجیب نسخۂ کیمیا فراہم کیا ہے۔

(۹) یہ سوال کہ رسُولؐ کی بعثت کا مقصد تزکیۂ نفس ہے نہ کہ سلطنت اور تنظیمِ عسکری کا قیام، تو غور و فکر کرنے والوں کے نزدیک تو ایسے وسوسے کی کوئی اہمیّت نہیں۔ وہ تو سمجھ سکتے ہیں کہ حصُولِ مقصد کے لئے جو ذرائع اختیار کئے جائیں وہ تکمیلِ مقصد کا ایک جزو ہوتے ہیں۔ اس میں بہت سے راز پوشیدہ ہیں۔ محبُوبِ خدا رحمت اللعالمین ہیں اور اُن کو تمام عالم کی اقوام کی ہدایت کرنا ہے۔ لہٰذا تنظیم عسکری قائم کر کے دُنیا کو یہ سبق بھی دینا تھا کہ کسی قوم کی زندگی اور بقا کا انحصار تنظیمِ عسکری پر ہے۔ جو قوم منظّم ہو جائے گی وہ دوسروں پر غالب آئے گی۔

(۱۰) قانونِ فطرت کے مطابق جب کوئی قوم تعیّش میں پڑ کر آزادی کی اہلیت کھو دیتی ہے تو اُس پر ایسی قوم کو مُسلّط کر دیا جاتا ہے جو سخت جان اور جفاکش ہو۔ اور اسی طرح بد کردار اقوام کو خلافِ فطرت اعمال کی سزا دینے کے لئے تنظیمِ عسکری کی ضرورت ہے۔

(۱۱) قانونِ فطرت ہے کہ جب موت سامنے رہے حتّٰی کہ خوف کی جگہ شوق لے لے

تو قوتِ اِدراک میں ترقّی ہوتی ہے اور عالمِ غیب یا عالمِ نور کا مُشاہدہ ہو جاتا ہے اور اس طرح کچھ تزکیۂ نفس حاصل ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی اشخاص کو شہید کہا جاتا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ شوقِ شہادت میں نکلنے والوں کے لئے تنظیمِ عسکری تزکیۂ نفس کے حصول کا ذریعہ ہے۔

(۱۲) اصل اور عظیم تر مقصد یہ تھا کہ احباب کے قلوب کو تڑپانے کے لئے ذبحِ عظیم پیش کرنا تھی جو کسی محدود علاقہ میں ہوتی تو بے فائدہ ہوتی۔ اسلئے ضرورت تھی کہ اس پُر درد مظاہرہ کے لئے اِسلامی سلطنت کا علاقہ وسیع تر ہو جہاں ہر گوشہ تک اس قربانی کا اثر پھیل سکے۔

(۱۳) رسولؐ اور آلِ رسولؐ کو اہلِ عالَم کو اپنی محبت کی طرف بُلانا تھا لہٰذا وہ فاتح کی حیثیت سے مُلک کی توسیع میں حصّہ نہیں لے سکتے تھے۔ کیوں کہ مفتوح کو فاتح سے محبّت نہیں بلکہ نفرت ہوتی ہے۔ پس ضروری تھا کہ تنظیمِ عسکری قائم ہو اور اُس کے سَربراہ اغیار ہوں۔

(۱۴) آلِ رسولؐ کی قربانی کا ذریعہ ایسے عساکر ہی ہو سکتے تھے جن کے سَربراہ رسُولؐ اور آلِ رسُولؐ کے بَدترین دُشمن ہوں۔ اگر یہ سَربراہ غیر مُسلم ہوتے تو وہ اہلِ اسلام کو طعن و تشنیع کا ہدف بناتے اور کہتے کہ دیکھو ہم نے تمہارے پیشوانِ دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور تمہارا خدا اُن کی مدد نہ کر سکا۔ پس ایسے عساکر کے سَربراہوں کا ظاہراً مُسلمان ہونا ضروری تھا۔

(۱۵) اہلبیتؑ کو تو بحکمِ خدا یہ عظیم قربانی پیش کرنا ہی تھی۔ اس کے لئے بنی ہاشم کے بَدترین دُشمن بنو اُمیّہ کے گروہ کو منتخب کیا گیا اور اُن کی حکومت کے لئے ایک ہزار مہینے مقدّر کر دیئے گئے۔

(۱۶) صبر کے معنیٰ بیچارگی، مجبوری اور کسمپرسی نہیں ہیں۔ بلکہ صَبر کے معنیٰ ہیں

انتہائی نامساعد حالات میں پامردی اور استقلال کا ثبوت دینا۔ صابر وہ نہیں جس پر حالات نے غلبہ حاصل کر لیا ہو بلکہ وہ ہے جو حالات پر غالب آئے اور تاریخ کا رُخ موڑ دے۔

اب ہم صلح حدیبیہ کے بعد رسولِ اکرمؐ کی تبلیغ دین کے کاموں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

آنحضرتؐ کو جب حدیبیہ کی صلح سے کسی قدر اطمینان نصیب ہُوا تو وقت آیا کہ اسلام کا پیغام اُس وقت کی تمام دُنیا کے کانوں تک پہنچا دیا جائے۔ یہ آخر ۶ھ یا شروع ۷ھ کا ذکر ہے۔ آپؐ نے تمام صحابہؓ کو جمع کیا اور خطبہ دیا "یا ایہا الناس! خدا نے مجھکو تمام دُنیا کے لئے رحمت اور پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ دیکھو حوارینِ عیسیٰ کی طرح اختلاف نہ کرنا۔ جاؤ میری طرف سے پیغامِ حق ادا کرو۔" اس کے بعد آپؐ نے قیصرِ روم، شہنشاہِ عجم، عزیزِ مصر اور رؤسائے عرب کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط ارسال فرمائے۔

شام میں عرب کا جو خاندان قیصر کے زیرِ حکومت رہا کرتا تھا وہ غسّانی خاندان تھا اور اُس کا پایۂ تخت بُصریٰ تھا جو دمشق کے علاقہ میں ہے اور آجکل حُوران کہلاتا ہے۔ اُس زمانہ میں اس خاندان کا تخت نشین حارث غسّانی تھا۔ دحیہ کلبی نے آنحضرتؐ کا نامۂ مبارک یہیں بصریٰ میں حارث غسّانی کو لاکر دیا۔ اُس نے قیصر کے پاس بیت المقدس میں بھیجدیا۔ قیصر کو خط ملا تو اُس نے حکم دیا کہ عرب کا کوئی شخص مل سکے تو لاؤ۔ اتفاق یہ کہ ابوسُفیان تجّارِ عرب کے ساتھ غزہ میں مقیم تھا۔ قیصر کے آدمی اُس کو غزہ سے جاکر لائے۔

قیصر نے بڑے سامان کے ساتھ دربار منعقد کیا۔ خود تاجِ شاہی پہن کر تخت پر بیٹھا۔ تخت کے چاروں طرف بطارقہ قسیس اور رہبان کی صفیں قائم کیں۔

اہلِ عرب کی طرف مخاطب ہو کر کہا تم میں سے اس مدعیِ نبوت کا رشتہ دار کون ہے؟ ابوسفیان نے کہا "میں"۔ پھر حسبِ ذیل گفتگو ہوئی۔

قیصر: مدعیِ نبوت کا خاندان کیسا ہے؟

ابوسفیان:۔ شریف ہے۔

قیصر:۔ اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا؟

ابوسفیان:۔ نہیں۔

قیصر:۔ اس خاندان میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟

ابوسفیان:۔ نہیں۔

قیصر:۔ جن لوگوں نے یہ مذہب قبول کیا ہے وہ کمزور لوگ ہیں یا بااثر؟

ابوسفیان:۔ کمزور لوگ۔

قیصر:۔ اُس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟

ابوسفیان:۔ بڑھتے جاتے ہیں۔

قیصر:۔ کبھی تم لوگوں کو اُس کے متعلق جھوٹ کا بھی تجربہ ہے؟

ابوسفیان:۔ نہیں۔

قیصر:۔ وہ کبھی عہد و اقرار کی خلاف ورزی کرتا ہے؟

ابوسفیان:۔ ابھی تک تو نہیں کی لیکن اب جو نیا معاہدہ صلح ہوا ہے اس میں دیکھیں کہ وہ عہد پر قائم رہتا ہے یا نہیں؟

قیصر:۔ تم لوگوں نے اُس سے کبھی جنگ بھی کی؟

ابوسفیان:۔ ہاں!

قیصر:۔ نتیجہ جنگ کیا رہا؟

ابوسفیان:۔ کبھی ہم غالب آئے اور کبھی وہ۔

قیصر :۔ وہ کیا سکھاتا ہے؟

ابوسفیان :۔ کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو۔ کسی اور کو خدا کا شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو، پاکدامنی اختیار کرو، سچ بولو، صلۂ رحم کرو۔

اس گفتگو کے بعد قیصر نے مترجم کے ذریعہ کہا کہ تم نے اُس کو شریف النسب بتایا۔ پیغمبر ہمیشہ اچھے خاندانوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ تم نے کہا کہ اُس کے خاندان سے کسی اور نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا، اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس خاندان میں کوئی بادشاہ نہ تھا اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اُس کو بادشاہت کی ہوس ہے۔ تم مانتے ہو کہ اُس نے کبھی جھوٹ نہیں کہا، جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا پر کیوں کر جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے پیروی کی ہے۔ پیغمبروں کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب لوگ ہی ہوتے ہیں۔ تم نے تسلیم کیا ہے کہ اُس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے، سچے مذہب کا یہی حال ہے کہ بڑھتا جاتا ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اُس نے کبھی فریب نہیں کیا، پیغمبر کبھی فریب نہیں کرتے۔ تم کہتے ہو کہ وہ نماز اور تقویٰ و عفاف کی ہدایت کرتا ہے، اگر یہ سچ ہے تو میری قدم گاہ تک اُس کا قبضہ ہو جائے گا۔ مجھ کو یہ خیال ضرور تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا۔ میں اگر وہاں جا سکتا تو خود اُسکے پاؤں دھوتا۔

اس گفتگو کے بعد حکم دیا کہ رسولؐ اللہ کا خط پڑھا جائے۔ فرمانِ رسالت کے یہ الفاظ تھے:۔

ترجمہ:۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمدؐ کی طرف سے جو خدا کا بندہ اور رسول ہے۔ یہ خط ہرقل کے نام ہے۔ جو رُوم کا رئیسِ اعظم ہے، اُس کو سلامتی ہو جو ہدایت کا پیرو ہے۔ اس کے بعد میں تجھ کو اسلام کی دعوت کی طرف بلاتا ہوں۔ اسلام لا

تو سلامت رہیگا۔ خدا تجھ کو دُگنا اجر دیگا۔ اور اگر تو نے نہ مانا تو اہلِ مُلک کا گناہ تیرے اوپر ہوگا۔ اے اہلِ کتاب ایسی بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں یکساں ہے۔ وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی کو نہ پوجیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو (خدا کو چھوڑ کر) خدا نہ بنائے۔ اور تم نہیں مانتے تو گواہ رہو کہ ہم مانتے ہیں ___"

قیصر نے ابوسفیان سے جو گفتگو کی تھی اُس سے بطارقہ اور اہلِ دربار سخت برہم ہو چکے تھے۔ نامۂ مبارک کے پڑھے جانے پر اور بھی برہم ہوئے۔ یہ حالت دیکھ کر قیصر نے اہلِ عرب کو دربار سے اٹھا دیا اور گو اُس کے دل میں نورِ اسلام آچکا تھا لیکن تاج و تخت کی تاریکی میں وہ روشنی بجھ کر رہ گئی ___

خسرو پرویز (شہنشاہ ایران) کے نام جو نامۂ مبارک عبداللہ بن حذافہ لیکر گئے تھا، یہ تھا:۔

ترجمہ:۔ "خدائے رحمٰن ورحیم کے نام محمدؐ پیغمبر کی طرف سے کسریٰ (رئیسِ فارس) کے نام۔ سلام ہے، اُس شخص پر جو ہدایت کا پیرو ہو اور خدا اور پیغمبرِ خدا پر ایمان لائے اور یہی گواہی دے کہ خدا صرف ایک خدا ہے اور یہ کہ خدا نے مجھ کو تمام دُنیا کا پیغمبر مقرر کر کے بھیجا ہے تاکہ میں ہر زندہ شخص کو خدا کا خوف دلاؤں۔ تو اسلام قبول کر تو سلامت رہے گا ورنہ مجوسیوں کا وبال تیری گردن پر ہوگا۔" خسرو پرویز بڑی شان و شوکت کا بادشاہ تھا۔ اُس کی سلطنت میں دربار کو جو عظمت و جلال حاصل ہوا کبھی نہیں ہوا تھا۔ عجم کا طریقہ یہ تھا کہ سلاطین کو جو خطوط لکھتے تھے اُن میں عنوان پر پہلے بادشاہ کا نام ہوتا تھا۔ نامۂ مبارک میں پہلے خدا کا نام اور پھر عرب کے دستور کے موافق رسول اللہ کا نام تھا۔ خسرو نے اس کو اپنی تحقیر سمجھا اور بولا "میرا غلام ہو کر مجھ کو یوں لکھتا ہے۔" پھر نامۂ مبارک چاک کر ڈالا لیکن چند روز کے بعد خود سلطنتِ عجم کے پُرزے اُڑ گئے۔ نظامی نے شیریں خسرو میں یہ داستان مفصل لکھی ہے

اور اسلامی جوش سے لکھی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نامۂ مبارک پہنچنے کے بعد خسرو پرویز نے گورنر یمن کو جس کا نام بازان تھا فرمان بھیجا کسی شخص کو حجاز بھیجو کہ اس مدعیِ نبوت کو پکڑ کر میرے دربار میں لائے۔ بازان نے دو شخصوں کو جن میں سے ایک کا نام بابویہ اور دوسرے کا خرخسرہ تھا، مدینہ روانہ کیا۔ ان دونوں نے بارگاہِ رسالت میں آکر عرض کی کہ شاہنشاہِ عالم (کسریٰ) نے تم کو بلایا ہے۔ اگر حکم کی تعمیل نہ کروگے تو وہ تم کو اور تمہارے ملک کو برباد کر دیگا۔ آپ نے فرمایا تم واپس جاؤ اور کہدیا کہ تمہارے بادشاہ کو اُس کے بیٹے نے قتل کر دیا ہے۔ جب یہ لوگ لوٹے تو بازان کو انہوں نے آنحضرتؐ کا پیغام پہنچا دیا۔ چند دن کے بعد یہ خبر بازان کو ملی کہ واقعی پرویز کے بیٹے نے اُسے قتل کر دیا۔ بازان اور اُس کے ساتھی مسلمان ہو گئے۔

نجاشی (بادشاہِ حبش) کو آپ نے دعوتِ اسلام کا جو خط بھیجا اُس کے جواب میں اُس نے عریضہ بھیجا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ خدا کے سچے پیغمبر ہیں۔ حضرت جعفرِ طیّار جو ہجرت کرکے حبش چلے گئے تھے یہیں موجود تھے۔ نجاشی نے اُن کے ہاتھ پر بیعت اسلام کی۔

عزیزِ مصر کو جو آپ نے خط لکھا تھا اُس کے جواب میں اُس نے عربی زبان میں یہ خط لکھا (ترجمہ شبلی) "محمد بن عبداللہ کے نام مقوقس رئیسِ قبط کی طرف سے سلام علیک کے بعد، میں نے آپ کا خط پڑھا اور اُس کا مضمون اور مطلب سمجھا۔ مجھ کو اس قدر معلوم تھا کہ ایک پیغمبر آنے والے ہیں۔ لیکن میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ شام میں ظہور کریں گے۔ میں نے آپ کے مقاصد کی عزت کی اور دو لڑکیاں بھیجتا ہوں جنکی قبطیوں میں (مصر کی قوم) بہت عزت کی جاتی ہے۔ اور میں آپ کے لئے کپڑا اور سواری کا ایک خچر بھیجتا ہوں۔" بایں ہمہ عزیزِ مصر اسلام نہیں لایا۔ دو لڑکیاں

جو بھیجی تھیں ان میں ایک ماریہ قبطیہ تھیں جو حرم نبوی میں داخل ہوئیں دوسری سیرین تھیں جو حضرت حسّان کی ملک میں آئیں۔ خچر کا نام دُلدُل تھا جس کا ذکر اکثر حدیث میں آتا ہے۔ جنگ حُنین میں آپ اسی پر سوار تھے۔ طبری نے لکھا ہے کہ ماریہ اور سیرین حقیقی بہنیں تھیں اور حضرت حاطب بن بلتعہ جن کو آنحضرتؐ نے مقوقس کے پاس خط دے کر بھیجا تھا۔ اُن کی تعلیم سے دونوں خاتون خدمت نبوی میں پہنچنے سے پہلے اسلام قبول کر چکی تھیں۔

رؤسائے عرب کو جو خطوط لکھے گئے اُن کے بھی جواب مختلف آئے۔ ہوذہ ابن علی رئیس یمامہ نے لکھا کہ تم جو باتیں کہتے ہو وہ نہایت اچھی ہیں لیکن حکومت میں میرا بھی اگر کچھ حصہ ہو تو میں تمہاری اقتدا کے لئے تیار ہوں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ زمین کا ایک ٹکڑا بھی ہو تو میں نہ دُوں گا۔"

(مندرجہ بالا اقتباسات مولوی شبلی کی سیرت النبیؐ جلد اوّل سے لئے گئے ہیں)۔

جنابِ رسولؐ خدا نے ایک مکتوب نصاریٰ نجران کے پاس بھجوایا اور ان کو اسلام کی طرف دعوت دی۔ یہ واقعہ ۹ھ کا ہے اہل نجران نے بعد مشاورت ۱۴ آدمیوں کو اپنے میں سے منتخب کر کے مدینہ آنحضرتؐ کی خدمت میں بھیجا تاکہ جنابِ رسولؐ خدا کے حالات کی تحقیق کر کے اُن کے پاس خبر بھجوائیں۔ اُن میں سے سارا معاملہ صرف تین آدمیوں کے ہاتھ میں تھا۔ ایک عبدالمسیح المعروف بہ عاقب، دُوسرا ایہم ملقب بہ سید اور تیسرا ابو الحارث تھا۔ یہ لوگ اپنے ساتھ ستّر سوار لے کر آئے تھے۔ جب مدینہ پہنچے تو اصحابِ رسولؐ نے کہا کہ ہم نے عرب کے وفود میں آج تک ایسا وفد نہیں دیکھا۔ یہ خوبصورت بھی بہت زیادہ ہے اور ان کا قبیلہ بھی بہت بڑا ہے اور لباس بھی وہ سب علماء کا پہنے ہوئے ہیں۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی

معارج النبوۃ میں لکھتے ہیں کہ جب یہ لوگ (نصرانیوں کا وفد) مدینہ پہنچے تو اپنے سفر کے کپڑے اتار کر لباس فاخرہ ریشمی و انگشتری ہائے طلائی پہن کر آنحضرت کی خدمت میں مسجد میں آئے اور سلام کیا لیکن آنحضرت نے جواب سلام کچھ نہ دیا بلکہ اپنا منھ ان کی طرف سے پھیر لیا۔ وہ لوگ مسجد سے باہر آئے اور عثمان بن عفان اور عبدالرحمن بن عوف سے کہا کہ تمہارے پیغمبر نے ہم کو خط لکھ کر بلایا اور جب ہم آئے اور سلام کیا تو سلام کا جواب تک انھوں نے نہ دیا حالانکہ ہم گفتگو کرتے تھے لیکن ادھر سے سوائے خاموشی کے جواب نہیں ملتا تھا۔ اب تمہاری رائے کیا ہے ہم واپس جائیں یا ٹھہرے رہیں۔ عثمان اور عبدالرحمن آنحضرتؐ کی طبیعت اور منشا کو نہ سمجھ سکے اسلئے انھوں نے حضرت علیؑ کی خدمت میں آکر عرض کی کہ آپکی کیا رائے ہے۔ حضرت علیؑ نے کہا کہ یہ لوگ لباس فاخرہ ریشمی اور سونے کی انگوٹھیاں اتار دیں اور رہبانوں کا سا لباس پہن کر آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ ان لوگوں نے حضرتؐ کے کہنے کے مطابق عمل کیا اور آنحضرتؐ کی خدمت میں پھر سے حاضر ہو کر سلام کیا تو آنحضرتؐ نے جواب سلام دیا اور فرمایا کہ قسم بخدائے لایزال جس نے مجھ کو مبعوث برا ستی کیا ہے جب یہ لوگ پہلی مرتبہ آئے تھے تو ان کے ہمراہ شیطان تھا۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے ان کو اسلام کی طرف دعوت دی۔ ان لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ حضرت عیسیٰؑ کی شان میں کیا کہتے ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اس سوال کا جواب میں تم کو آج نہیں دونگا۔ اس شہر میں ٹھہرو تاکہ اس سوال کا جواب مجھ سے سنو۔ گویا آپ منتظر وحی تھے۔

دوسرے روز آل عمران کی آیات ۵۹ تا ۶۱ نازل ہوئیں ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون الحق من ربک فلا تکن من الممترین فمن حاجک فیہ من بعد ما جاءک من العلم فقل تعالوا ندع ابناءنا وابناءکم ونساءنا ونساءکم وانفسنا

وَ اَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝ (ترجمہ:
بتحقیق عیسیٰ کی مثال آدم کی طرح ہے کہ پہلے اُس کو مٹی سے پیدا کیا اور پھر خدا نے فرمایا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا۔ یہ حق تیرے خدا کی طرف سے۔ اب شک کرنے والوں میں نہ ہوئیں اسکے بعد کہ تیرے پاس علم آچکا ہے۔ اگر کوئی تجھ سے حجت کرے تو اس سے کہہ کہ آجاؤ بلا دیں ہم اپنے بیٹوں کو، تم اپنے بیٹوں کو، ہم اپنی بیٹیوں کو تم اپنی بیٹیوں کو، ہم اپنے نفسوں کو تم اپنے نفسوں کو پھر آپس میں مباہلہ کریں۔ پس خدا کی لعنت جھوٹ بولنے والوں پر ہو)۔ آنحضرتؐ نے اُن لوگوں کو طلب کیا اور اُن پر یہ آیات تلاوت فرمایا لیکن انھوں نے اقرار نہ کیا اور اپنے اعتقاد پر قائم رہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ چونکہ تم کو یقین نہیں آتا تو آؤ ہم مُباہلہ کریں یعنی ایک دوسرے کے لئے بددعا کریں اور کہیں کہ جھوٹوں پر خدا کی لعنت ہو۔ اُن لوگوں نے کہا کہ آپ ہم کو مہلت دیں تاکہ آپس میں مشورہ کرلیں اور کل آئیں۔ دوسرے روز وہ صبح کو آنحضرتؐ کی خدمت میں آئے اس طرف آنحضرتؐ نے مُباہلہ کا انتظام کر لیا تھا۔ حسینؑ ابن علیؑ کو گود میں لیکر حسنؑ ابن علیؑ کی انگلی پکڑ کر اس طرح نکلے کہ آپ کے پیچھے پیچھے حضرت فاطمہؑ اور علی مرتضیٰؑ تھے۔ آنحضرتؐ نے ان سے کہا کہ جب میں دُعا کروں تو تم آمین کہنا۔ سُبحان اللہ کیا وقت اور کیا سماں تھا۔ کیسے گواہ تھے کیسے مشہود تھے۔ جماعت نصاریٰ نے جب ان پنجتنؑ پاک کو دیکھا اور آنحضرتؐ کے اس ارشادِ دُعا و آمین کو سُنا تو ڈر گئے۔ ابوالحارث بن علقمہ جو سب سے زیادہ دانشمند تھا کہنے لگا کہ اے قوم! میں ایسے چہرے دیکھتا ہوں کہ اگر یہ خدا سے دُعا کریں کہ پہاڑ ہٹ جائے تو خداوند تعالیٰ ان کی خواہش کے مطابق پہاڑ کو ہٹا دے۔ ہرگز مباہلہ نہ کرنا ورنہ تباہ ہو جاؤ گے اور کوئی نصرانی روئے زمین پر باقی نہ رہے گا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ قسم بخدائے وحدہٗ لاشریک جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر یہ مُباہلہ کرتے تو بندروں اور سوروں کی شکل میں

مسخ ہوجاتے اور خداوند تعالیٰ اُن کے اوپر آگ برساتا۔ اہلِ نجران ہلاک ہوتے۔ اُنکے درختوں پر ایک پرندہ باقی نہ رہتا اور تمام نصاریٰ ہلاک ہوتے۔ پس اُن لوگوں نے عرض کی اے ابوالقاسم ہم مباہلہ نہیں کرتے۔ آپؐ نے فرمایا کہ مسلمان ہوجاؤ۔ اُنہوں نے کہا یہ کام ہم سے نہیں ہوسکتا۔ آپؐ نے فرمایا کہ پھر جنگ کے لئے تیار ہوجاؤ۔ انھوں نے کہا ہم میں آپکے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے۔ ہم اس بات پر صلح کرتے ہیں کہ ہر سال دو ہزار پوشاکیں جن میں ہر ایک کی قیمت چالیس درہم ہوگی آپؐ کو ادا کریں گے۔ ایک روایت میں ہے کہ اس کے علاوہ تیس گھوڑے، تیس شتر، تیس زرہیں اور تیس نیزے بھی ہم دیں گے۔ پس اِن تمام پر مصالحت ہوگئی۔

آیۂ مباہلہ اور اس واقعہ سے یہ امر مہرِ نیم روز کی طرح روشن ہوگیا کہ یہ پنجتنؑ جناب باری تعالیٰ کی محبوب ترین مخلوق ہیں اور صادقین ہیں اور یہ بھی خدا کا قانون ہے کہ اس کی بارگاہ میں اُس کے محبوب کی منزل جتنی بلند ہوگی اتنا ہی زیادہ اُس پر ابتلا کا نزول ہوگا۔ چنانچہ پنجتنؑ میں سے شدائد و مصائب کے نزول کے لئے حسینؑ منتخب ہوئے۔ اور اِن کی نصرت و تائید کے لئے اِن کی ہمشیرہ جناب زینبؑ کبریٰ منتخب ہوئیں۔ دونوں کی زندگی شروع سے آخر تک مصائب و آلام سے لبریز نظر آتی ہے۔ امام حسین علیہ السلام کی ولادت کے وقت جب حضور نبی کریم صلعم نے خبر شہادت سُنائی کہ یہ میرا فرزند تین دن کا بھوکا پیاسا زمین عراق پر مظلوم شہید ہوگا تو سب کے چہروں پر رنج و ملال کے آثار نمایاں ہوئے۔ جناب سیدہؑ نے فوراً پوچھا: بابا! آپ کے اور علیؑ مرتضیٰ کے ہوتے ہوئے میرے بچے کو کس طرح قتل کردیا جائے گا؟ حضورؐ نے فرمایا! بیٹی! اس وقت نہ میں ہونگا اور نہ علیؑ ہونگے۔ پھر عرض کی۔ بابا! کیا حسنؑ بھی نہ ہونگے؟۔ ارشاد ہوا کہ وہ بھی نہیں ہونگے۔ پھر استفسار کیا "اور میں؟"۔ فرمایا

بیٹی! تم بھی نہیں ہوگی"۔ تو پریشان ہو کر دریافت کیا' بابا! اس عالمِ بیکسی میں میرے بچے کو رونے والا کون ہوگا؟ ۔ آبدیدہ ہو کر فرمایا" حسینؑ کی جاں نثار بہن جسے ابھی دنیا میں آنا ہے" ۔۔۔ چنانچہ حضرت زینبؑ کی ولادت پر جب آپؐ خانۂ سیدّہ فاطمہ زہراؑ میں تشریف لائے اور بی بی فضہ نے جلدی جلدی قدم بڑھا کر آپؐ کی خدمت میں نواسی کی مبارکباد پیش کی تو آپؐ خاموش رہے اور آپؐ کے روئے مبارک پر مسرت و شادمانی کی بجائے آثارِ غم عیاں تھے ۔ شاعر نے اس دل شگاف منظر کو یوں بیان کیا ہے :

تشریف نبیؐ گھر میں ید اللہ کے لائے دیکھا رُخِ زینبؑ کو تو آنسو نکل آئے
پھر گود میں لینے کے لئے ہاتھ بڑھائے اور پیار میں یہ دَرد کے کلمے بھی سُنائے

آ۔ اے جگرِ سیدِ لولاک میں صدقے
آ۔ نوحہ گرِ پنجتنِ پاکؑ میں صدقے

آ۔ اے مری خاتونِ قیامت کی عزادار آ۔ اے وطن آوارہ و مظلوم و دل افگار
آ۔ اے اسد اللہ کے ماتم کی سزاوار آ۔ اے حسنؑ سیدِ مسموم کی غم خوار

صدقے ترے اے بیکس و بے وارث و والی
آ۔ لاشۂ شبیرؑ پہ مُنہ ڈھانپنے والی

یہ کہہ کے لگے چومنے زینبؑ کے جو بازو رقت کا یہ عالم تھا کہ تھمتے نہ تھے آنسو
یہ دیکھ کے بیٹی نے کہا اے شہِ خوش خو فرمایئے تو فاطمہؑ بھی کھول دے گیسو

باتیں بخدا آپ کی سب وحیِ خدا ہیں
لیکن سخن اس وقت کے نشتر سے سوا ہیں

کیا جان سے دُور آپ کی مرجاؤنگی میں آج زینبؑ مری اب دودھ کو ہو جائیگی محتاج
کیا قتل کہیں ہوگا علیؑ سا سرِ تاج میری ہی اجل خُوب ہے اے صاحبِ معراج

مر جاؤں بلا لے کے میں فرزندوں کے سر کی
شوہر بھی سلامت رہے ہو خیر پدر کی

تب رو کے محمدؐ نے کہا اے مری پیاری — اس وقت تو رحلت ہے ہماری نہ تمہاری
انجام یہ زینبؑ کا ہے رقت مجھے طاری — ہے اس کے مقدر میں فقط نالہ و زاری
زینبؑ سی گرفتار بلا کوئی نہیں ہے
ہم پنجتن پاکؑ کی یہ سوگ نشیں ہے

پہلے تو یہ ہووے گی عزادار پیمبرؐ — پھر چند مہینوں میں رہے گی غم مادرؑ
روئے گی ترے واسطے بیکس و مضطر — پھر آنکھوں سے دیکھے گی یہ زخم سر حیدرؑ
یہ تفرقہ ڈالے گا فلک بھائی بہن میں
ٹکڑے دل شبرؑ کے یہ دیکھے گی لگن میں

پر سب سے زیادہ ہے اسے ماتم شبیرؑ — جب کرب و بلا میں اسے لے جائے گی تقدیر
کیا کیا ستم دیکھے گی واں زینبؑ دلگیر — تڑپے گا حسینؑ آنکھوں کے آگے تہ شمشیر
جن بازوؤں پہ دیتا ہوں بوسہ میں دہن سے
بندھ جائیں گے بازو یہی اک روز رسن سے

آہ! کس طرح بیان کیا جائے کہ حضرت زینبؑ نے اس دنیا میں آنکھیں کھول کر کیا کیا دیکھا۔

شروع حادثہ تابوت مصطفےٰؐ دیکھا — کفن میں لاشہ خاتونؑ دوسرا دیکھا
علیؑ کے سر کو بھی آنکھوں سے خوں بھرا دیکھا — حسنؑ کو زہر ہلاہل سے لوٹتا دیکھا
رسولؐ حق کے ولی کو رسولؐ کو روئی
حسنؑ کو روئی جناب بتولؑ کو روئی

غضب ہے شمر کو سینہ پہ بھی چڑھا دیکھا
حسینؑ کو تہہ خنجر بھی لوٹتا دیکھا
سرِ امام کو نیزے پہ خوں بھرا دیکھا
گلوئے حضرت اصغرؑ کو بھی چھدا دیکھا

شہید جس کا ہر اک پیر اور جواں ہووے
بتاؤ اس کی مصیبت کا کیا بیاں ہووے

وہ بعد بھائی کے لوٹی گئی اسیر ہوئی
تباہ لختِ دلِ حضرتِ امیرؑ ہوئی
وہ شہر شہر پھری در بدر حقیر ہوئی
سیاہ شام میں نرغے میں دستگیر ہوئی

ہزار حیف کہ نکلا نہ مہر جس کے لئے
ردا بھی آئی میسر وہاں نہ اُس کے لئے

رخصت جناب عباس علمدار علیہ السلام

لو طالبِ رخصت ہیں شہِ دیں سے علمدار — شبیر کا بچپن سے سدا جس پہ رہا پیار
ہر عمر کا حاصل تھی یہی خدمتِ غمخوار — اس شیر سے مرعوب ہے سب لشکرِ کفار

بچپن سے وہ شبیر کی گودی میں پلا ہے
بتیسواں سال آیا تو مرنے کو چلا ہے

کہتا ہے کہ مولا مجھے اب اذنِ وغا دو — قدموں پہ فدا ہونے کا ہے وقت رضا دو
میں شوق میں تیر بلا کے ہوں تمنائی چلا دو — فردوس کی [illegible] مجھے راہ دکھا دو

بے چین ہوں میں صبر کا یارا نہیں مولا
سر دوش پہ [illegible] نہیں دیکھا

شبیر کو معلوم ہے اس شیر کی طاقت — دل جانتے ہیں اس کو وغا کی جو جسارت
اک ضرب میں [illegible] شجاعت — کس طرح سے [illegible] ہدایت

ساکت ہیں جواب اب کوئی حضرت نہیں دیتے
اس شیر کو لڑنے کی اجازت نہیں دیتے

ناگاہ درِ خیمہ سے یہ فضہ نے پکارا — یا شاہ ترے بچوں کی خبر لو ذرا
گھبرا کے ادھر پیاس کی شدت سے [illegible] — تڑپے ہوں اگر پانی کا مل جائے سہارا

بولے یہ تبسم سے لب [illegible] مبارک
پیاسوں کی سکینہ تجھے سقائی مبارک

کیا خوب ملا آپ کو پانی کا بہانا — کاندھے پہ پڑے شوق سے اب مشک [illegible]
پانی کے لیے آپ کو [illegible] جانا — سقائے سکینہ کا لقب ہے تمہیں پانا

لو جاؤ مرے دیدۂ پُرنم سے [illegible] گے
اور خیمے [illegible] مشک و علم ساتھ [illegible] گے

یہ سنتے ہی سُرخی رُخِ عباسؑ پہ آئی
اک وجد کے عالم میں چلا شہ کا فدائی
سوکھی ہوئی اک مشک سکینہؑ سے منگائی
ہمراہِ علم دوشِ مبارک پہ سجائی
مجرا کیا آکر شہہ دلگیر کے آگے
نیوڑھا دیا سَر حضرتِ شبیرؑ کے آگے

عباسؑ نے قدموں سے جو آنکھوں کو لگایا
شبیرؑ جھکے پیار کے ساتھ ان کو اٹھایا
سَر بھائی کا پھر سینۂ اقدس سے لگایا
اور بولے کہ مقصودِ دلی اب تو بر آیا؟
اُمت کو گناہوں سے بچانے کو چلے ہو
کیونکر نہ ہو آخر مری گودی کے پلے ہو

یاد آئیگی احباب کو جب تیری جوانی
رکنے کی نہیں آنکھوں سے اشکوں کی روانی
ہل جائیگا ہر قلب کو اک سوزِ نہانی
اصلاح کو کافی ہے یہی غم کی کہانی
محبوب بہت مجھ کو ہے تصویرِ علیؑ کی
خوش ہو کے فدا کرتا ہوں اُمت پہ نبیؐ کی

دیتا ہوں اجازت تمہیں میدان میں جاؤ
تیغ و تبر و تیر و سناں شوق سے کھاؤ
بگڑے ہوئے اُمت کے مقدر کو بناؤ
احباب کے دل ظلم و ستم سہہ کے دکھاؤ
خالق کو یہ قربانیاں مقبول ہوں سب کی
بارش رہے اُمت پہ سدا رحمتِ رب کی

لو بھائیو اب جاتا ہے مولا کا علمدار
سونی نظر آنے لگی شبیرؑ کی سرکار
ابتک تو ہے قائم علمِ احمدِ مختار
اور اس کی طرف دیکھ رہے ہیں شہہ ابرار
سب اہلِ حرم کی بھی نظر سوئے علم ہے
ہو جائیگا ٹھنڈا یہ علم سب کو یہ غم ہے

مدت میں پیمبرؐ کا نشاں آج سجا تھا افسوس کہ یہ سبز علم پھر نہ اٹھے گا
چمکے گا فضا میں نہ کبھی نور کا پنجہ لہرائے گا پھر آہ نہ یہ سبز پھریرا
اندازہ کرے کون غمِ اہلِ حرم کا
ہے آخری دیدار محمدؐ کے علم کا

یہ ہے وہ علم جس کو پیمبرؐ نے بنایا یہ وہ ہے جسے فاطمہؑ زہرا نے سجایا
خیبر میں جسے حیدرؑ صفدر نے اٹھایا آج اس کو لئے ہے اسد اللہ کا جایا
لو مشک و علم لے کے وہ میداں کو چلا ہے
پشتی پہ خدا، سامنے میدانِ وغا ہے

ہاں بھائیو جاتا ہے شہہ دیں کا فدائی بس لشکرِ شبیرؑ کی ہوتی ہے صفائی
غربت میں جدا ہوتا ہے لو بھائی سے بھائی لٹ جائے گی اب حیدرِ صفدر کی کمائی
پرسا دو جواں بھائی کا خالق کے ولی کو
دل تھام کے رخصت کرو عباسؑ علی کو

رو رو کے کہو لٹے شہہ بے کس کے برادر تم جاتے ہو رہ جائیں گے تنہا شہہ صفدر
سنسان ہوا جاتا ہے شبیرؑ کا گھر بھر اب کا ہے کو تم آؤ گے میداں سے پلٹ کر
پھر کون ہے شبیرؑ کی نصرت جو کرے گا
معلوم نہیں کیسے وہ دکھ درد بھرے گا

عباسِ علیؑ آپ کے مولا ہیں اکیلے دریا پہ نہ ہو دیر کہ آقا ہیں اکیلے
جلد آئیو دیکھو شہہ والا ہیں اکیلے دلبندِ علیؑ دلبرِ زہرؑا ہیں اکیلے
دیکھو کہیں تاخیر میں کچھ پیچ نہ پڑ جائے
سید کے تحفظ ہی کا نقشہ نہ بگڑ جائے

عباسؑ علیؑ بہرِ خدا جلد ہی آنا
بے آس یتیموں کو کہیں بھول نہ جانا
اِس دھوپ میں غم پیاس کا اطفال کی کھانا
ایسا تو نہیں، کرتے ہو پانی کا بہانا؟

بچپن سے جو تم شوقِ شہادت میں پلے ہو
دریا کے بہانے سے نہ کوثر پہ چلے ہو

عباسؑ بہت آپ کو پیاری ہے سکینہؑ
اور آپ پہ قربان ہے واری ہے سکینہؑ
پیاسی کو نہ بھولو کہ تمہاری ہے سکینہؑ
عباسؑ بڑی دَرد کی ماری ہے سکینہؑ

ایسا نہ ہو پیاسی کو غم و درد سوا دو
تم چاہ میں کوثر کی کہیں اس کو بھلا دو

ہے لشکرِ اعدا پہ بہت رُعب تمہارا
جب تم چلے شبیرؑ کا پھر کیا ہے سہارا
عباسؑ رکھو اس کا ذرا دھیان خدارا
رہ جائے نہ تنہا کہیں زہراؑ کا دُلارا

آنے کی تمہارے بھی اُسے آس نہیں ہے
اکبرؑ کے سوا اب تو کوئی پاس نہیں ہے

کوثر کو اگر جائے گی حضرت کی سواری
پھر جائیں اکبرؑ نے بھی جاں شاہ پہ واری
طاقت تو چلی جائیگی شبیرؑ کی ساری
آقا کو کہیں پا گئے تنہا جو یہ ناری

زغہ ہی کریں گے یہ محمدؐ کے پسر پہ
برسائیں گے یہ تیر رسالت کے جگر پہ

سوچو تو ذرا ساتھ میں ہے ثانیٔ زہراؑ
تم کو تو ہمیشہ سے بڑا پاس ہے اس کا
خود تم نے مدینے میں سوار اُسکو کیا تھا
ایسا نہ ہو برباد ہو ہمشیر کا پردہ

بھائی جو نہ ہوں گے تو وہ دُکھ درد بھرینگی
سر ننگے وہ بازار میں کوفے کے پھرے گی

اِس عرض کو عباسؑ علیؑ دھیان میں لاؤ
ان بی بیوں کو درد و مصیبت سے بچاؤ
روضہ پہ نبیؐ کے انہیں پہنچا کے بٹھاؤ
پھر شوق سے تم جنگ کرو خوں میں نہاؤ
لوٹیں نہ انہیں دشمنِ دیں بعد تمہارے
قیدی نہ بنائیں وہ کہیں بعد تمہارے

عباسؑ علیؑ لب پہ ہمارے جو ہے نالا
غم سے ہیں غلاموں کے کلیجے تہہ و بالا
بے آس ہوئے جاتے ہیں یہ ہے شہہ والا
اس قوم نے شبیرؑ کو کس درد میں ڈالا
ہم بول اُٹھے غم میں برا ہو کہ بھلا ہو
ہے جراُتِ بے باک اگر، عفو خطا ہو!

معلوم ہے معروض پہ کچھ دھیان نہ دینگے
جو دل میں سمائی ہے وہی آپ کرینگے
میدان میں جاتے ہی اب اعدا سے لڑینگے
ہیں حق کے دھنی آپ رہِ حق میں مرینگے
کوثر کی تمہیں چاہ ہے پہچان گئے ہم
کچھ شوقِ شہادت ہے سوا جان گئے ہم

اے شہہ کے علمدار خدا حافظ و ناصر
شبیرؑ کے غمخوار خدا حافظ و ناصر
بے کس کے مددگار خدا حافظ و ناصر
اے حق کے طلبگار خدا حافظ و ناصر
میدانِ دغا میں تمہیں جانا ہو مبارک
مشکیزہ بھرے نہر سے لانا ہو مبارک

بس طول نہ دے روک ادیمؔ اپنے قلم کو
کس طرح سے لکھ پائیگا اس درد و الم کو
پہنچا ہے جو مقتل میں شہنشاہ اُمم کو
سُن بھی نہیں سکتا کوئی اس ظلم و ستم کو
عصیاں سے بچائیں ہمیں یہ ان کی رضا ہے
بھائی کو اسی واسطے قربان کیا ہے

مرثیہ جناب علی اکبر علیہ السلام

فرزند کا ماتم بھی زمانے میں غضب ہے — نشتر کی طرح چبھتا ہے دل میں وہ تعب ہے
ہر صاحبِ دل کے یہ تڑپنے کا سبب ہے — اس پر بھی نہ تڑپے جو کوئی بات عجب ہے
نزع میں کوئی باپ نہ فرزند کو دیکھے
زخمی ہوئے برچھی سے نہ دلبند کو دیکھے

اولاد تو انساں کے کلیجے کا ہے ٹکڑا — غم سب کا ہی تڑپاتا ہے بیٹی ہو کہ بیٹا
ہے قلب پہ ماں باپ کے اک تیر سا لگتا — جیسے کوئی اندر سے کلیجہ ہے مسلتا
ہو جاتی ہے تاریک یہ دنیا ہی نظر میں
اک میخ گڑی ہوتی ہے محسوس کمر میں

بتلائیے کس طرح سے اس غم کا بیاں ہو — کس طرح کسی دل پہ حقیقت یہ عیاں ہو
جس وقت نگاہوں میں یہ محشر کا سماں ہو — فرزند وہ دم توڑ رہا ہو جو جواں ہو
اس درد کو پوچھے کوئی ماں باپ کے جی سے
ملتی نہیں تسکیں انہیں دنیا میں کسی سے

یوں لگتا ہے جیسے کہ ہو اک زخم سا دل پر — اور سینے میں دل ایسے کہ مذبوح کبوتر
آتا نہیں نالوں کے سوا کچھ بھی لبوں پر — ہو خاک سکوں چھین تو لے جاتا ہے دلبر
کیونکر نہ بھلا سینے میں دل باپ کا تڑپے
فطرت ہے کہ وہ ماہیٔ بے آب سا تڑپے

فطری ہے کہ فرزندِ جواں ہوتا ہے پیارا — خود سوچ کے انصاف سے بتلاؤ خدا را
کرنے لگے دنیا سے اگر وہ ہی کنارا — ہے کوئی جسے بیٹے کا مرنا ہو گوارا؟
ہر باپ یہی چاہے گا میں اس کی بلا لوں
صدقے کروں ہر چیز مگر اس کو بچا لوں

اب غور کرو عقل نہیں کرتی ہے یاری
شبیرؑ کو کس درجہ ہے مخلوق دلاری
اس کا یہی منشا ہے کہ بخشش ہو ہماری
اولاد نہیں اُمت جد سے اُسے پیاری
قربان کروں بیٹے کو یہ دل میں ٹھنی ہے
بیٹا بھی وہ بیٹا کہ جو ہمشکلِ نبیؐ ہے

فرزندِ پیمبرؐ کی یہ اُمت پہ ہے رحمت
بیٹے سے کہیں زیادہ اُسے ہم سے ہے اُلفت
تینوں میں جواں بیٹے کو بھیجے، ہے یہ نیت
اُمت کے لئے اس کو گوارا ہے اذیت
محبوب ہمارے لئے ہر رنج و تعب ہے
پیارا نہ ہو اس پہ بھی ہمیں وہ تو غضب ہے

ہاں اہلِ عزا سوچ کرو غور خدارا
شہہ نے کیا فرزند کا جو داغ گوارا
کس طرح ہماری ہے وہ بخشش کا سہارا
جب ہم نے کیا ہو نہ گناہوں سے کنارا
بوجھ اپنے گناہوں کا نہ اکبرؑ پہ پڑے گا
جیسا بھی کسی نے کیا وہ آپ بھرے گا

ہاں بھائیو یہ بات بڑی غور طلب ہے
غفلت ہی تو انساں کے گناہوں کا سبب ہے
بڑھ جاتی ہے کچھ اور بھی عصیاں سے غضب ہے
اور صرف یہی دوریِ رحمت کا سبب ہے
کم ہوتی ہے گر درد و الم نفس کو پہونچے
بس اس کی دوا یہ ہے کہ غم نفس کو پہنچے

مٹ جاتا ہے جذبات کا سب جوش الم سے
غفلت میں بھی آجاتا ہے کچھ ہوش الم سے
ہوتا ہے گناہوں سے سبکدوش الم سے
شیطان بھی ہو جاتا ہے روپوش الم سے
جذبات ہی دنیا میں گناہوں کا سبب ہیں
جذبات کے مصلح تو فقط رنج و تعب ہیں،

ہوتی ہے جوانی کی تو غفلت ستم آرا — سُننا نہیں ہوتا ہے نصیحت کا گوارا
پر ذکر جوانوں کا اُسے ہوتا ہے پیارا — قربانی و ایثار کا گر ذکر ہو سارا

پہنچے الم و درد تو کچھ ہوش میں آئے
فطری ہے کہ غم اُس کو گناہوں سے بچائے

قربانیِ اکبرؑ کی اگر دل میں رہے یاد — ممکن نہیں اس ظلم و ستم پر نہ ہو فریاد
اکبرؑ کی جوانی ہو مرے واسطے برباد — اس پر بھی نہ ہو دل کو الم اور رہوں شاد

ہم شکلِ نبیؐ میرے لئے تیغ و سناں کھائے
صد حیف کہ مجھ سے نہ برائی سے بچا جائے

ہاں اہلِ عزا دیکھو کہ کیا کرتے ہیں شبیرؑ — اکبرؑ سا پسر قوم پہ فدا کرتے ہیں شبیرؑ
پہلوئے کلیجے کو جُدا کرتے ہیں شبیرؑ — مرتا ہے پسر شکرِ خدا کرتے ہیں شبیرؑ

تنہائی ہے غربت ہے برادر کا الم ہے
اس وقت میں بیٹا بھی جدا ہو تو ستم ہے

کس حال میں خاموش کھڑے ہیں شہِ دلگیر — ہیں بیچ میں خود چار طرف لشکرِ بے پیر
اک ضرب ہے ہزاروں ہیں مگر خنجر و شمشیر — دلبند ہیں نہ کے ہیں نہ ہے بھائی کی تقدیر

ہے فوج نہ لشکر نہ علمدار ہے باقی
بس اصغرؑ و اکبرؑ ہیں یا بیمار ہے باقی

جو کچھ بھی ہے لشکر کی عجب شان ہے واللہ — وہ دھوپ میں ہیں نرغے میں ہیں کھڑے ابنِ یداللہ
اصحاب کے پیچھے ہیں فقط اکبرؑ ذی جاہ — یا چار طرف خوں میں غلطاں شہیدانِ الٰہ

میدان میں سردار ہے اور ایک سپاہی
ہیبت سی مگر پھر بھی لعینوں پہ ہے چھائی

قرباں ہوں میں ہمتِ شبیرؑ پہ یارو فرزند سے فرماتے ہیں لو جاؤ سدھارو
امت کی بگڑتی ہوئی تقدیر سنوارو اور کس کی ہدایت کے لئے جان کو وارو
میداں میں اب تیغ و سناں کھانے کو جاؤ
سامانِ شفاعت کے لئے خوں میں نہاؤ

یہ سنتے ہی اک بار بڑھے اکبرِ ذیجاہ ہاتھوں کو اٹھا کر یہ دعا کرنے لگے شاہ
اس قوم پہ تو رہیو گواہ اے مرے اللہ اب جاتا ہے مرنے کو وہ بیٹا پئے جنگاہ
حد درجہ مشابہ ہے جو خلقت میں نبیؐ سے
رفتار، کہ گفتار، کہ کردار سبھی سے

اس بات سے مقصد تھا کہ ہو خلق پہ ظاہر آلِ نبوی کرتے ہیں مخلوق کو طاہر
ہر رنج و بلا میں وہ رہا کرتے ہیں شاکر دشمن سے بھی میلی وہ نہیں رکھتے ہیں خاطر
کرتے رہے اعدا کو یہی شاہ نصیحت
بچ جاؤ ہلاکت سے کہ اب بھی ہے غنیمت

اس فوج میں سب جانتے تھے حق کے نبیؐ کو بعضوں نے تو دیکھا تھا رسولِ عربیؐ کو
اس واسطے بھیجا وہاں ہمشکلِ نبی کو دیکھیں گے جو تصویرِ رسولِ مدنیؐ کو
ممکن ہے اسے دیکھ کے دل کوئی پگھل جائے
اور بندۂ خالق کوئی دوزخ سے نکل جائے

اس واسطے کہتے ہیں کہ اے خالقِ اکبر ہر طرح سے سمجھا چکا میں ان کو برابر
گو کر چکے ہیں قتل یہ سب میرے برادر پر اب بھی سمجھ جائے کوئی ان میں تو بہتر
بندے ہیں ترے تو نے کیا ہے انہیں پیدا
شبیرؑ ہے یارب تری مخلوق پہ شیدا

ہر بات کا تو جاننے والا ہے الٰہی
سب کٹ گیا لشکر مرا کوئی نہیں باقی
اب کون ہے بھیجوں جسے جز اکبرؑ غازی
سرتا بہ قدم شکل ہے جو تیرے نبیؐ کی
اس کی بھی اثر گر نہ کرے صورت و تقریر
امت کے لئے اس کے سوا کیا کرے شبیرؑ

اس طرح بیاں کرتے ہیں اب راوی اخیار
میداں میں پہونچے جو علی اکبرؑ جرار
مبہوت ہوئے دیکھ کے صورت کو ستمگار
بعضوں نے کہا آگئے لو احمدؐ مختار
ہو کر متبسم کہا دلبندِ نبیؐ ہوں
میں ایک علیؑ ابنِ حسینؑ ابنِ علیؑ ہوں

دعویٰ ہے تمہارا کہ مسلمان ہو سارے
کہتے ہو نبیؐ تم بھی تو نانا کو ہمارے
ہوں سامنے اس شکل میں موجود تمہارے
لو غور سے دیکھو مجھے اور کر لو نظارے
عقبیٰ میں ہے گر آس رسولِ عربیؐ سے
برتاؤ مناسب کرو ہمشکلِ نبیؐ سے

ہر طرح سے سمجھاتے رہے اکبرؑ ذیجاہ
مانے نہ کسی طور مگر دشمن گمراہ
سمٹی کئی جانب سے صفِ لشکر بدخواہ
برسانے لگے تیر و سناں گھیر کے ہر راہ
اکبرؑ نے بھی تلوار کچھ اس شان سے کھینچی
اعدا کے لئے گویا اجل میان سے کھینچی

ہر دیکھنے والے کو ہے اس بات کا اقرار
پیاسے تھے کئی روز کے گو اکبرؑ جرار
اس پر بھی کیا سینکڑوں اشرار کو فی النار
کہتے ہیں کہ مارے گئے کُل پانچسو اسوار
تھی بھوک بھی اور پیاس بھی اور خوں بھی تھا بہا
پر لشکرِ اعدا کا بُرا حال کیا تھا

معروفِ وغا تھے کہ سِناں سینے پہ کھائی جو تیر کے سینے کو کلیجے میں در آئی
اور جونہی رُکا ہاتھ، سپاہ ٹوٹ کے آئی پھر کیا تھا لگی لٹنے شہہِ دیں کی کمائی

گھوڑے سے گرے، گرتے ہی بابا کو پکارا
ہے وقتِ مدد آیئے! اکبرؑ گیا مارا

سُنتے ہی صدا رن کو چلے سیّدِ ابرار پیدل تھا جلو میں نہ کوئی ساتھ تھا اسوار
ہمدم تھا کوئی اور نہ کوئی مونس و غمخوار اس طرح سے پہونچے پسرِ حیدرِ کرار

جس وقت کہ مقتل میں شہہ بحر و بر آئے
ریتی پہ تڑپتے ہوئے اکبرؑ نظر آئے

تھا خاک میں اور خون میں غلطاں وہ دُلارا بہتا تھا لہو زخموں سے تن چور تھا سارا
ٹوٹا تھا پڑا خاک پہ پیری کا سہارا کس دل سے کوئی باپ کریگا یہ نظارا

نے آہ نہ نالا نہ بُکا کرتے ہیں مولا
مرتا ہے پسر شکرِ خدا کرتے ہیں مولا

وہ غور کرے جس کو شہہ دیں کی ہو کچھ چاہ کیوں شکر ادا کر کے یہ فرمانے لگے شاہ
اے راحتِ جاں نورِ نظر اکبرِؑ ذیجاہ ہے بعد ترے خاک ہی اس دہر پہ واللہ

مقصود تھا کیا اس سے حسینؑ ابنِ علیؑ کا
کیا بات یہ کہتا تھا جگر بند نبیؐ کا

مطلب یہ ہے اکبرؑ کہ تھا ہمشکلِ پیمبرؐ قربان کیا اس کو بھی اُمت ہی کے اوپر
اب جنکے دلوں میں ہے وِلائے شہہِ صفدر بن جائیں گے سُن کر اسے وہ درد کے پیکر

ہر زینتِ دنیا کہ جو لے جائے سقر میں
ہو جائیگی بس خاک ہی ان سب کی نظر میں

اے اہلِ عزا غور کرو کچھ تو خدارا
شبیرؑ نے بیٹا بھی کیا ہم سے نہ پیارا
چھنوا دیا پیری کا جو تھا اپنا سہارا
افسوس ہے گر قلب نہ ٹکڑے ہو ہمارا

ایثار ہمارے لئے کیا کر گئے شبیرؑ
سب بھائیوں بیٹوں کو فدا کر گئے شبیرؑ

فرزندِ رسولِ عربیؐ، اے شہہ ذیشاں
اس نظرِ کرم پر تری، صدقے ہو مری جاں
کیا خوب ہماری کیا بخشش کا یہ ساماں
ہم لوگوں کی خاطر ہو جواں بیٹا بھی قربان

احمدؐ کے نواسے تری اُلفت کے میں صدقے
اے بھوکے پیاسے تری الفت کے میں صدقے

میرے لئے کیا رنج سہے اے شہہ والا
تف ہے جو نہ ہو میرا کلیجہ تہہ و بالا
میرے لئے تاریک ہو گھر بھر کا اُجالا
ہو چاند ترا خاک پہ اور خون کا ہالا

ہمشکلِ نبیؐ میرے لئے خاک پہ تڑپے
کیوں قلب نہ ابنِ شہہ لولاک پہ تڑپے

میرے علی اکبرؑ میرے ذیشاں علی اکبرؑ
نازوں کے پلے درد کے درماں علی اکبرؑ
تم نے نہ کیا ماں کا بھی کچھ دھیاں علی اکبرؑ
اور ہو گئے میرے لئے قربان علی اکبرؑ

رحمت کا نزول اس پہ ہو کیا دل تھا وہ ماں کا
تم جیسا پسر جس نے کہ قربان کیا تھا

اے بانوئے ناشاد عجب لال گنوایا
سہرا نہ بندھا بیاہ بھی اس کا نہ رچایا
دھیان اس کی جوانی کا نہ مطلق تمہیں آیا
میرے لئے یہ داغ کلیجہ پہ اٹھایا

ایسا نہ جگر ہو گا زمانے میں کسی کا
جو اپنا پسر اوروں پہ قربان کرے گا

بی بی یہ ادیم آپ کی الفت کا ہے طالب
اس پر کوئی جذبہ کوئی خواہش نہ ہو غالب
اکبرؑ کے تصدق میں ملیں اس کے مطالب
دل اس کا سدا تیری محبت کا ہو طالب

ہمشکل پیمبرؐ کی سدا یاد میں تڑپے
ہر صبح و مسا نالہ و فریاد میں تڑپے

ہاں بھائیو اب مادرِ اکبرؑ کو کرو یاد
اس بی بی کی خدمت میں کرو نالہ و فریاد
اے کوکھ جلی درد بھری بانوئے ناشاد
اللہ رکھے خلد میں گھر کو ترے آباد

گو حشر تلک آپ کے فرزند پہ روئیں
ممکن نہیں احساں سے سبکدوش ہم ہوئیں

واللہ تھا کس درجہ تمہیں دھیان ہمارا
قرباں وہ بیٹا کیا جو سب کو تھا پیارا
بن بیاہا گیا خلق سے دلبند تمہارا
کس چودھویں کے چاند کو ہم لوگوں پہ وارا

یہ وہ مہِ کامل تھا نظر جس پہ نہ ٹھہرے
سر شرم سے یوسفؑ کا بھی جھک جائے جو دیکھے

تم کو نہ ہوا اسکی جوانی کا بھی کچھ دھیان
ہم لوگوں پہ قرباں کیا اپنا جگر و جان
سہرا نہ بندھا آہ نہ نکلا کوئی ارمان
افسوس کہ سرسبز چمن ہو گیا ویران

ترسا کیا پانی کو جگر بند تمہارا
تلواروں سے ٹکڑے ہوا فرزند تمہارا

زخمی ہے پڑا خاک پہ زہراؑ کا وہ پوتا
بی بی کہو کچھ درد تو دل میں نہیں ہوتا
اے کاش کہ میں خدمتِ شبیرؑ میں ہوتا
اُس شیر جواں کے لئے میں جان کو کھوتا

برچھی جو لگاتا کوئی ہمشکلِ نبیؐ کو !
میں سینہ پہ خود روکتا نیزے کی انی کو

مرثیہ جناب علی اصغر علیہ السلام

اے صاحبو! اولاد بھی کیا نعمت رب ہے
سچ ہے کہ یہی زینتِ دنیا کا سبب ہے
اولاد سے محبوب زیادہ کوئی کب ہے
بچوں سے نہ اُلفت ہو کسی کو تو عجب ہے
بچے پہ تو ہر شخص ترس کھاتا ہے دل سے
حیوان کے بچے پہ بھی رحم آتا ہے دل سے

ہوتی ہے نہیں بچوں کی تکلیف گوارا
بچہ جو تڑپتا ہو کوئی پیاس کا مارا
ہونٹوں پہ زباں پھیر رہا ہو وہ بچارا
ممکن نہیں ہو صبر کے ساتھ ایسا نظارا
ہر شخص یہ چاہے گا کہ تکلیف مٹا دوں
اس بچے کو جس طرح بھی ہو پانی پلا دوں

بچہ جو ابھی بولنے کے قابل بھی نہ ہووئے
اور اتنی سکت بھی نہ ہو تکلیف میں روئے
وہ پیاس کی شدت سے بھلا کس طرح سوئے
یہ حال جو دیکھے وہی منہ اشکوں سے دھوئے
پھر کیسا قلق ہوئے گا ماں باپ کے جی کو
تڑپاتا ہے جب بچوں کا یہ حال سبھی کو

اور ننھا سا بچہ تو ہے گھر بھر کا کھلونا
اِک مشغلہ ہے باپ کا مادر کا کھلونا
چھوٹی ہو بڑی ہو، وہ ہے خواہر کا کھلونا
گھر بھر میں ہے ہر ایک برادر کا کھلونا
پیارا ہے وہی پیار کا مرکز ہے سبھی کا
یارب نہ مرے ننھا سا بچہ تو کسی کا

جھولے میں جھلاتے ہوں جسے خوں میں نہائے
اور باپ کی آغوش میں جاں اپنی گنوائے
ایسی بھی اذیت کوئی معصوم نہ پائے
یارب! کسی بچے کے کوئی زخم نہ آئے

لگ جائے کہیں تیر جو حلقوم پسر میں
گویا ہوا پیوست وہ مادر کے جگر میں

کس ماں کو گوارا ہے کوئی یہ تو بتائے
ننھا سا پسر اس کا کوئی خوں میں نہائے
اور تیر ستم ننھی سی گردن پہ وہ کھائے
تڑپے گی اگر خیال بھی اس بات کا آئے

کس باپ کا دل ہے جو پسند اس کو کرے گا
ہے کوئی خوشی سے جو یہ دکھ درد بھرے گا

مشکل ہے مثال ایسی کوئی خلق میں مل جائے
ماں باپ کا دل اسکے تصور ہی سے ہل جائے
تسکین کا محور ہی اگر خاک میں رل جائے
ممکن نہیں ماں باپ کے ہاتھوں سے نہ دل جائے

ہمت ہے یہ بس احمدِ مرسل کے پسر میں
مخصوص ہے یہ حیدرِ کرار کے گھر میں

کس واسطے دکھ آلِ نبیؐ نے کئے منظور
سوچیں تو کھلیں راز، رہیں ورنہ یہ مستور
ہے کتنی احادیث میں اس بات کا مذکور
جو دل ہو شکستہ رہے حد درجہ وہ رنجور

رحمت کی نظر اس پہ پڑے ربِ علیؑ کی
اور پائے اماں شانِ کریمی میں خدا کی

فطرت ہے یہ انساں کی بھلا دیتا ہے غم کو
کوشش یہی کرتا ہے رکھے دور الم کو
یہ ذکر مسلسل کبھی بھاتا نہیں ہم کو
پر یاد اگر کرتے ہیں اس ظلم و ستم کو

جو احمدِ مرسل کے گھرانے پہ رہا ہے
دنیا کے ہر اک ذکر سے مرغوب ہوا ہے

ہمدردی کا جذبہ ہے ہر انسان میں مستور — تکلیف و مصیبت کا کسی کی جو ہو مذکور
سنتا ہے بڑے شوق سے اور ہوتا ہے رنجور — اس جذبے کی تسکین سے پھر ہوتا ہے مسرور

تکرار جو ہو غم کی اثر دل پہ پڑے گا
فطرت ہے کہ مغموم برائی سے بچے گا

اس ذکرِ الم کو جو کوئی دل میں سموئے — عصیاں کی سیاہی کو یہ غم نفس سے دھوئے
ہو یاد جو یہ ہم نہ کبھی چین سے سوئے — اور درد جو دل میں ہو تو غفلت کو بھی کھوئے

ہو دور جو غفلت تو گناہوں سے بچے گا
اور پھر نہ بُرے کام وہ دنیا میں کرے گا

اس واسطے شبیرؑ نے بچے کیے قربان — حیوان صفت خلق میں جو رہتے ہیں انسان
ہو دور جو غفلت تو رہیں گے نہ وہ ناداں — بڑھ جائیگا کچھ شہ کے محبّوں کو بھی ایماں

جب نور ملا چین سے دنیا میں رہیں گے
پہچان کے ہادی کو زمانے کے مریں گے

فرزندِ پیمبرؐ نے یہ قربانیاں دے کر — سامانِ غم و رنج مہیا کیا یکسر
ہر عمر کے ہر شخص کو ہو درد میسّر — تا ہو اثرِ درد و الم سب کے دلوں پر

بچوں کے لئے غم کا یہ سامان کیا ہے
شش ماہہ پسرِ شاہ نے قربان کیا ہے

لو دیکھو وہ خیمے کی طرف جاتے ہیں شبیرؑ — اصغرؑ ہیں کہاں آکے یہ فرماتے ہیں شبیرؑ
پھر آپ ہی جھولے کے قریں آتے ہیں شبیرؑ — معصوم کو بیہوش پڑا پاتے ہیں شبیرؑ

بچے کا کسی کے کوئی یہ حال نہ دیکھے
بیٹے کا کوئی باپ یہ احوال نہ دیکھے

کیسے ہو بیاں شہہ کو جو حالت نظر آئی ہونٹ اودے تھے زردی رخِ روشن پہ چھائی
گردن کی رگیں صاف جو دیتی تھیں دکھائی ظاہر تھا کہ پانی کی نہیں بوند بھی پائی
تھا حلق جو سوکھا ہوا ہچکی بھی لگی تھی
خاموش کھڑی پاس ہی ماں دیکھ رہی تھی

شبیرؑ نے منھ کان سے بیٹے کے لگایا سرگوشی میں نہ جانیئے کیا اس کو سنایا
بس کھول دیا آنکھوں کو اور ہوش میں آیا بابا کی طرف ہاتھوں کو پھیر اس نے اٹھایا
روئے شہہِ دلگیر تو تکنے لگا بچہ
شبیرؑ کی جانب کو ہمکنے لگا بچہ

میں بھی تو سنوں ثانیٔ زہراؑ نے یہ پوچھا بھیا یہ کہو آپ نے اصغرؑ سے کہا کیا
جو سنتے ہی ہوش آگیا اور شوق سے ہمکا شہہ بولے بہن میں نے فقط اتنا کہا تھا
امت کو گناہوں سے بچانے نہیں چلتے؟
میدان میں تم خوں میں نہانے نہیں چلتے؟

اب اہلِ عزا سوچیں یہ کیسی ہے قیامت شبیرؑ کے بچوں کو ہماری ہے یہ الفت
قربان ہوا واہ رے ششماہے کی ہمت مقصد تھا کہ بچ جائے گناہوں سے یہ امت
ہے شرم کی جا گر نہ گناہوں سے بچیں ہم
اور غرقِ ہوا و ہوسِ نفس رہیں ہم!

ششماہے کو القصہ شہہ دیں نے اٹھایا چھد جائیگا ناوک سے گلا دھیان جو آیا
حلقوم کے بوسے لئے چھاتی سے لگایا اور ہاتھوں پہ لے کر اسے دامن سے چھپایا
تصویر عجب قدر کے قابل نظر آئی
رکھی ہوئی قرآں پہ حمائل نظر آئی

خیمے سے جو نکلے اُسے ہاتھوں پہ اُٹھائے   داماںِ عبا ننھے سے بچے کو اُڑھائے
اعدا کو ہوا خیال کہ قرآن ہیں لائے   اور صلح کا پیغام ہمیں دینے ہیں آئے
پر اُلٹا جو دامن تو یہ منظر نظر آیا
ششماہہ پسر ہاتھوں کے اوپر نظر آیا

پھر فوج سے فرمانے لگے شاہِ خوش انجام   تم طالب بیعت ہو مجھی سے ہے تمہیں کام
تقصیر ہے میری مجھے پانی کا نہ دو جام   اس بچے کا پر کیا ہے گنہ اے سپہ شام
بن پانی کے بچہ یہ تڑپتا ہے غضب ہے
زندہ ہے یہ اس وقت تلک یہ بھی عجب ہے

طالب نہ صراحی کا ہے نے جام یہ مانگے   خود دیکھ لو غنچے کی طرح منہ کو ہی کھولے
ٹپکا دو فقط چلوسے کچھ پانی کے قطرے   ہے خشک دہن پیاس سے اور ہونٹ ہیں اودے
کیا جانیئے اُتریں گی بھی بوندیں وہ گلے سے
رہ جائیں گی یا حلق کے اندر ہی اٹک کے

اصغر سے یہ کہنے لگے پھر بادلِ ناکام ،   آمادۂ بیداد ہے ساری سپہِ شام
ہم مانگ چکے پانی بھی، خود دیکھ لو انجام   حجت کا اب ان لوگوں پہ تم بھی کرو اتمام
بس سُنتے ہی فرمانِ شہِ عرش نشاں کو
ہونٹھوں پہ لگے پھیرنے ننھی سی زباں کو

اس ننھے مجاہد نے کیا رن میں بڑا کام   ایسا تو کسی فوج سے ممکن نہ ہوا کام
خود شاہ کے خطبوں نے بھی ایسا نہ دیا کام   جو سوکھی زبانِ علی اصغر نے کیا کام
اس ضرب سے دل فوج کے مجروح ہوئے تھے
اشک آنکھوں میں بھر آئے تھے منہ پھیر لئے تھے

دیکھا پسرِ سعد نے جس دم یہ نظارا   اب رونے لگا لشکرِ غدّار ہی سارا
سوچا کہ نہ کر جائے کہیں مجھ سے کنارا   پس حُرملہ کو اس طرح ظالم نے پکارا
یہ کیا ہوا؟ دل نرم ہُوا فوجِ شقی کا ؟
کر قطع بہت جلد کلام ابنِ علیؑ کا !

یہ سنتے ہی ملعون نے اک تیر سہ شعبہ   بے شیر کے سُوکھے ہوئے حلقوم پہ چھوڑا
پھر کیا تھا' وہ ننھا سا گلا توڑ کے نکلا   اور ساتھ ہی زخمی کیا بازو شہِ دیں کا
منہ کھل گیا تکلیف سے چونکے علی اصغرؑ
دم دے دیا شبیرؑ کے ہاتھوں پہ تڑپ کر

شبیرؑ نے اس حال میں بیٹے کو جو دیکھا   وہ تیرِ ستم گردنِ معصوم سے کھینچا
اور ہاتھ کو پھر زخم سے گردن کے لگایا   اک چلّو ہی مشکل سے بھرا خون کا نکلا
فرمانے لگے چہرے پہ اس خون کو مل کر
آؤں گا اسی طرح جو برپا ہوا محشر

قرباں ہوں ہم ہمّت و صبرِ شہِ دیں پر   فریاد نہ کی اور نہ مطلق ہوئے مضطر
آئے تو یہ آئے کلمے شہ کی زباں پر   صد شکر ہے صد شکر ہے اے خالقِ اکبر
احسان کا ممنون سوا ہو گیا شبیرؑ
لے تیری امانت سے ادا ہو گیا شبیرؑ

اے اہلِ عزا پیٹنے رونے کی یہ جا ہے   چھ ماہ کا بے شیرِ فدا ہم پہ ہوا ہے
ماں باپ نے بچے کو جو قربان کیا ہے   عصیاں سے بچائیں ہمیں یہ انکی رضا ہے
تڑپے جو دلِ زار تو غفلت نہ رہے گی
امّت جو ہو مغموم گناہوں سے بچے گی

اب عرض کرو دل سے کہ اے سیدِ ذیجاہ — فرزندِ رسولِ عربی فاطمہؑ کے ماہ
نورِ نظر و قوتِ قلبِ اسد اللہ — کس درجہ ترے دیں پہ تھی ہم عاصیوں کی چاہ
امت پہ یہ کتنا بڑا احسان کیا ہے
ننھا سا پسر خلق پہ قربان کیا ہے

اے بانوئے سرور تری ہمت کے میں قرباں — ممکن نہیں ایثار کرے ایسا کوئی ماں
صرف اس لئے بچے کو وہ اپنے کرے قرباں — خلقت کے لئے تا کہ ہو کچھ درد کا ساماں
کیوں کر نہ تعجب ہو کلیجہ ہے یہ کس کا
بچہ وہ دیا دودھ بھی چھوٹا تھا نہ جس کا

ہاں بھائیو ہم لوگوں پہ جاں بچے نے واری — اس پر بھی کوئی کیفیتِ غم نہیں طاری ؟
نے قلب ہی تڑپا نہ ہوئے اشک ہی جاری — بولو تو کوئی حد بھی ہے غفلت کی ہماری
شبیرؑ کا ششماہہ پسر تیرِ ستم کھائے
امت کا ہو یہ حال کہ اس پر بھی نہ غم کھائے

اے ننھے مجاہد علی اصغر علی اصغر — یہ ظلم ہو تم پر علی اصغر علی اصغر
تم ہم پہ ہو قرباں علی اصغر علی اصغر — ہم کیوں نہ ہوں مضطر علی اصغر علی اصغر
بچے تھے پہ ہمت تو جوانوں سے سوا کی
خود دوڑ کے جا لپٹے جو چھاتی سے قضا کی

مادر سے بچھڑنا تمہیں کیونکر ہوا آساں — تنہائی تھی تاریک تھا سنسان تھا میداں
ماں یاد نہ آئی تمہیں اے اصغرِ ذیشاں — آرام سے جا سوئے بلا خوف میں قرباں
امت کیلئے ظلم و ستم سہہ گئے اصغرؑ
رونے کیلئے خلق میں ہم رہ گئے اصغرؑ

ننھے سے مجاہد تری ہمت کے میں صدقے | اس بھوک کے اور پیاس کی شدت کے میں صدقے
گردن کے فدا ننھی سی میت کے میں صدقے | میرے لیے دی جان سخاوت کے میں صدقے

ننھا سا گلا کاٹ کے لے جائیں جو ظالم
تڑپا کرے کیوں کر نہ ادیم آپ کا خادم

حضرت زینبؑ کے فرزندوں کی شہادت

جب دے چکے سب غیر عزیزوں کی طرح سر
مرنے پہ کمر باندھتے تھے قاسمؑ بے پر
ہے سخت عجب دونوں کی دانائی سے مجھ کو
تھرا کے وہ بولے کہ ہماری نہیں تقصیر
فرمایا شجاعت کے منافی ہے یہ تقریر
جاتے ہوئے اس وقت تو آقا نے نہ روکا!
یہ ذکر تھا جو خیمہ میں داخل ہوئے شبیرؑ
فرمایا شکایت کے سخن کیجیو نہ ہمشیر!
تلواروں میں ہر دم مرے قدموں پہ جھکے تھے

بے جاں ہوئے دو ایلچی شاہ کے دلبر
کہتی تھی جھکائے ہوئے سر شاہ کی خواہر
ان بیٹوں نے محجوب کیا بھائی سے مجھ کو
قسمت میں خجالت تھی نہ یاور ہوئی تقدیر
مسلمؑ کے پسر کا ہے کو تھے صاحب شمشیر
روکا تمہیں ان کو شہ والا نے نہ روکا؟
دیکھا کہ ہیں بیٹوں سے خفا زینبؑ دلگیر
ملتے ہیں کسے ایسے پسر صاحب توقیر؟
یہ شیر دلاور مرے روکے سے رکے تھے

بالآخر مولا نے:

دونوں سے کہا جاؤ خدا حافظ و ناصر
اب دل کو نہ تڑپاؤ خدا حافظ و ناصر
ناشاد پُر ارمان مرے گھر سے چلے ہو
تھامے جو ہے بازوؤں کو قاسمؑ و اکبرؑ
الفت سے چلے ساتھ علمدارِ دلاور
کچھ فوجِ شقاوت نہیں دور آپ ٹھہر جائیں

شمشیر و سناں کھاؤ خدا حافظ و ناصر
چھاتی سے لگو آؤ خدا حافظ و ناصر
گھوڑوں پہ چڑھادوں میں کہ گودی کے پلے ہو
گھوڑے پہ چڑھے زینبؑ ناشاد کے دلبر
تب کہنے لگے جوڑ کے ہاتھوں کو وہ صفدر
آقا پہ مصیبت ہے حضور! آپ ٹھہر جائیں

دونوں بچے رخصت ہو کر اعدا کے مقابل پہونچے اور جنگ کی۔ جناب فضہ خیمہ سے باہر دونوں کی لڑائی بصد حسرت و یاس دیکھ رہی تھیں، انہوں نے:

شہزادوں کی سب معرکہ آرائی بھی دیکھی — جرأت بھی، جلالت بھی، توانائی بھی دیکھی
دانائی بھی، غربت بھی، شکیبائی بھی دیکھی — جانبازی بھی، مظلومی بھی، تنہائی بھی دیکھی
تیروں کو لہو میں بھی نہاتے ہوئے دیکھا — آگے جو بڑھے، تیر بھی کھاتے ہوئے دیکھا

یہاں تک کہ فوج کے اژدہام میں تیروں، تلواروں اور نیزوں کی چہار طرف سے بارش شروع ہو گئی اور دونوں بچوں کے جسم پاش پاش ہو گئے۔ جناب فضہ نے خیمہ جا کر جب یہ خبر بی بی زینبؑ کو سنائی تو :

یہ سنتے ہی قبلے کی طرف جھک گئیں زینبؑ — سجدے سے اٹھیں جب، تو کہا شکر ہے یا رب
طالب تھی میں جس کی، وہ بر آیا مرا مطلب — سب مٹ گئے دھڑکے کوئی تشویش نہیں اب
لٹنے سے محمدؐ کی کمائی کو بچا لے — سب قتل ہوں پر تو مرے بھائی کو بچا لے
در تک گئی ناموسِ نبیؐ کھولے ہوئے سر — لاشوں کو لئے خیمے میں داخل ہوئے سرورؑ
اک لاش کو لائے تھے علمدار دلاور — لپٹائے تھے چھوٹے کو گلے سے شہِ صفدر
بانوؑ نے رکھے زانوئے زینبؑ پہ سر اُن کے — جو بی بیاں تھیں آ گئے منہ کو جگر اُن کے
زینبؑ نے جو کی جھک کے رخوں پہ نظر اُن کے — دکھلائی دیئے چاند سے منہ خوں میں تر اُن کے
رخسار بھی مجروح تھے، ابرو بھی کٹے تھے — شانے تھے جدا، چاند سے بازو بھی کٹے تھے
حضرت نے کہا رو لو گلے ان کو لگا کر — اب پاس تمہارے نہیں آئیں گے یہ جا کر
پانی نہ پیا نزع میں بھی برچھیاں کھا کر — رخصت ہوئے ماموں کو لبِ خشک دکھا کر
کس سے کہوں جیسے یہ وفادار پسر تھے — دم نکلے تو دونوں کے مرے پاؤں پہ سر تھے
منہ چھاتیوں پہ رکھ کے یہ ناشاد پکاری — آرام میں ہو یا ہے غشی پیاس کی طاری
ہوتا ہے بیاں شوکت و ہیبت کا تمہاری — تسلیمیں کرو قبلۂ کونین کو! واری
سمجھی میں کہ باعث ہے یہ بیداریٔ شب کا — پیارے یہ طریقہ نہیں اربابِ ادب کا
تعریف امام دوسرا کرتے ہیں، اٹھو! — عباسؑ علمدار ثنا کرتے ہیں، اٹھو!
ہمشکلِ نبیؐ مدح و دعا کرتے ہیں، اٹھو! — سب لوگ نہ اٹھنے کا گلا کرتے ہیں، اٹھو!

آقا سے مصیبت میں جدا ہو نہیں جاتے
صدقے گئی یوں جنگ کے دن سو نہیں جاتے
پیارو! تم اکیلے کبھی نکلے نہیں گھر سے
رستے سے نہ واقف، نہ صعوبات سفر سے
راہیں بھی وہ، خالی نہیں جو خوف و خطر سے
جو خاصۂ باری ہیں وہ تھراتے ہیں ڈر سے
ویرانی میں یا گلشن ہستی میں رہو گے؟
تم آج کی شب کونسی بستی میں رہو گے

تجویز ہے قبروں کی کہاں میں نہیں آگاہ
غربت میں مرو گے یہ نہ تھی مجھ کو خبر، آہ!
یہ دہر ہے بے مہر، یہ دنیا ہے گذرگاہ
جاتا ہے تہی دست گدا ہو کہ شہنشاہ
ماموں کی نہ تقصیر، نہ کچھ اس میں ہے ماں کی
قبریں بھی ملیں گی وہیں، ہے خاک جہاں کی

اب دھیان مرا شام و سحر کون رکھے گا
الفت کی، محبت کی نظر کون رکھے گا؟
پردیس میں اب ماں کی خبر کون رکھے گا
جھک جھک کے مرے پاؤں پہ سر کون رکھے گا
سب ہوں گے مگر گود کے پالے نہ ملیں گے
اب تم سے مجھے چاہنے والے نہ ملیں گے

تم دونوں نے جاں اپنی مرے بھائی پہ واری
شرمندۂ احساں ہے یہ دکھ درد کی ماری
کس منہ سے شہیدو! میں کروں شکر گذاری
ماں پہلے تھی پر آج سے لونڈی ہوں تمہاری
بہتر ہوا گر مجھ پہ چھری چل گئی پیارو
کچھ تو مرے بھائی کی بلا ٹل گئی پیارو

جنگل میں قیام آج کہاں ہو گا بتاؤ؟
ماں صدقے، مقام آج کہاں ہو گا بتاؤ؟
دن تم کو تمام آج کہاں ہو گا بتاؤ؟
بستر سر شام آج کہاں ہو گا بتاؤ؟
ہموار زمیں شب کو بچھونے کو ملے گی؟
کیسی ہے زمیں، جو تمہیں سونے کو ملے گی؟

ہمراہ نہ تکیے ہیں نہ راحت کا بچھونا
دو بھائی ہو تم ایک جگہ رات کو سونا
معلوم ہے چھوٹے کا مجھے چونک کے رونا
صدقے گئی، غافل مرے بچے سے نہ ہونا
بے ماں کے سحر رونے میں ہو جاتی ہے اکو
پہلو مرا ملتا ہے تو نیند آتی ہے اکو